صاحبِ طرز ادیب حضرت مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ

کے

ادبی شہ پارے

اوّل

مرتب
محمد سمیع الدین نظام آبادی

دارالکتاب دیوبند

بسمہٖ تعالیٰ

انتساب

مولانا دریابادیؒ کے ایک مخلص بے بہا

اور میرے کرم فرما کے نام! جن کا اخلاص

اظہارِ نام سے مانع ہے۔

مَدّظِلّہٗ الْعَالِیْ!

وما کفر سلیمان.....

آیت کے اس مقام پر پہنچکر مؤمن کے قلب میں ذرا کھٹک پیدا ہوتی ہے کہ یہ کہنے والی کون سی بات تھی جو قرآن نے فرمادی؟ جب حضرت سلیمانؑ پیغمبر حق تھے، تو یہ کھلی ہوئی اور موٹی سی بات ہے کہ آپ شائبۂ کفر وشبہ کفر سے بمراحل دور تھے، کھٹک بجا ہے۔

سلیمانؑ کو پیغمبر ماننے والی دوقومیں مسلمانوں سے پہلے ہوچکی ہیں، یہ دونوں وہی ہیں جو اہل کتاب کہلاتی ہیں یعنی یہود ونصاریٰ، ان دونوں کے اکابر نے ستم ظریفی کا کمال یہ دکھایا ہے کہ ایک طرف تو ان کی عظمت وپیمبری کے قائل ہیں اور دوسری طرف ان کے نامۂ اعمال میں گندے گندے جرائم بھی ڈال دیئے ہیں! یہاں تک کہ کفروشرک بھی. بائبل یعنی عہد عتیق کے صحائف میں ہیں .

''جب سلیمان بوڑھا ہوا تو اس کی جوروؤں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کیا اور اس کا دل اپنے خدا کی طرف سے کامل نہ تھا'' (۱۔سلاطین۔۱۱:۴،۶،۱۰)

معاذ اللہ! خدا کا پیمبر اور کفروشرک میں مبتلا! چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی، دنیا کے سیکڑوں سال تک، ہزار ڈیڑھ ہزار سال تک، انہیں یہودیانہ تحریفات واختراعات کا شکار ہوکر اس مؤحد اعظم کو نعوذ باللہ کافر ومشرک سمجھتی رہی، یہاں تک کہ قرآن آیا، جو ہر قوم، ہر زمانہ کے سچے پیمبروں کی عزت وناموس کا محافظ ہے اور اس نے آکر یقین نہ رکھنے والی دنیا کے سامنے اعلان کیا کہ سلیمانؑ کو معاذ اللہ کافر کہتے ہو! وہ تو کفر کے قریب تک نہیں گئے تھے، قرآن کی صدائے حق فضا میں بلند ہوکر خاموش ہوگئی، جن کے کان تھے انھوں نے سنا، دنیا اپنے کاروبار میں لگی رہی، بائبل والوں نے بائبل کی پرستاری نہ چھوڑی، یہاں تک کہ تیرہ ساڑھے تیرہ صدیاں اور گزر گئیں اور اب قدرت حق کا اعجاز دیکھئے کہ اب جو محققانہ وفاضلانہ کتب جوامع وحادیات بائبل ہی کے پرستاروں کے قلم سے نکل رہی ہیں اور شائع ہورہی ہیں، وہ تائید وتصدیق، بائبل کی الزام دہی کی نہیں، قرآن کے جواب صفائی کی کررہی ہیں! انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے سب سے آخری ایڈیشن میں مقالہ زیر عنوان سلیمان دیکھیے، صاف یہ مضمون ملے گا

''سلیمان خدائے واحد کے مخلص پرستار تھے'' (جلد۲ص:۹۵۲ طبع چہاردہم)

(تفسیر ماجدی جلد اول،ص:۳۵۴:۲)

آستانۂ نبوت پر حاضری

یک سرگشتہ و دیوانہ، عقل سے دور علم سے بیگانہ، نہ گریاں نہ شاداں، نہ اپنی حضوری کی خوش بختی پر خوش اور نہ تباہ کاریوں کی یاد پر مغموم، محض اس الجھن میں گرفتار کہ یا الٰہی یہ بیداری ہے یا خواب، کہاں یہ ارض پاک اور کہاں یہ بے مایہ مشتِ خاک! کہاں مدینہ کی سرزمین اور کہاں اس تنگِ خلائق کی جبیں! کہاں سید الانبیاء کا آستانہ اور کہاں اس روسیاہ کا سروشانہ! کہاں وہ پاک سرزمین کہ اگر اس پر قدوسیوں کو بھی چلنا نصیب ہو تو ان کے فخر و شرف کا نصیبا جاگ جائے اور کہاں ایک آوارہ دنا کارہ بے تکلف اسے پامال کرنے کی جرأت کر بیٹھے، عراقی نے کہا تھا کہ ناپاک کے سجدہ کرنے سے زمین فرط اذیت سے چیخ اٹھتی ہے ۔

بہ زمین چو سجدہ کردم ززمین ندا بر آمد
تو مرا خراب کردی بہ ایں سجدۂ ریائی

تو جب ہر معمولی اور عام خطۂ زمین ریاکار کے سجدہ سے یہ ایذا محسوس کرتا ہے پھر اس عظمت و تقدس والی سرزمین کے جگر و سینہ پر ایک ریاکار کے بار قدم سے کیا گزر گئی ہوگی!

(سفر حجاز ص: ۱۱۰، ۱۱۲)

شکار کرنے کو آئے تھے.....!

خاندان کی ایک شاخ شہر باندا میں آباد تھی، ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ ان کے ہاں کی ایک ماما میرے ہاں موجود اور یہ دردناک پیام لئے ہوئے ''سنتی ہوں کہ آپ سب کی دوا کرتے ہیں، اور میں اتنی سخت تکلیف میں پڑی ہوئی ہوں، ایک مجھی کو نہیں پوچھتے''

کہہ دیا کہ ''اچھا آؤں گا'' اور سہ پہر کو ان کے ہاں پہنچ گیا یہ لوگ قریب ہی کے عزیز تھے، میرے حقیقی خالہ زاد بھائی کا خاندان تھا، کسی سے پردہ نہ تھا، لڑکیاں سب سامنے آتی تھیں، ہم لوگوں کے ہاں برابر آمد و رفت رہتی تھی، خود اس لڑکی کا بارہا سامنا ہو چکا تھا لیکن اس وقت تک تھا اتنا جھیپو اور شرمیلا کہ کبھی نظر بھر کر دیکھا ہی نہ تھا، غرض میں پہنچا اور کمال معصومیت کے ساتھ اس کمرے میں نیم تخلیہ کرا کے عمل ہپناٹزم (تنویم مقناطیسی) کا شروع کیا، ایک چمکیلا بٹن دکھا کر غنودگی طاری کر دی اور یقین دلانے والے لہجے میں الفاظ بار بار اس طرح کے دُہراتے رہا کہ ''درد گیا'' ''اب بالکل گیا'' ''اب تم اچھی ہو رہی ہو، اب بالکل اچھی ہو گئی ہو'' ۔۔۔۔ ہاتھ پھرانے یا پاس کرنے کا کام بجائے اپنے، مریضہ کی خالہ کے ہاتھ سے لیتا جاتا تھا اور اسی لئے ان کو مریضہ کے پلنگ پر بیٹھا رہنے دیا تھا! اتنی احتیاط طبی حجاب کی بنا پر اس وقت بھی تھی، کہ کے کسی بدن حصہ کو اپنا ہاتھ نہیں لگنے دیا۔۔۔۔ دو چار منٹ قبل کہاں کراہ رہی تھیں، اور کہاں اب جو آنکھ کھولی، تو درد کافور تھا۔ ہشاش بشاش مسکراتے ہوئے چہرے سے، دوسرے کمرے میں بیٹھی ہوئی اپنی والدہ کو پکار کر بولیں ''باجی اب ہم بالکل اچھے ہیں''

نوجوان قبول صورت لڑکی کی مسکراہٹ اور اس پُر مسرت آواز میں جادو کا اثر تھا! مریضہ کا چہرہ آناً فاناً معالج کی دلچسپی اور توجہ کا مرکز بن گیا!۔۔۔۔ اب وہ میری مریضہ نہ تھی، اتنی ذرا سی دیر میں ''کچھ اور'' بن گئی تھی، اور معالج اب خشک معالج نہ رہا خود علاج طلب مریض سا بن گیا!

شکار کرنے کو آئے تھے شکار ہو کر چلے!

شاعری نہیں اب واقعہ تھا۔۔۔۔ کہاں تو آنے میں یہ پس و پیش، تکلف و حجاب تھا اور اب کہاں اٹھنے میں طرح طرح کی بہانہ بازیاں اور حیلہ سازیاں!

(آپ بیتی ص: ۱۵۹، ۱۶۰)

صاحبِ طرز ادیب حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

کے

ادبی شہ پارے

(حصۂ اول)

مرتب

محمد سمیع الدین نظام آبادی

دارالکتاب دیوبند

جملہ حقوق بحق مرتب محفوظ

نام کتاب ---------- ادبی شہ پارے (حصۂ اول)

صفحات ---------- ۲۹۶

مرتب ---------- محمد سمیع الدین نظام آبادی

کمپیوٹر کتابت ---------- عبداللہ وسیم (سراج کمپیوٹر سینٹرز نزد مدنی مسجد دیوبند)

سال اشاعت ---------- شعبان ۱۴۲۳ھ

قیمت ----------

ناشر

دارالکتاب دیوبند

Ph/Fax: Off. 01336-22558
Phone. Res 01336-22924

حکیم الامت کا مذاقِ حکمت

عقیدت سے ذرا ہٹ کر ایک شے محبت بھی ہے، یہ محبت اسی جوش وقوت کے ساتھ محمد علی سے تھی گویا ایک مقتدا تھے تو دوسرے محبوب اور ان دونوں کے درمیان آپس میں شدید سیاسی اختلافات کی گہری خلیج حائل! اس نیازمند غریب وناتواں کی جان عجیب کشمکش میں ع

کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

بہر حال دل مضطرب رہتا تھا کہ وقت کے ان دو بڑے مخلص بندوں اور دین وملت کے ان دو زبردست خدمت گزاروں کے درمیان کوئی صورت مصالحت ومفاہمت کی نکالیے، یا کم از کم اتنا تو ہو ہی جائے کہ آپس میں اتنی بے گانگی اور اجنبیت باقی نہ رہے۔ اور اس کے لئے پہلا عملی قدم یہ تھا کہ ایک مرتبہ ملاقات تو ہو جائے ۔۔۔۔ آخر ایک روز موقع پا اور ہمت کر، خدمت مبارک میں عرض ہی کر دیا۔

ذرا تأمل کے بعد فرمایا کہ "عرصہ ہوا فلاں صاحب نے بھی اس قسم کی تحریک کی تھی۔ پہلے تو میں نے ان کو بھی یہی جواب دیا تھا کہ بڑے آدمی کو یہاں بلانا مناسب نہیں، لیکن ان صاحب کے اصرار پر میں نے جو کہا تھا، وہی آپ کے سامنے دہرائے دیتا ہوں۔ میری تجویز ہے کہ اگر وہ تشریف لائیں تو اتنا وقت بہر حال دیں کہ درمیان میں ایک رات گزار سکیں، پہلے دن وہ تشریف لائیں گے، میں اٹھ کر ان کی تعظیم کروں گا عزت سے اپنے قریب ہی بٹھاؤں گا، لیکن اتنی عنایت وہ کریں کہ مسائل پر وہ اس روز خود گفتگو نہ فرمائیں، بلکہ میرے معروضات خاموشی کے ساتھ بلا قصدِ جواب سُن لیں، آدمی ذہین ہیں، اگر طبیعت فوراً جواب پر آمادہ ہوگئی، تو میری ہر بات کا کچھ نہ کچھ جواب دیتے ہی جائیں گے۔ اور میری کوئی بات بھی قبول نہ کریں گے۔ بس اس وقت صبر وخاموشی سے سن لیں، شب میں آرام کریں اور طبیعت کو خلوئے ذہن کے ساتھ میرے معروضات پر سوچنے کا موقع دیں، پھر دوسرے روز جو چاہیں، جتنی دیر تک چاہیں ارشاد فرمائیں، میں بھی اُسی خاموشی کے ساتھ سننے کو تیار رہوں گا"۔

واہ رے حکیم الامت! یہ جواب جس میں اتنی مصلحتوں کی رعایت ہو اُن کے سوا کوئی اور دے سکتا تھا؟ ان ہی تجربوں سے تو بار بار کہنا پڑتا ہے کہ عالم وفاضل، ذاکر وشاغل، عابد وزاہد، بزرگ ودرویش ہونا اور چیز ہے اور حکیم ومصلح ہونا کچھ اور!

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
دنیا میں تم سے لاکھ سہی تم مگر کہاں

(حکیم الامت۔ نقوش وتاثرات ص: ۱۴۳)

''انبساطِ عید دیدن روئے تو''

اگست ۲۳ء کی آخری تاریخیں تھیں، جب قید فرنگ سے رہائی ہوئی. بیجاپور جیل سے چپ چپاتے جھانسی لائے گئے، اور یہاں اسٹیشن پر چھوڑ دیے گئے. دل ملاقات، زیارت، دست بوسی، قدم بوسی، سب کے لیے بیتاب تھا، مہینوں سے بیتاب ہو رہا تھا محمد علی کی علمی عظمت، ان کی ادبی قابلیت کا اعتراف، ان کے دماغی کمالات کا احترام، دل میں ہمیشہ سے تھا. ان سے دینی و روحانی عقیدت اب پیدا ہوئی تھی اور جب سے ان کی نعتیہ غزل (''تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں'') کان میں پڑی تھی، اس وقت سے تو عقیدت کا ایک بے پناہ طوفان سینہ میں جوش مار رہا تھا. اور دل بار بار کہہ رہا تھا، کہ مرشد بنانے کے قابل کوئی ہے تو یہی، یہ شخص تو اس قابل ہے کہ بیعت اس کے ہاتھ پر کی جائے. دوست احباب سے ذکر آیا تو کچھ نے ہاں میں ہاں ملائی لیکن ایک گروہ نے اسے حیرت کے کانوں سے سنا۔

عین اسی اگست میں اپنی خانگی زندگی میں ایک واقعہ سخت قسم کا پیش آ گیا. یہ سب کچھ تھا، لیکن محمد علی کی رہائی کی خوشخبری ایسی نہ تھی جو دل کو باغ باغ نہ کر دیتی. اس مسرت نے اس صدمہ کو بھی ایک حد تک دبا دیا، اور دل بے چین رہنے لگا کہ کس طرح اڑ کر محمد علی تک پہنچوں ۔۔۔۔ روایتیں معتبر اور پیہم پہنچ رہی تھی کہ جیل سے نور مجسم ہو کر نکلے ہیں. سُمندِ شوق کے حق میں یہ تازیانہ تھا لیکن لوگوں نے یہ بھی کہا، اور سچ کہا کہ دہلی میں بھلا محمد علی کو بات کرنے کی بھی فرصت کہاں ہوگی ۔۔۔۔ لڑکی کو دیکھنے بھوالی پہاڑ پر آخر جلدی ہی جائیں گے. اطمنان کی ملاقات پھر اگر کہیں ہو سکتی ہے تو وہیں، اس کے قبل کہیں اور نہیں. رائے معقول تھی، مانتے ہی اور صبر کرتے ہی بنی، لیکن مراسلت کو کون روک سکتا تھا. جواب آنے کا تو کوئی امکان ہی نہ تھا. اور اس کا انتظار تھا ہی کس کو، مقصود تو خط لکھ کر اپنے ہی دل کو تسکین دے لینا تھی. قیس عامری کو لوگوں نے دیکھا کہ کاغذ، قلم، روشنائی کے بغیر بادیۂ عرب کی ریت پر انگلیوں سے قلم کا کام لے رہا ہے. لوگوں نے کہا، یہ کیا ہے؟ دیوانہ نے جواب دیا ۔

گفت مشقِ نام لیلیٰ می کنم
خاطر خود را تسلی می دہم

(محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق، حصہ اول ص: ۱۱۹، ۱۲۰)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

☆ فہرستِ مضامین ☆

آئینۂ عناوین	صفحات نمبر
☆ پیش لفظ	۲۱
☆ حرف تمنا	۲۳
☆ پہلا باب۔ تفسیر ماجدی	
فصل اول۔ مضامین قرآن	
☆ توحید	۳۴
☆ سورہ فاتحہ اور انجیلی دعا	۳۷
☆ کلام خداوندی	۳۸
☆ تکمیل دین	۳۹
☆ اذان	۴۰
☆ حج بین الاقوامی کانگریس	۴۱
☆ طلاق اور اسلامی نقطہ نظر	۴۱
☆ طاعون اور اسلامی تعلیم	۴۳

☆ سوداور اسلام ۴۳

☆ نکاح ۴۴

☆ تعدد ازدواج ۴۵

☆ اسلام کی عالمگیری ۴۶

☆ معجزہ ۴۷

☆ نسخ ۴۸

☆ قانون قصاص ۴۸

☆ موالات کفار ۴۹

☆ اسیران جنگ ۵۰

☆ مسئلہ تقسیم وراثت ۵۱

☆ صبر۔معیت الٰہی کی کلید ۵۱

☆ دعا۔عبدیت کی مظہر ۵۲

☆ توہین انبیاء اور قوم بنی اسرائیل ۵۳

☆ توریت کی تحریف ۵۴

☆ توحید۔اسلام اور عیسائیت ۵۵

☆ دنیا کی بے ثباتی ۵۵

☆ رواداری ۵۶

فصل دوم ۔قصص قرآن

☆ جنگ بدر ۵۷

☆ جنگ احد ۵۸

☆ غزوۂ خندق ۶۰

☆ واقعۂ افک ۶۰
☆ صلح حدیبیہ ۶۱
☆ غزوۂ حنین ۶۲
☆ غزوۂ تبوک ۶۳
☆ واقعۂ اصحاب فیل ۶۳
☆ ابتدائے وحی ۶۴
☆ واقعۂ عبداللہ ابن ابی مکتوم ۶۵
☆ ایک بدری صحابی ۶۵
☆ مسلمانوں کی بیچارگی اور منافقین کا استہزاء ۶۶
☆ اصحابِ کہف ۶۷

فصل سوم۔ تفسیری عبارتیں

☆ فیها ازواج مطهرة ۶۸
☆ وضربت عليهم الذلة والمسكنة ۶۹
☆ فويل لهم مما كتبت ايديهم ۶۹
☆ وما كفر سليمان ۷۰
☆ ما يفرقون به بين المرء وزوجه ۷۲
☆ وابتغوا ما كتب الله لكم ۷۲
☆ هن لباس لكم وانتم لباس لهن ۷۴
☆ قاتلوا ۷۵
☆ فی سبیل الله ۷۵
☆ ان الله لا يحب المعتدين ۷۶

☆ فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج ۷۷

☆ واستغفروا اللہ ۷۷

☆ ربّنا اٰتنا فی الدنیا الخ ۷۸

☆ ادخلوا فی السلم کافّة ۷۹

☆ قل ما انفقتم من خیر فللوالدین الخ ۷۹

☆ ولا یزالون یقاتلونکم الخ ۸۰

☆ نساء کم حرث لکم ۸۰

☆ وللرجال علیهن درجة ۸۱

☆ ایودّ احدکم ان تکون له الخ ۸۱

☆ انما البیع مثل الربوٰا ۸۲

☆ وقالت طائفة من اهل الکتاب ۸۲

☆ سنلقی فی قلوب الذین کفروا الرعب الخ ۸۳

☆ تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنکر ۸۴

☆ ولو کنت فظًا غلیظ القلب الخ ۸۴

☆ الرجال قوامون علی النساء ۸۵

☆ فی سبیل اللہ ،وفی سبیل الطاغوت ۸۶

☆ ولکن شبّه لهم ۸۷

☆ ومن احسن من اللہ الخ ۸۸

☆ اتخذ وا دینهم لعبا ولهوا ۸۸

☆ لا تدرکه الابصار ۸۹

☆ وذروا ظاهر الاثم وباطنه ۸۹

☆ زيّن لكثير من المشركين قتل اولادهم ۹۰

☆ سيقول الذين اشركوا الخ ۹۰

☆ ولا تقربوا الفواحش ما ظهر منها وما بطن ۹۱

☆ قل تعالوا اتل ما حرم ربّكم عليكم ۹۱

☆ قال انا خير منه الخ ۹۲

☆ ائت بقرآن .....فما لبثت فيكم عمرا من قبله ۹۳

☆ متاع فى الدنيا ۹۴

☆ فلما رائينه اكبر نه وقطّعن ايديهن الخ ۹۴

☆ فلا تضربوا لله الامثال ۹۵

☆ ايّ الفريقين خير مقاما الخ ۹۶

☆ الذين ان مكنّهم ۹۶

☆ غلبت الروم.....فى بضع سنين ۹۷

☆ وما كان لمؤمن ولا مؤمنة الخ ۹۸

☆ انما اعظكم بواحدة الخ ۹۹

☆ عليهُ الله ۹۹

☆ خلق الانسان .....وخلق الجانّ ۱۰۰

☆ اعلموا انما الحيٰوة الدنيا الخ ۱۰۰

☆ وانزلنا الحديد فيه بأس شديد الخ ۱۰۱

☆ ربّ المشرقين وربّ المغربين ۱۰۲

☆ قال اساطير الاولين ۱۰۲

فصل چہارم۔اعلام القرآن

☆ تورات اور انجیل ۱۰۳
☆ عیسیٰ ۱۰۳
☆ شہر حرام ۱۰۴
☆ عرفات ۱۰۵
☆ سلیمانؑ ۱۰۶
☆ کعبہ ۱۰۶
☆ آدمؑ ۱۰۷
☆ ابراہیمؑ ۱۰۸
☆ ابولہب ۱۱۰
☆ خندقوں والے ۱۱۱
☆ بنی اسرائیل ۱۱۱
☆ فرعون ۱۱۲
☆ محمدؐ ۱۱۴
☆ موسیٰؑ ۱۱۵

☆ دوسرا باب۔آپ بیتی

☆ ماحول ۱۲۱
☆ والدہ ماجدہ ۱۲۲
☆ بہن ۱۲۳
☆ بسم اللہ رکھائی ۱۲۴

☆ دو دن کو اے جوانی..... ۱۲۶
☆ گورکھپور سے نقلِ مکانی ۱۲۷
☆ دانایانِ فرنگ کا عطیہ ۱۲۹
☆ راجہ صاحب کی کوٹھی ۱۲۹
☆ اسکولی زندگی ۱۳۱
☆ ایک لمحۂ فکریہ ۱۳۲
☆ کتب بینی کا شوق ۱۳۳
☆ شکار کرنے کو آئے تھے..... ۱۳۴
☆ ''بس یہ حضرت ملازمت کر چکے'' ۱۳۶
☆ ازدواجی زندگی ۱۳۷
☆ ایک ننھی سی ایمانی کشتی الحاد کے گرداب میں ۱۴۱
☆ مد کے بعد جزر ۱۴۵
☆ اسلام کی طرف بازگشت ۱۴۶
☆ تجرباتِ زندگی ۱۴۷
☆ آخری سلام ۱۴۸

☆ تیسرا باب۔ سیاحتِ ماجدی

فصل اول۔ سفرِ حجاز

☆ الوداع ۱۵۲
☆ واپسی ۱۵۵
☆ روانگی۔ بمبئی ۱۵۷

☆ جہاز ۱۵۸

☆ سمندر۔کامران ۱۶۰

☆ کامران۔احرام ۱۶۲

☆ جدہ ۱۶۴

☆ مدینہ ۱۶۸

☆ آستانہ نبوت ۱۶۹

☆ گنبدِ خضراء ۱۷۱

☆ زیارت ۱۷۴

☆ مسجد نبوی ۱۷۵

☆ جنت البقیع ۱۷۶

☆ شہر مدینہ کا پیغام ۱۷۷

☆ چل چلاؤ ۱۷۸

☆ مدینہ سے رخصتی ۱۷۹

☆ جدہ۔راہ مکہ ۱۸۰

☆ ایک آیت کی تفسیر ۱۸۱

☆ حرم شریف ۱۸۲

☆ کعبہ پہ پڑی جب..... ۱۸۲

☆ حریم قدس ۱۸۴

☆ کعبہ مقصود ۱۸۵

☆ چاہِ زمزم ۱۸۷

☆ صفا و مروہ ۱۸۸

☆ عرفات ۱۸۹
☆ عرفات کی بارش ۱۹۰
☆ گرایں سودا..... ۱۹۲
☆ منٰی بعد حج ۱۹۲
☆ حج رب البیت ۱۹۳
☆ جہاز، بمبئی، وطن ۱۹۶

فصل دوم۔ گیارہ سفر

☆ چار دن بمبئی میں ۲۰۰
☆ بہار کی بہار ۲۰۲
☆ ڈھائی دن بہار میں ۲۰۳
☆ حیدرآباد ۲۰۶
☆ دہلی ۲۰۹
☆ کلکتہ ۲۱۰
☆ لاہور ۲۱۱

فصل سوم۔ ڈھائی ہفتہ پاکستان میں

☆ واقعات وارادات ۲۱۴
☆ مسافر نوازیاں ۲۱۵
☆ خاطر داریاں ۲۱۷
☆ مخلصوں کے جھرمٹ میں ۲۱۸
☆ مرقدِ سلیمانی پر حاضری ۲۱۹
☆ زہر اور اس کا تریاق ۲۲۰

☆ شاہی ضیافت ۲۲۱
☆ کراچی سے لاہور ۲۲۲
☆ لاہور سے رخصتی ۲۲۴
☆ معروضاتِ خصوصی ۲۲۵

☆ چوتھا باب۔ تأثرات ماجدی

فصل اول۔ حکیم الامت نقوش وتأثرات

☆ اشرفی سلوک ۲۳۱
☆ دیدارِ اشرفی ۲۳۲
☆ ایک سوال ۲۳۵
☆ مشیر باتدبیر ۲۳۵
☆ حکیم الامت کا مذاقِ حکمت ۲۳۷
☆ افاداتِ تھانوی ۲۳۹
☆ حکیم الامت کی دعوت ۲۴۱
☆ اختلاف سے متعلق تھانوی نقطۂ نظر ۲۴۱
☆ ایک نادر شاہی تحفہ ۲۴۲
☆ حضرت کی لکھنؤ تشریف آوری ۲۴۳
☆ حضرت کا ضعفِ جسمانی ۲۴۵
☆ مریض طبیب کی عیادت کو ۲۴۸
☆ سفر آخرت ۲۴۹

فصل دوم۔ محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق

☆ کامریڈ کا شہرہ آفاق ایڈیٹر ۲۵۰

☆ محمد علی سے پہلی ملاقات ۲۵۱

☆ ایک جامع اور ہمہ گیر شخصیت ۲۵۲

☆ محمد علی کا تبصرہ ۲۵۳

☆ جامعہ ملیہ ۲۵۵

☆ ''جان بیٹا خلافت پہ دیدو'' ۲۵۷

☆ داغِ جگر ۲۵۸

☆ ''انبساطِ عید و دیدن روئے تو'' ۲۶۰

☆ محمد علی کی ایمانی جرأت ۲۶۲

☆ محمد علی خاتون منزل میں ۲۶۴

☆ ''ہو رہے ہیں جو رہفت افلاک کے'' ۲۶۵

☆ کامریڈ کا خاتمہ ۲۶۶

☆ پیر اور مرید کی آویزش ۲۶۷

☆ پیر اور مرید کا ایک لائقِ تقلید عمل ۲۷۱

☆ عالی ظرف محمد علی ۲۷۲

☆ ایک خطرناک جلسہ ۲۷۳

☆ محمد علی کا جوشِ تبلیغ ۲۷۶

☆ محمد علی کی انصاف پروری ۲۷۷

☆ مرشد کی آخری گھڑیاں ۲۷۸

☆ سیرت کا اصلی جوہر ۲۸۰

☆ ''ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا'' ۲۸۱
☆ جوش کے ساتھ ہوش ۲۸۳
☆ محمد علی کی بیباکی ۲۸۶
☆ مولانا اور مہاراجہ ۲۸۸
☆ محمد علی کا کمال و جمال ۲۸۹
☆ مفلس کی آن ۲۹۰
☆ چھوٹی لڑکی کا عقد۔ اور عالم ناسوت میں آخری ملاقات ۲۹۱
☆ ملت یتیم ہوگئی ۲۹۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

(حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب ناظم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)

اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر زبان و بیان کی عجیب صلاحیت رکھی ہے، جو شعلہ کو شبنم اور پتھر کو موم کردے. زبان جب سازِ دل کو چھیڑنے اور سرمستِ بادۂ شوق کرنے لگے تو اسی کو اہل ذوق ''ادب'' سے موسوم کرتے ہیں. اردو زبان کی عمر گو زیادہ نہیں، لیکن نثر و نظم دونوں پہلوؤں سے اس زبان میں بڑے بڑے شہسوارانِ ادب پیدا ہوئے. اردو نثر نگاروں میں جن شخصیتوں نے اپنے گہرے بلکہ انمٹ نقوش چھوڑے ہیں، ان میں ایک ممتاز ترین نام عبدالماجد دریابادیؒ کا ہے. جہاں اس بے سواد ادب نا آشنا کی بات ہے تو واقعہ ہے کہ علامہ شبلیؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی زبان نے تعبیر و بیان کے اعتبار سے سب سے زیادہ متأثر کیا ہے۔

مولانا دریابادیؒ کا اپنا اسلوب ہے. اچھوتا اور دل کو چھوتا ہوا. چھوٹے چھوٹے فقرے، طبع زاد تعبیرات، لکھنوی محاورات، گاہے تنقید کے تیکھے تیور، الفاظ میں بھی ایک خاص قسم کا آہنگ، زبان میں صوتی اور معنوی دوہرے حسن کی رعایت، الفاظ شستہ اور شائستہ اور آسان و رواں، اس کا نتیجہ ہے کہ مولانا دریابادیؒ کے اکثر معاصرین کی تحریر، یوں کسی زمانہ میں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی تھی، آج اپنی کشش کھو چکی ہے. اور بعض تحریروں کا تو ترجمہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے. لیکن مولانا کی تحریر میں آج بھی وہی کشش اور جاذبیت ہے. کوئی کتاب اٹھایئے اور کہیں سے کھول دیجئے، پڑھئے اور سر دھنئے. پیاس بڑھتی جاتی ہے اور کہیں رکنے کو جی نہیں مانتا

عام طور پر معروف مصنفین کی بعض کتابیں زبان و ادب کے اعتبار سے بلند پایہ سمجھی جاتی ہیں. اور اصحابِ ذوق کی آنکھوں کا سرمہ بنتی ہیں. لیکن مولانا کی ہر کتاب اور ہر مضمون ادب کا شاہکار

ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ قرآن مجید کی تفسیر جس میں فکر وخیال کی خود ساختہ پرواز اور الفاظ ومضامین کی بزم آرائی کے لئے کوئی جگہ نہیں، وہ بھی زبان کی چاشنی اور خوبصورتی کا بہترین نمونہ ہے۔

عربی ادب میں ادبی شہ پاروں کو جمع کرنے کا مزاج زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ اور اب بھی ہے۔ اس طرح کی بعض کتابیں عربی مدارس میں داخل نصاب بھی ہیں۔ دوسری زبانوں میں بھی یقیناً اس طرح کا ذوق پایا جاتا ہوگا۔ اردو میں اس کی طرف کم توجہ دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے عزیز گرامی مولوی محمد سمیع الدین سلمہ اللہ تعالیٰ کو، کہ انہوں نے اردو کے صاحب طرز اور اہلِ زبان کے نزدیک مسلّم الثبوت ادیب مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے ادبی شہ پاروں کو ان کی مختلف کتابوں سے جمع کیا ہے۔ یہ زبان وبیان کا ذوق رکھنے والوں ہی کے لئے نہیں، بلکہ ان نئے قلمکاروں کے لئے بھی جو اس میدان کے نووارد ہیں، ایک بیش قیمت تحفہ اور رہنما کتاب ہے اور یہ حسنِ انتخاب بجائے خود مرتب موصوف کے ادب شناسی کی راہ میں قدم بڑھانے کا ایک ثبوت ہے۔ اللہ تعالیٰ عزیزی سلمہ کو اچھے ادبی ذوق سے سرفراز فرمائے۔ اور اس بات کی توفیق عطا فرمائے کہ وہ اپنے اس ذوق کو دین متین کی خدمت کا ذریعہ بنائے۔ **وباللہ التوفیق وھو المستعان۔**

خالد سیف اللہ رحمانی

(خادم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)

۱۸ رصفر ۱۴۲۳ھ

۲ / مئی ۲۰۰۲ء

حرفِ تمنّا

مولانا عبدالماجد دریابادی نامی ایک شخصیت مفسرِ قرآن، صاحبِ طرز ادیب اور ایک کامیاب صحافی کی معرفت سے ابھی ماضی قریب میں گزری ہے۔ جنھیں بقول مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی مرحوم کے اس دور میں ادب وانشاء کے قلمرو کی حکمرانی نہیں بلکہ اس عہد کی صاحبقرانی ملی تھی۔ پیدائش ۱۸۹۲ء میں اپنے آبائی وطن ضلع بارہ بنکی کے ایک قصبہ دریاباد میں ہوئی کُل ۸۵ برس کی لمبی عمر پائی اور تدفین بھی ۱۹۷۸ء دریاباد ہی میں عمل میں آئی۔ سلسلۂ نسب جلیل القدر نبی حضرت یعقوب علیہ السلام سے جاملتا ہے۔ مطالعہ کا چسکہ بچپن ہی سے لگ گیا تھا اور مضمون نگاری بھی گیارہ بارہ برس کی عمر سے شروع کردی تھی۔ جب کالج کی تعلیم کے لئے لکھنؤ آئے تو لکھنے لکھانے کی مشق اردو اور انگریزی میں اچھی خاصی ہوگئی تھی اسی کالج کے دور میں دو مقالے ایک تاریخی ''محمود غزنوی'' اور دوسرا طبقی کلامی انداز میں ''غذائے انسانی'' کے عنوان سے لکھے جو وکیل (امرتسر) میں چھپے۔ خوب واہ واہ ہوئی اور خود ایڈیٹر کی جانب سے مبارکبادی اور حوصلہ افزائی کے خطوط آئے۔ لکھنؤ میں لائبریریوں کی کثرت کی وجہ سے مطالعہ کا ذوق جو سیتاپور کی اسکولی زندگی سے ہی شروع ہوگیا تھا یہاں عشق کی حد تک بڑھ گیا لیکن یہ عشق آزادیٔ مطالعہ کی وجہ سے تشکیک ولادینی کی راہ پر لاکھڑا کر گیا۔ پَر ہادیٔ عالم کی کرشمہ سازی کہیے یا پھر اسی طالبِ علم کی صدقِ طلب کے ساتھ حق کی جویائی، کہ اسلام کی طرف بازگشت بھی اسی مطالعہ کی راہ سے نصیب ہوئی۔ ۲۵ء سے باضابطہ اسلامی صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور درمیان میں کچھ کچھ وقفہ کے ساتھ تاحینِ حیات یکے بعد دیگرے سچ، صدق اور صدقِ جدید نکالتے رہے۔ ۲۸ء میں حضرت تھانویؒ سے ملاقات ہوئی اور زندگی میں بہت کچھ انقلاب آیا۔ ۲۹ء میں اپنی اہلیہ محترمہ کے ساتھ جاکر حج کر آئے اور وہاں کے مشاہدات وتأثرات کو سفرِ حجاز کے نام سے مرتب فرمایا۔ کتاب ہاتھوں ہاتھ لی گئی اور تبصرے

بھی شاندار اور بڑے ہی جاندار، ہفتوں کیا معنٰی، مہینوں نکلتے رہے۔ ۱۹۳۳ء میں مقیم خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون مولوی سراج الحق مچھلی شہری مرحوم کی تحریک سے تفسیری کام شروع کیا اور حضرت تھانوی کے تفسیری افادات کی روشنی میں پہلے انگریزی اور کچھ ہی عرصہ بعد اردو تفسیر مرتب فرمائی حضرت تھانویؒ اور مولانا محمد علی جوہرؒ کے ساتھ اپنے ذاتی تعلقات وتأثرات اوسط درجہ کی ضخامت والی دو کتابوں ''حکیم الامت۔نقوش وتأثرات'' اور ''محمد علی۔ذاتی ڈائری کے چند ورق'' میں شائع کیا۔ اخیر عمر میں اپنی آپ بیتی بھی بار بار کی نظرِ ثانی کے بعد ترتیب دے گئے جو وفات کے بعد منظرِ عام پر آئی۔ان کے علاوہ اپنے ادیبانہ قلم کے ذریعہ اردو ادب کے ذخیرہ میں ایک قابلِ فخر اضافہ کر گئے جس کا ذکر آگے اپنے اپنے موقع پر آئے گا۔

زبان وقلم کی جادو بیانی جو مخاطب کی طبیعت کو مانوس، دل کو مالوف اور شخصیت کو ہر طرح سے اپنے قابو میں کر لے اور ساتھ ہی ساتھ قاری کے دل میں صالح جذبات کی تحریک پیدا کرے اسے ادب کہا جاتا ہے۔

ادب کے سلسلے میں دنیا کا ایک چلتا ہوا نظریہ اور نعرہ ''ادب برائے ادب'' ہے۔فی نفسہ اس کے محمود ہونے میں ہمیں کوئی کلام نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ خود اس تحریک کے علمبرداروں سے اپنی اس تجویز کی بجاآوری کہاں تک ہو پائی ہے؟ International Library Of Famous Literature (انٹرنیشنل لائبریری آف فیمس لٹریچر) کے نام سے ترتیب دی گئی تقدیم میں پُرزور تمہید باندھتے ہوئے کہا یہ گیا کہ دنیا جہاں کے ادبیات کے تمام بہترین انتخابات کو اس کتاب میں جگہ دی جائے گی۔چنانچہ ایک جلد میں جہاں ذکر قرآن کے ادبیات کا ہے وہیں ایک تصویر بانیٔ اسلام کی دی گئی ہے۔تصویر کیا ہے؟ایک بارعب وہیبتناک جنگجو عرب سردار کی پوری طرح عکاس۔چہرہ پر بجائے کسی طرح کی لینت کے خشونت، اور جمال کے جلال، ہاتھ میں کمان، شانہ پر ترکش، اور کمر میں تلوار حمائل۔۔۔۔تصویر مستند کتنی ہے اور حقیقت پر مبنی ہے بھی یا نہیں؟اس بحث کو

جانے دیجئے صرف یہ دیکھیے کہ کسی کی تصویر سے ادب کو کیا تعلق؟؟ لیکن موضوع جو کچھ ہو بات ہیر پھیر کر اسلام اور شارعِ اسلام کی طرف لے آنا اور چپکے سے شعائرِ اسلام پر حملہ کر کے ایک خالی الذہن اور سادہ لوح قاری کے ذہن میں اسلام سے متعلق شکوک وشبہات کے بیج بو کر آگے بڑھ جانا موجودہ مدعیانِ ادب کی خصلت نہیں تو عادت ضرور ہے۔ ادب کے حاملین اور اس کے باتمکین شائقین کے نزدیک اگر ادب کی صحیح خدمت یہی ہے تو ایسا ادب انھیں ہی مبارک اور ایسے آرٹ سے ہزار وصد ہزار بار پناہ!

ورنہ ادب کی صحیح خدمت تو یہ ہے کہ اس سے پاکیزہ معاشرہ کی تعمیر وتشکیل میں بھرپور مدد لی جائے نہ کہ الٹا تخریب میں، اور اس سے معاشرہ میں درآمد اخلاقی خرابیوں کا استیصال کیا جائے نہ کہ انہیں اور دعوت دی جائے اور فطرت کی آواز کو گھر گھر پہونچایا جائے اور یہ جو فطرت کی آواز کہا گیا نقلِ صحیح سے ثابت شدہ اور عقلِ سلیم کا تسلیم شدہ فتویٰ یہ ہے کہ وہ آواز صرف اور صرف مذہب اسلام ہے یہی وجہ ہے کہ ایک مسلمہ ادیب بھی اپنے ادبی انٹرویو میں ادب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''صالح وصحت منداد ب وہی ہے جو صحیح مذہبیت کے تحت میں ہو''

(تشریاتِ ماجد حصہ دوم ص:۵۱)

تحریر کے بارہ میں عوام کیا معنٰی خواص میں بھی عام طور پر یہ خیال پیدا ہو چلا ہے کہ کسی دینی یا اخلاقی موضوع پر تصنیف وتالیف یا مضمون ومقالے کے لئے قلم کا ادب وانشاء کے سانچے میں ڈھلا ہونا کچھ ضروری نہیں حالاں کہ نصِ قرآنی **ھو افصح منی لسانًا فارسلہ معی** (حضرت موسٰی دربارِ خداوندی میں یہ درخواست پیش کر رہے ہیں کہ میرے بھائی ہارون مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہیں انھیں بھی میرے ساتھ نبی بنا کر فرعون کے یہاں تبلیغ کے لئے بھیجا جائے) اور حدیثِ نبوی **انا افصح العرب** (میں عرب میں سب سے زیادہ فصیح ہوں) کی رُو سے یہ خیال بجا نہیں بلکہ اس کے برعکس انہیں سے مذہب کی تبلیغ واشاعت میں اس کا نہ صرف محمود ہونا بلکہ ایک حد تک مطلوب ہونا ہی

معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے یہ غلط فہمی مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی تحریری لوازمات سے متعلق رائے پر ایک نظر ڈالنے سے کچھ اور دور ہو جائے۔

''تصنیف وتالیف جب خود ایک مستقل آرٹ ٹھہرا تو آرٹسٹ کے لئے لازم ہے کہ اسے ناظرین باتمکین کی طبیعت پر، جبلت پر، نفسیت پر پورا عبور حاصل ہو، عبارت دقیق ہو ثقیل نہ ہو، سادہ ہو پھیکی نہ ہو، سلیس ہو سپاٹ نہ ہو، سنجیدہ ہو خشک نہ ہو، عام فہم ہو عامیانہ نہ ہو، لطیف ہو رکیک نہ ہو، ٹھوس ہو ٹھس نہ ہو، فکر انگیز ہو مگر بوجھ کرنے والی نہ ہو، پُرزور ہو مگر پُرشور نہ ہو''

(انشائے ماجد ص:۲۸۷)

ہم مسلمانوں میں اچھے اچھے انشاء پردازوں، ادیبوں اور بہترین مصنفین کی کوئی کمی نہیں مگر چوں کہ زمانہ طفلِ مکتب ہی سے ان میں سے اکثر کے دماغوں، عقلوں اور بصیرتوں۔ سے خطِ غلامی لکھالیا جاچکا ہوتا ہے اس لئے ان کی تحریریں بھی انہیں کے رنگ میں رنگی ہوتی ہیں، یہ لوگ دوسرے موضوعات پر بہت کچھ اور بہت اچھے انداز میں لکھ لیتے ہیں مگر اسلام پر کسی طرح کے حرف آنے کے وقت ان کے قلم کی دفاعی قوت بھی جواب دے جاتی ہے اور

آنچہ استاذِ ازل می گفت ہماں می گویم

والے معاملہ پر عمل کرنے لگتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ہی ایک اچھے قلمکار بن کر ان ذمہ داریوں کو اپنے سر لیں اور شعائرِ اسلام پر کسی بھی طرح کے حملہ کے وقت اسلام کی طرف سے دفاع کے لئے ہر ہمیشہ قلم برداشتہ رہیں۔

یہ انسان کی فطرت ہے کہ جب کبھی وہ کسی منزل کے لئے رختِ سفر باندھتا ہے تو پہلے پہل راہ کی دشواریوں سے گھبرانے لگتا ہے لیکن جیسے ہی کسی رہنما کی اسے رہبری حاصل ہوگئی اُدھر وہ منزلِ مقصود کی جانب بڑی تیز گامی کے ساتھ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یعنی یہی صورت ایک مبتدی مضمون نگار کو اپنی تحریری زندگی کے آغاز میں پیش آتی ہے۔ اگر کسی مشاق لکھنے والے کی رہنمائی حاصل

کر صدفی صدا سی کے انداز میں اپنے اسلوب بیان اور طرز تحریر کو ڈھالنے کی کوشش کرتا رہے انشاء اللہ کامیابی ایک نہ ایک دن ضرور حاصل ہو کر رہے گی۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اپنی مضمون نگاری وانشاء پردازی کے سیکھنے سکھانے سے متعلق سوال قائم کر کے خود جواب دیتے ہیں۔

''یقیناً بعض دلوں میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ یہ لکھنے لکھانے کا فن آخر کس سے میں نے سیکھا اور کب سیکھا؟ اصل اور صحیح جواب یہ ہے کہ کس سے بھی اور کبھی بھی نہیں سیکھا، اور حقیقی معنٰی میں بالکل بے استاد اہوں۔۔۔۔ پھر بھی اگر کسی کے لئے لفظِ استاد کا اطلاق کر سکتا ہوں تو وہ بلا شک وشبہ مولانا شبلیؒ تھے، ان کا ممنون احسان دل کی گہرائیوں سے ہوں، لکھنا لکھانا جو کچھ بھی آیا ان کی نقالی میں آیا۔ برسوں ان کا چربہ اتارتا رہا ہوں۔ ان کے فقرے کے فقرے، ترکیبوں کی ترکیبیں نوکِ زبان پر تھیں۔ اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ حسنِ ترتیب، صفائیۂ بیان ان کا حصہ تھا۔ اب بھی میرا مشورہ مبتدیوں کے لئے یہی ہے کہ علمی سنجیدہ مضمون نگاری اگر سلیس انداز میں سیکھنا ہے، تو مولانا ہی کی کتابوں سے سیکھے'' (آپ بیتی ص: ۳۰۷، ۳۰۸)

اور اردو دونوں زبانوں کی یکساں ادیب عالمی شخصیت مولانا ابوالحسن علی ندوی اپنی انشاء اور مضمون نگاری کے متعلق لکھتے ہیں۔

''رسالہ ''توحید'' میں مولوی محی الدین قصوری کا ایک سلسلۂ مضامین ''ہندوستان کا مجاہدِ اعظم'' یا ''مجددِ اعظم'' کے نام سے نکلا۔۔۔۔ بھائی صاحب نے مجھے اس کے عربی ترجمہ کی ہدایت کی، اور مشورہ دیا کہ پہلے میں تاریخ وسیر کی مستند اور سلیس کتابیں دیکھ لوں، اور ان کی خاص خاص تعبیرات اور مطالب کے طریق ادا جس کی تاریخ اور سوانح میں ضرورت

پڑتی ہے، نوٹ کرلوں۔ میں نے اس غرض کے لئے ابن الاثیر کی ''الکامل'' دیکھی
اور خاص خاص الفاظ ومحاورے نوٹ کرتا گیا، اس کے بعد مجھے ترجمے میں
بڑی آسانی ہوئی'' (کاروانِ زندگی ص: ۱۱۸، ۱۱۹)

ابتدائی مضمون نگاری وانشاء پردازی کی یہ سرگزشت خود دو مایہ ناز ادیبوں کی رقم فرمودہ ہے۔ ممکن ہے تلاش وجستجو سے کچھ اور نمونے بھی سامنے آجائیں جن سے ان کے پاکیزہ مذاقِ ادبی کی ترجمانی ہوتی ہو۔

بڑی شدت سے ضرورت اس بات کی محسوس کی جارہی تھی کہ اردو زبان میں ایک صالح وصحت مند ادبی لٹریچر مبتدی مضمون نگاروں کے لئے چند مسلّم خسروانِ ادب کی تحریروں سے یکجا کیا جائے جو طرزِ تحریر، طریقۂ تعبیر، الفاظ ومحاورات کی صحیح نشست اور دیگر اپنی بہت خوبیوں کے لحاظ سے نووارد رہروانِ ادب کی رہبری کا فریضہ بہتر طور پر انجام دے۔ اس ضرورت کی تکمیل کے لئے شروع شروع میں یہ خیال تھا کہ علامہ شبلیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے ادبی شہ پاروں کو تقابلی مطالعہ کے طور پر ایک مجموعی شکل میں مرتب کردیا جائے گا، لیکن جوں جوں اس منزل میں قدم آگے بڑھتے گئے کام کی وسعت کی وجہ سے خیال میں بھی بہت کچھ ترمیم کرنی پڑی اور اخیر میں یہ رائے ٹھہری کہ ہر ایک کے ادبی جملوں کو ممکنہ حد تک ان کی تحریروں کے استقصاء کے ساتھ الگ الگ کتابی شکل میں شائع کیا جائے۔ صاحبِ طرز ادیب مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے ادبی شہ پاروں کے یہ دو حصے پیشِ خدمت ہے۔ بقیہ ادیبوں کے ادبی مجموعے انشاء اللہ جلد ہی یکے بعد دیگرے منظرِ عام پر آتے رہیں گے۔

ان ادبی جملوں کے انتخاب میں جہاں ہم نے لحاظ اچھوتے اسلوبِ بیان، نت نئی تراکیب، واقعات کی مصوری اور ماحول کی منظر کشی کی حامل عبارتوں کا کیا ہے وہیں اس بات کی بھی کوشش کی ہے کہ اسلامی تعلیمات، سبق آموز حکایات اور عہدِ حاضر کے اہم اور پیچیدہ مسائل پر زبان کی سلاست، نوکِ قلم کی نزاکت اور مضمون کی جامعیت کے ساتھ ہمارے ادیب حضرات نے جو کچھ

گلکاریاں کی ہیں اور جس فن میں جس طرح کے ادبی نمونوں کی ضرورت پڑتی ہے ان کا ایک وافر حصہ ان مجموعوں میں آ جائے تا کہ مضمون نگار شروع ہی سے ادب کی چاشنی اور زبان کی شیرینی کے ساتھ ہی ساتھ صحیح اسلامی فکر کی غذا بھی پاتا رہے۔

ہر چند کہ بغیر مالی کے باغ و چمن کی سیر پھلوں پھولوں سے عدم تعارف کی وجہ سے لذت و سرور میں نقص و کمی کا باعث ہوتی ہے، پر کیا کیا جائے؟ جو رہبر بن بیٹھا وہ خود مبتدی ایک ادیب کے جملوں کی توضیح و تشریح کیوں کر سکتا ہے؟ اور پھر بغیر مالی کے بھی تو چمن کی سیر خود ایک بڑی لذت ہے! کیوں نہ اسی سے محظوظ ہوا جائے البتہ ہر باب کے شروع میں جن کتابوں سے ادبی جملے نقل کئے جا رہے ہیں ان کتابوں کی ادبی حیثیت نمایاں کرنے کے لئے مختصر سا تعارف کر دیا گیا ہے۔

اب ان تمناؤں کے ساتھ ہم یہ ادبی مجموعہ پیش کرتے ہیں کہ خاص کر اس کا مبتدی مضمون نگار قاری اعلیٰ فکر اسلامی کو اپنا رہنما بنا کر ناظرین با تمکین کی نفسیت، جبلت اور طبیعت پر عبور حاصل کرتے ہوئے سنجیدہ، عام فہم، سلیس، سادہ، بے تکلف اور فکر انگیز اپنے عالمانہ، فاضلانہ، محققانہ اور ادیبانہ قلم کے ذریعہ حتی المقدور تعلیماتِ اسلامی کو فروغ دیتا رہے گا۔

اب التجاء قارئین سے صرف یہ ہے کہ اگر اس سے کچھ حاصل ہو جائے تو راقمِ سطور، اس کے والدین اور ان تمام احباب کے لئے استقامت فی الدین اور خاتمہ بالخیر کی دعا فرمادیں جنھوں نے اس کتاب کی جمع و ترتیب میں اپنا دستِ تعاون دراز کیا ہے ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین .

محمد سمیع الدین

اعظمی منزل دار العلوم دیوبند

۱۱ ربیع الاول ۱۴۲۳ھ

پہلا باب

تفسیرِ ماجدی

مسلم گھرانے میں پروردہ اور منطق وفلسفہ کا دلدادہ، اٹھارہ انیس سالہ، عمر کے لحاظ سے ابھی گویا معصوم، ایک طالب علم اپنے کالج کے ابتدائی دور میں اور مل اور اسپنسر کی جوشِ تقلید میں لگا تنقید کرنے علامہ شبلی مرحوم کی کتاب ''الکلام'' پر خود اسی طالب علم کی آپ بیتی سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

''مولانا شبلیؒ کی علمیت وقابلیت کا سکہ ۱۹۰۶ء و ۱۹۰۷ء میں دل پر بہت گہرا بیٹھا تھا، لیکن کالج میں آ کر لادینیت، تشکیک ولادینی کے سیلاب میں وہ زیادہ دن نہ ٹک سکا۔ الٹی خود انہیں پر تنقید شروع کر دی۔ ۱۹۱۰ء کا زمانہ تھا کہ ان کی کتاب الکلام پر ایک زبردست تنقید سوا سو صفحے کی ضخامت کی ماہ نامہ ''الناظر'' کے لئے ''ایک طالب علم'' کے نام سے لکھی اور اس میں ۶، ۷ قسطوں میں نکلی، تنقید دراصل اسلامی بنیادی عقائد وجودِ باری رسالت وغیرہ پر تھی، صرف آڑ مولانا کے نام کی تھی'' (آپ بیتی ص:۲۱۳)

دس سال کی نیم ارتدادی حالت کے بعد یہ راہیٔ اسلام جس ذوقِ مطالعہ کی راہ سے الحاد کی راہ پر جا پڑا تھا اسلام کی طرف بازگشت بھی ہادیٔ عالم نے رفتہ رفتہ اسی راہ سے عطا فرمائی۔۔۔۔ ۱۹۲۸ء میں ملاقات مجددِ وقت حضرت تھانویؒ سے ہوئی اور تعلقات کی حد تک بڑھی اور تعلقات بھی ایسے کہ قیام کئی کئی ہفتوں کے لئے ہونے لگا انہی میں سے ایک قیام کے دوران وہ واقعہ پیش آیا جو تفسیرِ ماجدی کا اصل محرک ثابت ہوا۔

اپنی یہ سرگزشت مفسرِ ماجدی خود بیان کرتے ہیں۔

''۱۹۳۳ء تھا، اور اپنا قیام اس وقت تھانہ بھون کئی ہفتوں کی مدت کے لئے تھا،

کہ ایک مقیم خانقاہ مولوی سراج الحق مچھلی شہری استاد مجید یہ انٹرمیڈیٹ کالج الٰہ آباد سے ملاقات ہوئی اور تعلقات بڑھے۔ یہ مخلص ہونے کے ساتھ ہی صاحبِ فہم ونظر بھی نظر آئے، جو ایک بہت بڑی بات ہے۔ ایک روز انہوں نے باتوں میں کہا کہ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ اہلِ سنت وجمہورِ امّت کی طرف سے قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ ایک بھی موجود نہیں۔ آپ خود یہ کام کر ڈالئے۔ میں اپنی انگریزی اور عربی دونوں کی قابلیت کے حدودِ اربعہ سے خوب واقف تھا، ان کی فرمائش پر دنگ ہی رہ گیا، اور جواب کچھ اس طرح کا دیا کہ آپ نے حسنِ ظن کی حد کر دی، کہاں میں اور کہاں اتنا بڑا کام! کچھ تھوڑی بہت مناسبت بھی تو ہو؟ لیکن وہ کیا ماننے والے تھے، اصرار کئے گئے، آخر میں بولے ''نیا ترجمہ نہ سہی، آخر محمد علی لاہوری کا ترجمہ تو موجود ہی ہے، اسی کو زمین بنا کر اسی میں ترمیم وتصرف کر کے کام چلایئے''۔۔۔۔اب ان کے اخلاص کی کرامت سمجھئے یا جو کچھ، بات دل میں اتر سی گئی، اپنی کامل نااہلی کے احساس کے باوجود بھی ہمت ہی کر ڈالی، اور اللہ کا نام لے کر جوں توں قلم ہاتھ میں لے لیا'' (ایضاً ۲۹۲)

اور پھر آگے قصورِ اعتراف کے ساتھ خدمتِ قرآن کے ہو جانے پر استعجاب بھی ملاحظہ فرمایئے۔

''اپنی اہلی، نا قابلیت اور اپنی علمی بے بساطی پر غور کرتا ہوں تو دو دو تفسیروں کا کام بَن پڑ جانے پر دَنگ وحیران ہی رہ جاتا ہوں۔ ہزار سُقم اور خامیوں کے ہوتے ہوئے بھی یہ تفسیریں وجود میں آئیں کیوں کر! چاہیے تو یہ تھا کہ ورق دو ورق کے بعد قلم جواب دے جاتا!۔۔۔۔ شانِ کریمی وکارسازی کے بس قربان جایئے کہ وہ چاہے تو کاہ سے کام کوہ کا،

اور چیونٹی سے ہاتھی کا لے لے'' (ایضاً ۲۹۷)

اس طرح عقائدِ اسلام پر نقد کرنے والا طالب علم قدرت کی کارفرمائی دیکھیے کہ یک بیک اسلامی عقائد کا پاسبان وترجمان بلکہ دو دو زبانوں (اردو اور انگریزی) کا مفسرِ قرآن کہلانے لگا۔

تفسیرِ ماجدی اپنی بہت سی خوبیوں، خصوصیتوں اور عصرِ حاضر میں بہت سے متلاشیانِ حق کے مذاق کے موافق ضروری توضیحی عبارتوں کی بنا پر نہ صرف اردو اور انگریزی بلکہ تمام ذخیرۂ تفسیر میں اپنی ایک انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی منجملہ خوبیوں میں ایک یہ ہے کہ اس کی زبان سلیس، سادہ اور بے تکلف مگر دلکشی اور دلچسپی کے تمام تر سامان سے آراستہ ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مفسر نے تفسیر کے پردہ میں نہ اپنی مجتہدانہ آراء پیش کرنے کی جسارت کی اور نہ اسلاف کے نقشہائے پا سے قدم ہٹانے کی جرأت، بلکہ ایسے تمام مقامات پر جمہورِ امت کے راجح اقوال نقل کر کے مسلکِ جمہور کی ترجمانی پر گویا اپنے کو کاربند رکھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تفسیری عبارتوں کے ذیل میں مذاہب وملل اور نفسیات وسائنس کی جدید تحقیقات سے متعلق وہ تمام باتیں درج کر دیں جن کے باذوق تفسیری طالب علم جویا رہتے ہیں اور ان سب پر مستزاد یہ کہ اسلامی تعلیمات وہدایات کی روشنی میں ''جدید مغربی تہذیب'' اور اس کے ''عواقب ونتائج'' کا جس طرز میں جائزہ لیا ہے یہ مفسر ہی کے قلم کا کمال ہے۔

یہ عظیم تفسیر ایک فاضل ومحقق مفسر کی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک صاحبِ طرز ادیب کی بھی ہے۔ اس بنا پر ناممکن تھا کہ اس کے توضیحی نوٹس اور تفسیری عبارتیں فصاحت وبلاغت کے قواعد سے ناآشنا اور ادب وانشاء کے جواہر پاروں سے یکسر خالی رہتیں۔ حضرت مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس صاحب ندوی ''تفسیرِ ماجدی کی خصوصیات اور ان کی انفرادیت'' پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اس تفسیر کی انفرادیت کا پانچواں رُخ یہ ہے کہ قرآن کی عظمت کا تصور شروع سے آخر تک قائم رہتا ہے۔ کلامِ الٰہی کا جلال وجمال، اس کی معنویت،

اثر انگیزی، آیاتِ رحمت میں رحمت کا منظر، آیاتِ غضب میں رونگٹے کھڑے
کرنے والا جو انداز ہے اس کو دوسری زبان میں منتقل کرنا آسان نہیں ہے
بشر پھر بھی بشر ہے، اس کے کلام میں وہ زور کہاں آسکتا ہے جو اصل میں ہے مگر
اس کا کوئی شمہ، کوئی معمولی سے معمولی حصہ اگر انسان اپنی زبان میں منتقل کرسکتا
ہے تو اس کی نمائندگی تفسیرِ ماجدی کرتی ہے' (جدید ایڈیشن تفسیر ماجدی ص:۱۰۰۷)

چنانچہ اس کلامِ معجز کے ارد گرد ہمیں زبان وادب کے اعتبار سے اعلیٰ اور معیاری بہت سے ادبی شہ پارے دکھائی دیئے دل پر جبر کرکے ہر چند کہ بہت سے جملوں پر خطِ نسخ کھینچ دیا گیا ہے۔ تاہم اب بھی جو کچھ اور جتنا ذخیرہ رہ گیا ہے اس پر ''بہت'' اور ''بہت زیادہ'' کا اطلاق بآسانی ہوسکتا ہے لیکن اِن کی ادبی رعنائی اور طرزِ ادا کی بے نظیری کی وجہ سے طبیعت مزید قطع وبُرید پر آمادہ نہ ہوگی البتہ کثرتِ مضامین کی وجہ سے ہم نے انہیں چند فصلوں میں تقسیم کردیا ہے۔

تفسیر ماجدی کے حوالہ جات سے متعلق ایک بات یہ ذہن میں رہے کہ ''تفسیری عبارتیں'' کے عنوان کے تحت سرِ مضمون جو آیتوں کے ٹکڑے نقل کئے گئے اس سے متصلاً حوالہ بالترتیب سورت اور آیت نمبر اور ختمِ مضمون کے تمام ہی حوالے سورت اور حاشیہ نمبر کی طرف مشیر ہیں اور دوسری یہ کہ موضوع کی مناسبت سے مولانا کی ایک مستقل کتاب ''قرآنی شخصیات'' کو بھی اسی باب میں شامل کرلیا گیا ہے۔

فصل اول

مضامینِ قرآن

توحید

زمین اگر ۲۵ ہزار میل کے محیط کا کوئی گولا ہے تو، یا اگر کوئی غیر پیمائش شدہ وسعت کی کوئی چپٹی چیز ہے تو بھی، اگر تیزی اور پھرتی کے ساتھ گردش کر رہی ہے، یا اگر اپنی جگہ پر ساکن ہے تو بھی، ہر حال میں اور ہر صورت فرض کرنے کے بعد بھی، کیسی عظیم الشان کاریگری، کیسی بے مثال صناعی کا نمونہ ہے! فضا کی خلا میں کس کی قوت اسے تھامے ہوئے، سنبھالے ہوئے ہے؟ اس کے اور چاند، سورج اور ستاروں اور سیاروں کے درمیان فاصلہ کا ایک خاص تناسب کس نے قائم کر رکھا ہے؟ اس کی رفتار کی ایک خاص شرح کس نے متعین کر دی ہے؟ آفتاب سے اسے ایک خاص مقدار میں روشنی اور گرمی کون پہونچا رہا ہے؟ چاند سے روشنی اور خنکی ایک متعین حساب کے ساتھ کس کا دستِ قدرت اس تک لا رہا ہے؟ آسمان اگر ٹھوس، مادی اجسام ہیں تو یا خلا میں محض حدِ نظر ہیں تو بھی ہر صورت میں ان کی وضع، ساخت، ترکیب، ہیئت، انسانی دست رس سے کتنی بالاتر ہے! گنتی شمار سے باہر، ثوابت و سیارے کے سکون و حرکت کا انتظام کون قائم کئے ہوئے ہے؟ ستاروں کی یہ روشنی، اور اُن کے طلوع وغروب میں یہ باقاعدگی کس کے حکم سے قائم ہے؟ نظامِ فلکی کے بے شمار اجزاء وعناصر میں یہ ترتیب اور باہمی تناسب کس کی حکمت وصنعت کے دم سے زندہ ہے؟ رات اور دن کس طرح ایک برتر قانون کے اندر جکڑے نظر آ رہے ہیں؟ گرمی اور سردی اور برسات ہر موسم میں اُن کے اندر مناسب وقت تبدیلیاں کون کرتا رہتا ہے؟ مختلف ملکوں میں اُن کے طلوع وظہور کے وقت کیسے بندھے ہوئے ہیں؟ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ جس وقت کلکتہ میں دن نکلتا ہے، دمشق میں بھی دن نکل

آئے، نہ یہ ہوتا ہے کہ امریکہ کی شام کبھی کبھی ایران کی شام بن جائے، جنوری میں جو اوقات اندھیرا چھا جانے کے ہوتے ہیں یہ نہیں ہوتا کہ جون میں وہی باقی رہ جائیں، آخر یہ رات دن کے بندھے ہوئے اور قانون کی زنجیر میں جکڑے ہوئے تغیرات کس کی حکومتِ قاہرہ اور حکمتِ کاملہ کی شہادت دے رہے ہیں؟ بحرِ ذخار سارے برِّ اعظموں کو اپنی گرفت میں لئے رہنے والا، رقبہ میں خشکی سے چہار چند، اپنی اس ساری عظمت و ہیبت کے باوجود کس طرح مشتِ خاک انسان کے قبضہ میں آ گیا ہے؟ کس طرح لکڑی کے تختوں کو جوڑ جاڑ کر ان میں کیلیں ٹھونک ٹھانک کر، ان پر لوہے کی چادریں چڑھا کر انسان سمندر کے بڑے بڑے مہیب فاصلوں کو طے کر کے رکھ دیتا ہے! اس میں جزر و مد جب ہوگا قمری مہینوں کی فلاں فلاں ہی تاریخوں پر ہوگا، اپنی ساری غضب ناک تُندی کے باوجود ایک خاص رقبہ کے حدود سے آگے نہ بڑھ سکے گا، ایک مخصوص و متعین ہی وزن کی چیزوں کو وہ اپنے اوپر تیرائے گا، اور اس کے علاوہ وزن والیوں کو ڈبو دے گا، اس کے پانی کا ایک مخصوص مزاج، خاص رنگ خاص مزہ ہوگا، کنوؤں کے پانی سے مختلف، دریاؤں کے پانی سے مختلف، اس طرح سیکڑوں دوسرے قانونوں کا پابند اسے کس کی مشیت، کس کی قدرت، کس کی حکومت نے کر رکھا ہے؟ بارش کا خاص خاص فصلوں میں، خاص خاص موسموں میں، خاص خاص فضائی تغیرات کے ماتحت ہونا، بخارات کا ایک خاص گرمی پا کر سمندری ذخیرۂ آب سے اٹھنا، ایک خاص درجہ کی سردی پا کر اُن دُخانی و ہوائی اجزاء کا منجمد ہو جانا، اُن کا بادل کی شکل اختیار کر لینا، ایک خاص درجۂ ثقل تک بڑے بڑے بھاری اور بوجھل بادلوں کا فضا میں سنبھلے رہنا پھر فلاں فلاں فضائی تغیرات کے ماتحت فلاں فلاں علاقہ تک جانا، پھر ایک بندھی ہوئی مقدار میں ایک متعین مدت تک کے اندر برس پڑنا، اس سے ازسرِ نو خشک زمین میں جان پڑ جانا، یہ سارے ردّ و بدل کسی حکیم کی حکمت، کسی آمر کی حکومت، کسی قادر کی قدرت کی کیسی کھلی ہوئی شہادت دے رہے ہیں! پھر حیات نباتی کے علاوہ خود حیاتِ حیوانی جن عجائب کا مجموعہ ہے ہر زندہ جسم میں بے شمار ذرّوں اور خلیوں کا مجموعہ ہوتا ہے، ان میں ایک مخصوص ترتیب اور متعین ترکیب ہوتی ہے، ایک خاص درجہ کی حرارت جو حیات کو قائم رکھتی ہے، ایک

خاص مقدار سے بڑھی ہوئی سردی جو اس لف میں نشر، اس اجتماع میں انتشار پیدا کر دیتی ہے، نظامِ تغذیہ، نظامِ تنفس، نظامِ تناسل، نظامِ عصبی وغیرہ جسم کے اندر متعدد نظامات، پھر ہر نظام کے ماتحت بے شمار قاعدے اور ضابطے، اس سارے نظامِ اعظم کی تکوین وقیام پر کس کی قدرت، کس کی مشیت، کس کی حکومت کارفرما ہے؟ اس قسم کے سیکڑوں، ہزاروں سوالات پر انسان جتنا زیادہ غور اور نکتہ سنجی سے کام لے گا، توحید اور توحیدی حکمتوں کا نقش دل پر اور زیادہ ہوتا جائے گا، جاہلی اور غیر مؤمن قوموں کے فلسفہ اور سائنس کا صرف نقطۂ نظر غلط ہوتا ہے، اس کی اگر تصحیح ہو جائے، اور ان علومِ مادّی کا مطالعہ اگر ایمانی نقطۂ نظر سے شروع کر دیا جائے تو بجائے الحاد، ارتیاب وتشکیک کے عرفان و ایقان کی راہیں روز بروز روشن تر ہوتی جائیں گی۔

۵۹۰:۲)

زمین وآسمان کے یہ سارے کارخانے، جو دنیا کے ہر طلسم سے بڑھ کر حیرت انگیز اور انسانی سائنس کے ہر شعبہ سے عجیب تر ہیں، بجائے خود اس کی دلیل ہیں کہ نہ یہ اپنے آپ وجود میں آسکتے ہیں، نہ باقی رہ سکتے ہیں، جب تک کوئی صاحبِ شعور، صاحبِ ارادہ قادرِ مطلق ہستی اُن کی صانع وخالق نہ ہو، ان سارے مظاہرِ فطرت کا تسلسل واستمرار، ان کی یک رنگی وباقاعدگی، ان کا نظم وانضباط، ہر عقلِ سلیم کو مجبور کر رہے ہیں کہ اُن کے عقب میں ایک ذی اختیار فعّال ہستی کا ہاتھ تسلیم کیا جائے، اُسی عقلِ سلیم کو جو ایک معمولی سی گھڑی کو بھی بغیر کسی ماہر فن اور صناع گھڑی ساز کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیتی ہے! یہ خلّاق ہستیاں اگر بہ صیغۂ جمع یعنی ایک سے زائد فرض کی جائیں، تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ایک خالق ان سارے امور کے لئے کافی نہ تھا، اس سے اس کا عجز ثابت ہوا، اور جو عاجز یا کسی بات میں ناقص ہے، وہ خالق نہیں ہوسکتا، اس لئے اگر کسی کی ربوبیت اور خالقیت پر اعتقاد ہے تو اسے لامحالہ واحد ویکتا بھی ماننا پڑے گا۔

(۵۹۰:۲)

سورۂ فاتحہ اور انجیلی دعا

یہ خوش عقیدگی نہیں اظہارِ حقیقت ہے کہ جس حیرت انگیز ایجاز و جامعیت کے ساتھ سورۂ فاتحہ کی سات مختصر آیتوں میں توحیدِ الٰہی اور صفاتِ کمالیہ کا بیان آ گیا ہے اس کی نظیر سے مذاہبِ عالم کے دفتر خالی ہیں، اور اس سے بڑھ کر تو کیا اس کے برابر بھی مثال پیش کرنے سے دنیائے مذہب عاجز ہے، مسیحی دنیا کو بڑا ناز اپنی انجیلی Lords Prayer دعا پر ہے، لیکن اول تو اس کا ضعفِ اسناد بھی خود مسیحی فاضلوں کو مسلّم ہے، یعنی اس کی تحقیق نہیں کہ الفاظ خود حضرت مسیح کے ہیں بھی! پھر چیز جہاں سے بھی آئی ہو، یہاں اس کے الفاظ سورۂ فاتحہ کے بالمقابل درج کیے جاتے ہیں، ہر مُنصف مزاج خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ قرآن مجید کی فاتحۃ الکتاب اور اس انجیلی دُعا کے درمیان کیا نسبت ہے!

سورۃ الفاتحہ	انجیلی دعا
۱۔ ساری تعریف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے (وہ) سارے جہانوں کا مُربّی۔	۱۔ اے ہمارے باپ تو جو آسمان پر ہے تیرا نام پاک مانا جائے۔ (متی ۶:۹۔۱۴)
۲۔ (وہ) نہایت رحم کرنے والا (وہ) بار بار رحم کرنے والا۔	۲۔ تیری بادشاہت آئے تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی پوری ہو۔
۳۔ (وہ) مالک روزِ جزا کا۔	۳۔ ہماری روز کی روٹی ہمیں آج دے اور۔
۴۔ ہم بس تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور بس تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔	۴۔ جس طرح ہم نے اپنے قرض داروں کو معاف کیا ہے تو ہمارے قرض معاف کر۔
۵۔ چلا ہم کو سیدھا راستہ۔	- - -
۶۔ اور ان لوگوں کا راستہ کا جن پر تو نے انعام کیا ہے۔	- - -
۷۔ نہ ان کا (راستہ) جو زیرِ غضب ہیں اور نہ بھٹکے ہوؤں کا۔	۵۔ اور ہمیں آزمائش میں نہ لا، بلکہ بُرائی سے بچا۔

۱۔ کہاں ربّ العٰلمین کی لامحدود وُسعت و ہمہ گیری اور کہاں آسمان پر بیٹھے رہنے والی بعید اور محدود، اور پھر باپ جیسی محض، مادی تعلق رکھنے والی ہستی۔

۲۔ ایک طرف اعلان ہو رہا ہے ہمہ گیر صفاتِ ربوبیت، رحمانیت، رحیمیت، مالکیت کا اور دوسری

طرف ان کے بجائے ذکر ہے صرف زمین پر آسمانی بادشاہت آنے کا۔

۳۔توحید خالص پر جو زور قرآنی عبارت میں، منعِ عبادت غیر ومنعِ استعانت بالغیر میں ہے انجیلی دعا میں کہیں اس کا پتہ تک نہیں۔

۴۔انجیلی دعا کی آیت نمبر۳ میں روٹی کی اس درجہ اہمیت، مادّیت کی انتہاء ہے۔

۵۔محض بُرائی سے بچنے کی دعا، صراطِ مستقیم پر قائم رہنے کی نسبت سے کہیں زیادہ ہلکی ہے۔

(۲۰:۲)

کلامِ خداوندی

قرآن مجید اپنا پہلا تعارف اس حیثیت سے کراتا ہے کہ وہ ضبطِ تحریر میں آیا ہوا، ایک کتابی شکل میں مرتب، صحیفۂ آسمانی ہے۔ وہ دوسرے مذہبوں کے کتبِ الہامی کی طرح نہیں کہ صاحبِ مذہب کے دماغ میں ان کے حرف ومعانی ومطالب ہوں، اور کوئی راوی ان سے کوئی ٹکڑا نقل کرے اور کوئی کچھ اور۔ یہاں تک کہ صدیوں بعد جب نوبت جمع وکتابت کی آئے تو صحتِ لفظی اور استنادِ حرفی تو خیر بہت دور کی چیز ہے، نفسِ مفہوم ومعنٰی تک منسوخ ہوکر رہے۔ اور نام تو ایک کتاب کا ہو، لیکن اس کی ترتیب وتالیف میں خدا معلوم کتنے انسانی دماغ اور کتنے بشری قلم شریک ہوجائیں! دلائل وشواہد کو چھوڑیئے، محض دعوٰی کی حد تک بھی تو اس باب میں قرآن کی حریف ومقابل کوئی بھی الہامی کتاب نہیں توریت، انجیل، وید کسی کا بھی یہ دعوٰی نہیں کہ وہ لفظ بہ لفظ، حرف بہ حرف نازل شدہ کتاب ہے اور نہ ان کے پیرو انہیں اس حیثیت سے پیش ہی کررہے ہیں۔۔۔۔اس حقیقت کو ایک اور پہلو سے دیکھیے۔ قرآن بجائے خود ایک عالم ہے، اس عالم قدس کے اندر گزر نہ کسی شک وتردد کا ہے نہ خلجان واضطراب کا۔ یہاں تو جو کچھ ہے تسکین واطمنان ہے، علم ویقین ہے، یکسوئی واذعان ہے۔ ہر دعوٰی مدلّل ہے، اور ہر حقیقت ثابت شدہ۔ اب اگر کسی بدنصیب کو اس کے خلاف نظر آتا ہے، تو گناہ چشمۂ آفتاب کا نہیں، قصور شپرۂ چشمی کا ہے۔ اس لئے ارشاد یہ نہیں ہوا کہ اس کے باب میں کسی کو شک وتردد لاحق ہوگا ہی نہیں، بلکہ ارشاد صرف یہ ہوا ہے کہ خود یہ کتاب، اس کے مضامین شک وشبہ سے بالاتر ہیں۔

(۲:۵:۲)

قرآن کوئی تاریخ کا دفتر نہیں کہ اس میں سنہ وار ترتیب کے ساتھ پچھلے زمانہ کے واقعات درج ہوں۔ کوئی سائنس کی کتاب نہیں کہ علوم طبعی وریاضی کے مسائل کا حل اس کے اوراق میں ڈھونڈا جائے۔ کوئی فلسفہ کا مقالہ نہیں کہ اس کے پڑھنے والے اشراقیوں اور مشائیوں، یونانیوں اور ہندیوں کے ظنون اور نظریات میں الجھے رہیں۔ افسانہ ومحاضرات کی کتاب نہیں کہ پڑھنے والے اسے تفریح اور دل بہلانے کے لئے پڑھیں۔ اس کی اصل اور بنیادی حیثیت صرف یہ ہے کہ وہ ہدایت نامہ ہے، دستورِ حیات ہے، مکمل ومفصل نقشۂ زندگی ہے ۔۔۔۔ اس قانونِ عام وتام سے فائدہ اٹھانے والے صرف وہ لوگ ہوں گے جن کے اندر خوفِ خدا موجود ہو۔ کتابِ ہدایت نازل تو ساری انسانیت کے لئے ہوئی ہے۔ خطاب سارے عالم سے کر رہی ہے۔ لیکن عملاً اس سے نفع وہی لوگ حاصل کریں گے جن کے اندر حق کی طلب اور تلاش ہے۔ اور جن کا خمیر زندہ ہے۔ آفتاب اپنی جگہ عالمتاب سہی، لیکن جن کی بصارت ہی ضائع ہوچکی۔ ان کے لئے تیز سے تیز شعاع بیکار ہے۔ زمین اگر مردہ ہے تو اس کے حق میں بڑی سے بڑی بارش بے اثر ہے۔ غذا بہتر سے بہتر بھی ہیضہ کے مریض کے لئے لاحاصل بلکہ مضر ہے۔

(۷:۳)

تکمیلِ دین

اب خدائی پروگرام میں وحدتِ انسانی کا زمانہ شروع ہونے کو ہے، دنیا اب تک مختلف جغرافی حصوں اور ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی، ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر نہایت دشوار تھا، اور آپس میں نامہ وپیام کی بھی کوئی آسان راہ نہ تھی، ہر علاقہ کہنا چاہیے کہ اپنی جغرافی وطبعی سرحدوں کے اندر محصور ومحفوظ تھا، دریا، پہاڑ، سمندر وغیرہ جو راہ میں حائل رہتے، ان کا عبور کرنا تقریباً محال تھا، ریل، سائیکل، موٹر، لاری، تار، ٹیلیفون وغیرہ خواب وخیال میں بھی نہ تھے، اب کائناتِ ارضی کی

تاریخ میں پہلی بار اس کا وقت آ رہا تھا کہ انسانیت کے بٹے اور کٹے ہوئے ٹکڑے ایک دوسرے سے ملیں، رسل و رسائل کے ذرائع وسیع ہوں، اور جس طرح نظامِ تکوینی میں ہر فرد کے لئے اس کے وجود میں آنے سے قبل ہی اس کے لئے ہوا کا، اور روشنی کا اور پانی کا سامان حکمتِ الٰہی موجود رکھتی ہے اسی طرح نظامِ تشریعی میں رحمتِ حق نے چاہا کہ نوعِ انسان کی انفرادی و اجتماعی دونوں زندگیوں کی روحانی و اخلاقی تربیت کا انتظام پیشتر سے موجود رہے چنانچہ قرآن کے سے جامع ہدایت نامہ و دستور العمل کو موجود کر دیا گیا۔

اذان

یہ اسلام کے امتیازاتِ خصوصی میں سے ہے کہ، دوسرے مذہبوں میں اول تو روزآنہ عبادتِ اجتماعی کا دستور ہی نہیں (چہ جائیکہ دن میں پانچ مرتبہ) اور پھر روزآنہ یا ہفتہ وار جب کبھی بھی وقتِ عبادت کے اعلان کی ضرورت پڑتی ہے تو اس موقع پر کام گھنٹہ کی ٹناٹن یا گھنٹی کی ٹن ٹن سے لیا جاتا ہے، یہ شرف صرف اسلام کے ساتھ مخصوص ہے کہ اس نے عبادت کے اعلانِ دعوت کا طریقہ ایسا نکالا کہ جو عبادت کا ذریعہ ہی نہیں، بلکہ بجائے خود بھی ایک عبادت ہی ہے! اذان میں ہوتا کیا ہے؟ نہ باجا نہ گانا، نہ جرس نہ ناقوس، نہ قومی نغمہ نہ ملی ترانہ، بس اللہ کی حکومت و کبریائی، اللہ کی توحید اور محمدؐ کی رسالت کے اقرار کے ساتھ ساتھ لوگوں کو نماز کی طرف بُلاوا! الفاظ کُل یہی ہوتے ہیں کہ اللہ اکبر (چار مرتبہ) اللہ ہی بڑا ہے اشھد ان لا الہ الا اللہ (دو بار) میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں. اشھد ان محمد رسول اللہ (دو بار) میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے رسول ہیں حی علی الصلاح (دو بار) لپکو نماز کی طرف، حی علی الفلاح (دو بار) لپکو فلاح و بہبود کی طرف، الصلوٰۃ خیر من النوم (دو بار) نماز نیند سے کہیں بہتر ہے (صرف نماز فجر کے وقت) اللہ اکبر (دو بار) اللہ ہی بڑا ہے، لآالہ الا اللہ (ایک بار) اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں.

فرمایئے اس سے پاکیزہ تر پکار اور کیا ہو سکتی ہے؟ اس وسیع کرۂ ارض کے جس قطعہ میں

جہاں بھی کوئی مسجد ہے مؤذن اس پاک گھر میں خود بھی پاک وصاف ہوکر باوضو کسی بلند مقام پر کھڑے ہوکر، اللہ کی کبریائی، محمد کی رسالت کی منادی بلند آواز سے کرتا رہتا ہے! ظالم اسی صدائے خیر وفلاح کو روکنا اور بند کرنا چاہتے ہیں۔

(۲۰۵:۵)

حج بین الاقوامی سالانہ کانگریس

اسلام جس طرح فلاح اخروی کا ضامن ہے، فلاحِ دنیوی کا بھی داعی ہے، اور اس کی یہ جامعیت اس کی ہر عبادت سے بالکل صاف ظاہر ہورہی ہے۔ وضو، نمازِ باجماعت، روزہ، زکوٰۃ سب روح کو جلادینے اور باطن کو صیقل کرنے کے ساتھ ساتھ دنیوی، نادی، جسمانی، معاشی فائدوں اور مصلحتوں سے کتنے لبریز ہیں۔ یہی اصول حج کے بارے میں بھی کام کررہے ہیں۔ حج کا منزل درمنزل سفر، بری وبحری طویل سفر، اور امت کے مختلف طبقوں کا دنیا کے مختلف گوشوں سے یہ عظیم الشان اجتماع ایک خشک عبادت اور محض ذکرِ الٰہی کے لئے نہیں، فرد وملت دونوں کے لئے یعنی انفرادی واجتماعی ہر قسم کے فائدے اس سے حاصل کئے جاسکتے ہیں، اور کئے جانے چاہئیں۔۔۔۔ حج کے روحانی اسرار و حقائق کا ادراک تو فرنگی دماغوں کے لئے آسان نہیں، لیکن اس ''بین الاقوامی کانگریس'' سے جو سیاسی ملی، اجتماعی ہر قسم کے فائدے وابستہ ہیں اور اس ''بین الاقوامی سالانہ بازار'' سے جو مالی، تجارتی، معاشی فائدے حاصل ہوسکتے ہیں، ان کا اندازہ اور ان کا اعتراف تو فرنگیوں کی زبان سے بھی بار بار ہوچکا ہے۔

(۲۳۶: ۲)

طلاق اور اسلامی نقطۂ نظر

اسلام سے قبل دنیا میں طلاق سے متعلق عجیب افراط وتفریط قائم تھی۔ افراط یہودیوں کے ہاں تھی، اور تفریط مسیحیوں کے ہاں، یہودیوں کے ہاں نہ کوئی قید طلاق پر عائد تھی، نہ شوہر پر، اس با

میں کوئی ذمہ داری تھی۔اس کا جب جی چاہتا، وجہ، بلاوجہ، بس ایک طلاق نامہ لکھ کر بیوی سے چھٹکارا حاصل کر لیتا، بیوی اسی وقت دوسرا مرد کر سکتی تھی، توریت کے قانون کے الفاظ یہ ہیں:

''اگر کوئی مرد کوئی عورت لے کر اس سے بیاہ کرے، اور بعد اس کے ایسا ہو کہ وہ اس کی نگاہ میں عزیز نہ ہو، اس سبب سے کہ اس نے اس میں کوئی پلید بات پائی، تو وہ اس کا طلاق نامہ لکھ کے اس کے ہاتھ میں دے دے، اور اسے اپنے گھر سے باہر کر دے۔اور جب وہ اس گھر سے نکل گئی تو جا کے دوسرے مرد کی ہووے (استثناء۲۴: ۱، ۲)

اس آزادی اور بے قیدی کے مقابلہ میں مسیحیوں نے یہ سختی اور تنگی اختیار کی کہ زن وشو میں علحدگی کی کوئی گنجائش ہی نہ رکھی۔انجیل کے موجودہ الفاظ ہیں:

''میں نہیں بلکہ خداوند حکم دیتا ہے کہ بیوی شوہر سے علحدہ نہ ہو'' (۱۔کرنتھیون ۷: ۱۰)

یہ حال ان قوموں کا تھا جو اہل کتاب تھیں، یعنی اصلاً ان کے قانون کی بنیاد آسمانی کتابوں ہی پر تھی۔رہیں قدیم جاہلی اور مشرک ''مہذب'' ''ترقی یافتہ'' قومیں سو ایک طرف یونانیوں میں، ہندوؤں میں، اور ایک عہدِ خاص تک رومیوں میں طلاق سے کوئی واقف ہی نہ تھا، بلکہ ہندو مذہب میں تو آج تک طلاق ناجائز چلی آرہی ہے، گو حالات سے مجبور ہو کر اس کے جائز کرانے کے آج بڑے بڑے زور ہند کی پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں لگ رہے ہیں ۔۔۔۔دوسری طرف رومیوں میں عہدِ جمہوریت کے خاتمہ پر طلاق کے جائز ہونے کے ساتھ ہی اس کا جو زور بندھا تو گویا اشراقیت اور طلاق لازم وملزوم ہو گئے!

دنیا کے دوسرے بڑے بڑے مذہبوں اور بڑی بڑی ''مہذب'' قوموں کی یہ بے اعتدالیاں اور افراتفریاں پیش نظر رہیں، جب جا کر شریعت اسلام کی حکمتوں اور اس کے پیدا کئے ہوئے توازن واعتدال کی قدر ہوگی، اسلام نے فطرت بشری کا بالکل صحیح اندازہ کر کے یہ حکم دیا کہ جب زوجین میں ناموافقت لاعلاج حد تک پہونچ جائے (اور اس ناموافقت کے اسباب کا احاطہ واستقصاء ممکن ہی نہیں ہر شخص کے لئے الگ الگ سبب ومحرک ہوتا ہے) اور دوسری صورتیں موافقت پیدا کرنے کی ناکام ہو لیں، تو آخری علاج یہ ہے کہ فریقین ہنسی خوشی اور باضابطہ معاہدۂ نکاح کو فسخ کر کے ایک دوسرے

سے مستقل علحدگی اختیار کرلیں، اور اسی کا اصطلاحی نام طلاق ہے۔

(۸۴۳: ۲)

طاعون اور اسلامی تعلیم

جس سرزمین پر طاعون ہو، وہاں سے بھاگو نہیں، اور جہاں ہو وہاں جاؤ نہیں، اس پر ایک عقلی اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ طاعون زدہ مقام میں داخل ہونا اور طاعون زدہ مقام سے نہ ہٹنا، یہ دونوں عملاً متضاد ہدایتیں ہوئیں، اگر طاعون بچنے کی چیز ہے تو وہاں سے ہٹنے کا بھی حکم ملنا چاہیے، اور اگر بچنے کی چیز نہیں، تو اس شہر میں پہونچ جانے میں کوئی مضائقہ نہ ہونا چاہیے!

اصل یہ ہے کہ وبا زدہ مقام سے بھاگنے اور ہٹنے کے معنی یہ ہیں کہ اگر ایک کو اجازت ملی تو سب ہی بھاگنا شروع کردیں گے، اور شہر خالی ہوجائے گا، اس بے تحاشا بھگدڑ سے آبادی کو جن مالی، معاشی، تمدنی، اخلاقی نقصانات سے دوچار ہونا پڑے گا وہ بالکل ظاہر ہیں، اور بہ کثرت تجربہ ومشاہدہ میں بھی آچکے ہیں۔ پھر ایک طرف یہ عادت اگر ہمت، ثباتِ قلب، شجاعت اور باہمی ہمدردی کے منفی ہے تو دوسری طرف اسبابِ ظاہری پر ضرورت سے زیادہ تکیہ واعتماد کی دلیل، اور توکل، اعتماد علی اللہ کے منافی۔ اور ایک مذہبی قوم کے بالکل غیر شایان ہے، لیکن جہاں وبا ہے اور موت کا بازار ادھڑ گرم ہے، وہاں بے دھڑک داخل ہوجانا اور احتیاط نہ برتنا، ایک طرف سلسلۂ اسبابِ ظاہری کو بالکل نظر انداز کردینا ہے، اور دوسری طرف انسان میں جو درجۂ خوف واندیشہ طبعی کا رکھ دیا گیا ہے اس کے مقتضے کو پامال کرنا ہے۔ ان متضاد پہلوؤں کی رعایت رکھ کر یہ معتدل اور عادلانہ حکم دیا کہ جہاں طاعون ہو وہاں نہ خواہ مخواہ جاؤ نہ خواہ مخواہ وہاں سے نکل بھاگو۔

(۹۲۱: ۲)

سود اسلام کی نظر میں

اسلام کے جو احسانات دنیا پر اور بہت روشن ونمایاں حیثیت سے ہیں اُن میں سے ایک

حرمتِ سود ہے، اس کے مفاسد روشن سب پر ہو چکے تھے، اس سے عاجز سب ہی آ چکے تھے، لیکن قطعی اور کلی صورت میں حرام اُسے دنیا کے ضابطوں اور شریعتوں میں صرف اسلام ہی نے قرار دیا، سود خوار کے دل میں شقاوت وسنگدلی اور حرصِ مال، اور بلا مشقت مال آ جانے سے نفس میں دنائت اور زر پرستی، اور ساہوکاروں کا بخل، اور باہمی حسد ورقابت، اور قرضدار بے چارہ کی بے حرمتی وتذلیل، یہ واقعات ومشاہدات کہنا چاہیے کہ پیش پا افتادہ تھے، لیکن اس کی قطعی بندش کا خیال کبھی کسی انسانی دماغ کو نہ آیا، اصلاحِ حال کی جو کوششیں زیادہ سے زیادہ ہوئیں وہ بس شرحِ سود کی تحدید تک رہیں، یونان میں سولن، انگلستان میں بیکن، اور یورپ میں آبائے کلیسا کے جوشِ اصلاح وافادۂ خلق کی کائنات کُل اسی قدر رہے، یہ فخر قیامت تک کے لئے عرب کے اُمّیؐ کے ساتھ مخصوص ہو گیا کہ اس انسانیت کش رسم کی حرمت کی منادی اس کی زبان سے کرائی گئی اور حرّم الربوٰ اکا زلزلہ افگن نعرہ اس کے دہن سے بلند کرایا گیا۔

(۱۰۷۲:۲)

نکاح

نکاح اسلام کی نظر میں کوئی ضمنی اور ثانوی حیثیت کی چیز نہیں، ایک اہم اور زبردست اخلاقی، اجتماعی، روحانی ادارہ ہے، اس کے منافع ومصالح فرد کے لئے، خاندان کے لئے، معاشرہ کے لئے بے شمار ہیں، اور اسی رعایت سے نکاح یا شادی کے لئے اردو میں بھی دوسرا لفظ ''خانہ آبادی'' کا ہے اجڑے ہوئے سنسان اور ویران گھر گھرانے اسی کے ذریعہ سے آباد ہوتے ہیں، مرد وزن کے باہمی تعلق کو اسلام نے صرف اسی صورت میں جائز رکھا ہے کہ زوجین کا اس سے اصل مقصود ایک خاندان کی بنیاد رکھنا، ایک مستقل معاشرہ قائم کرنا ہو، اپنے کو مہذب ومتمدن کہلانے والی لیکن حقیقۃً جاہلی قوموں میں اس صورتِ مناکحت کے علاوہ دو اور صورتیں مرد وزن کے تعلق کی پہلے بھی جاری رہی ہیں، اور اب بھی جاری ہیں۔۔۔۔ایک شکل تو کھلم کھلا بدکاری کی ہے، عورت زنا کے لئے آزاد رہے، اس کو باقاعدہ اپنا پیشہ بنالے، نہ سوسائٹی اسے اس سے روک سکے، نہ حکومت، جو

مرد جب چاہے، اس کے ہاں ایک خاص کرایہ دے کر اپنے جسم کا پانی بہا آئے، اور منہ کالا کر کے چلا آئے۔ دوسری صورت چوری چھپے آشنائی کی ہے یعنی عصمت کے معنی ہی مٹ جائیں اور شریف و بیسوا میں کوئی فرق نہ رہ جائے۔

اسلام نے ان دونوں مہذب جرموں کو ایک لعنت قرار دیا اور جائز صورت مرد و عورت کے جنسی شہوانی تعلق کی صرف نکاح بتائی۔ نکاح چوری چھپے نہیں، اعلان کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس میں خدا کا نام درمیان میں لا کر، خالق کائنات کا واسطہ ڈال کر، مرد عورت کی آسائش کا ذمہ لیتا ہے، اور عورت مرد کی خدمت کی ذمہ داریوں کو قبول کر لیتی ہے۔ دو اجنبی خاندان ملتے ہیں۔ سسرالیں قائم ہوتی ہیں، سسرالی عزیزوں کا ایک طویل سلسلہ وجود میں آتا ہے، میاں بیوی پر ایک دوسرے کے حقوق قائم ہوتے ہیں، فرائض عائد ہوتے ہیں، دونوں اپنے کو مستقبل کے نباہ کے لئے ہر دور، مال و اقبال کے ہر اتار چڑھاؤ، صحت و علالت کے ہر امکان کے لئے تیار کرتے ہیں اور یہ معاہدہ گواہوں کی موجودگی میں بزرگوں اور خوردوں کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔

(۵: ۳۳)

تعددِ ازواج

تعددِ ازواج کی اجازت ہرگز کوئی ایسی چیز نہیں کہ جس پر کسی مسلمان کو شرمانے اور اس کی طرح طرح کی تاویلیں کرنے کی ضرورت محسوس ہو، مرد کے قوی اور اس کی جسمانی ساخت و ترکیب ہی اس نوعیت کی ہے کہ یہ کثرت مردوں میں ایک بیوی کی طبعی خواہش کی تشفی کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ مرد و عورت کے اتحاد و تناسل کا جہاں تک تعلق ہے مرد کا عمل چند منٹ کے اندر ختم ہو جاتا ہے، اور اس کے بعد مرد پر جسمانی حیثیت سے کوئی ذمہ داری نہیں رہ جاتی، برخلاف اس کے عورت کے لئے اس دو منٹی عمل کے نتائج کا سلسلہ دنوں اور ہفتوں نہیں، حمل اور رضاعت کی مدت ملا کر ڈھائی سال، بلکہ اس سے بھی آگے تک پھیلا ہوا رہتا ہے، پھر زمانہ حمل کے علاوہ بھی ہر جوان تندرست عورت

کے لئے ہر مہینے ایک ایک ہفتہ کی معذوری ایک امرِ طبعی ہے، اور وہ قانونی نظام کامل نہیں، ناقص ہے جو مرد کی طبعی ضرورتوں کی طرف سے آنکھ بند کرلے اور عورت کی طبعی معذوری کا لحاظ کر کے مرد کے لئے کوئی سہولت جائز نہ رکھے۔

پھر یورپ کے بڑے بڑے ڈاکٹروں اور ماہرینِ حیاتیات کی شہادتیں اس عام تجربے اور مشاہدے کی تائید میں ہیں کہ نفس خواہشِ جنسی سے قطع نظر مرد کی شہوانی جبلت تنوع پسند بھی ہے، اس لئے جو شریعت مرد کی اس جبلت کی کوئی رعایت اپنے نظام میں نہیں رکھتی وہ اور کچھ بھی ہو، بہرحال خدائی اور مطابقِ فطرت نہیں کہی جاسکتی، یہی سبب ہے کہ تاریخ جب سے پتا دیتی ہے، داعیانِ توحید و پیمبرانِ حق نے اس دستور کو نہ صرف جائز رکھا ہے بلکہ اس پر عمل کر کے اسے اور زیادہ قوت پہنچادی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ میں سے کسی کے یہاں بھی یک زوجی روایت کی سند نہیں ملتی، بلکہ بعض کی حرم سرا تو مشہور ہی کثرتِ تعدد کے لئے ہے، ہند قدیم میں اکابرِ ہنود کی بابت بھی زوجی روایتیں وحدت کی نہیں تعدد ہی کی ہیں، اور یورپ و امریکہ میں آج عقدِ نکاح کو درمیان میں لائے بغیر جو شہوانی اندھیر کھلے بندوں ہو رہا ہے، اس کی نقل و حرکت کی بھی تاب ان صفحات میں نہیں ۔۔۔۔ اسلام نے ایک طرف یک زوجی کی قید اڑا کر تعدد کو سندِ جواز دے دی، اور دوسری طرف اس کی مناسبت سے حد بندیاں بھی کئی کئی طرح کر دیں اور یہی اس کی حکمت کا کمال ہے۔

(۱۰:۴)

اسلام کی عالمگیری

دنیا جن مذہبوں کو جانتی پہچانتی ہے، ان میں کثرت سے تو مذاہب شرکیہ ہی ہیں۔ مثلاً ہندو مذہب، بودھ مذہب، مجوسی مذہب، عیسائی مذہب، اور شرک نام خود محدودیت و تنگ نظری کا ہے۔ مشرک کے مطمحِ نظر میں ہمہ گیر وسعت پیدا ہی نہیں ہوسکتی۔ مذاہبِ توحید لے دے کے صرف دو ہیں۔ ایک یہودیت دوسرے اسلام یہودیت کا غیر طبعی ہونا اور نسلِ اسرائیل تک محدود رہنا بالکل ظاہر ہے۔

اس کے بعد صرف اسلام ہی ایسا دین باقی رہ جاتا ہے جس کی دعوت کسی ملک، قوم ونسل وقبیلہ کے ساتھ محدود نہیں. اس کا خطاب دنیا کے ہر فردِ بشر سے ہے. اس کی تعلیم چھوٹے بڑے ہر انسان کے لئے ہے پھر اس عالمگیری کے ساتھ ہمہ گیری تعلیم اسلام کی ہے. یعنی زندگی کا کوئی شعبہ چھوٹے سے چھوٹا بھی اس کے دائرہ سے باہر نہیں۔

(۱۳۴:۲۳)

معجزہ

معجزات یا خوارق پر کوئی عقلی اعتراض اگر کسی ملحد کی طرف سے ہو تو خیر، اس کے لئے تو کچھ گنجائش بھی ہے، لیکن خدا کے ماننے والے کی طرف سے یہ ''عقلی اعتراض'' یا اس کے امکان میں گفتگو بالکل بے معنی ہے، جب معجزہ کا فاعل خدا تعالیٰ ہے تو وہ قادرِ مطلق جس طرح اپنی عادات یا معمول عام کے اجراء وبقا پر قادر ہے ٹھیک اسی طرح اور بعینہٖ اسی درجہ میں اس کے ترک وخرق پر بھی! اس کے نزدیک تو یہ اور وہ، ایسا اور ویسا، دونوں بالکل یکساں ومساوی ہیں، بلکہ اس ہستی مطلق کے لئے یہ ''عادت'' و ''خلافِ عادت'' کے معنی ہی کیا؟ یہ موافق عادت وخارقِ عادت کی اصطلاحیں تو محض بندوں کے علم کے لحاظ سے ہیں، یہ تو ہم نے جس چیز کا بار بار اور متواتر مشاہدہ کیا اُسے عادتِ الٰہی میں داخل کر دیا، اور جس چیز کو ایسا نہ پایا اُسے خلافِ عادت اور خارقِ عادت سے تعبیر کرنے لگے۔۔۔۔ لفظ ''معجزہ'' تو خود ہمارے جہل کا پردہ پوش ہے، حق تعالیٰ کے لئے کون سی چیز معجز ہو سکتی ہے؟ غرض کوئی مذہبی شخص کسی بڑے سے بڑے معجزے کے نفسِ امکان میں تو زبان کھول ہی نہیں سکتا، گفتگو جو کچھ بھی چلے گی رُویت ورولیتِ معتبر کے لحاظ سے چلے گی، اور یہ بحث ظاہر ہے تمام تر نقلی اور تاریخی ہوگی نہ کہ عقلی، وقوعِ معجزہ کے راوی اگر معتبر اور شاہد عینی ہیں تو وہ خارقِ عادت بھی ہمارے لئے ایسا ہی قابلِ یقین ہوگا جیسا کہ روزمرہ کے عام واقعات ہوتے ہیں، کہ آگے کوئی گفتگو چل ہی نہیں سکتی کس وقت کس خارقِ عادت کے ظہور کی کیا کیا حکمتیں اور مصلحتیں ہوتی ہیں یہ حال بجز حکیم مطلق کے اور کون جان سکتا ہے؟

(۱۰۱: ۲)

نسخ

نسخ سے مراد کسی نے آج تک یہ تو لی نہیں کہ فلاں عقیدہ کسی زمانہ میں واجب تھا، اور اب وہ منافیٔ ایمان قرار پا گیا۔ یا جھوٹ، چوری، زنا قتل پہلے حرام تھے، پھر حلال قرار پا گئے، یا فلاں حکایت پہلے جس طرح قرآن میں بیان ہوئی تھی، بعد کو اس کی تردید ہوگئی، غرض نسخ کی گنجائش کا عقائد میں، کلیاتِ اخلاق میں، اُمورِ حسی میں، قصصِ گذشتہ اور حکایاتِ ماضی میں، اخبارِ غیب میں غرض قرآن مجید کے بیشتر حصہ میں کوئی بھی قائل نہیں، نسخ کی گنجائش جو کچھ بھی ہے لے دے کے بس بابِ احکام میں ہے اور احکام کی مثال طبیب کے نسخہ کی ہے، طبیب کی تشخیص اپنی جگہ پر بدستور رہتی ہے لیکن مریض کی حالت بدلتی رہتی ہے اور پھر موسم اور آب وہوا میں بھی فرق ہوتے رہتے ہیں، ان حالات میں کوئی حاذق سے حاذق طبیب بھی اپنے نسخہ کے اجزاء میں ان بدلے ہوئے حالات کے مطابق ترمیم کرنے میں تأمل نہ کرے گا۔ قرآن کے بعض احکام قانون کے نسخ کے معنٰی صرف اس قدر ہیں کہ خود قانون ساز وقانون آفریں کے قلم سے عین وضع قانون کے دوران میں بعض قانون جو عارضی اور ہنگامی حیثیت رکھتے ہیں، بدل دیئے گئے اور ان کی جگہ مستقل ودوامی قوانین نے لے لی، انسان کے دانت اور جبڑے مستقل طور پر غذاؤں کے چبانے، کاٹنے اور پھاڑنے ہی کے کام کے لئے ہیں، لیکن ابتدائی شیر خوارگی میں دانت نکلنے سے قبل دوسری قسم کی شربی ونیم شُربی غذائیں ہی اس کے لئے موزوں ہیں۔

(۲۷۹:۲)

قانونِ قصاص

قانونِ قصاص عین عدل ومساوات کا قانون ہے، اور ہیئتِ اجتماعی کے نظم وقیامِ ریاست کا بہترین ضامن وکفیل، کہ کوئی کسی پر زیادتی نہ کرنے پائے اور قوی وضعیف سب کے حقوق کا تحفظ

ہو جائے، یہ نہ ہو کہ جو زبردست ہوں وہ زیردستوں پر ستم ڈھاڈھا کر رہیں. امت کے مختلف طبقوں میں ایک دوسرے کی طرف سے اطمنان ودلجمعی پیدا کرنے والا درحقیقت یہی قانون ہے، اور جب اس قانون پر عملدرآمد ایک عرصہ تک رہے گا، اس قانون کی روح امت میں سرایت کر جائے گی تو ساری قوم کا مزاج صالح ہو جائے گا اور آئین پسندی، باہم صلح وسازگاری، خدمت ومعاونت جزوزندگی بن جائے گی، اور امت دیکھتے ہی دیکھتے اُمتِ صالحین وابرار، اُمتِ عادلہ کہلانے کی مصداق ہو جائے گی۔

(۶۴۲: ۲)

موالاتِ کفار

قانون اسلام کے منکروں اور باغیوں سے تعلقات ایک خاص حد سے آگے بڑھانے کی اجازت کسی مسلم اسلامی اسٹیٹ کی رعایا کو نہیں کہ اس سے فرد اور ملت دونوں کو ضرر کے اندیشے اور خطرے کھلے ہوئے ہیں، اور اس صریحی، معقول، مناسب اور ضروری انتظام کا نام بعض عقل کے دشمنوں نے ''تنگ نظری'' رکھا ہے۔۔۔۔ سبحان اللہ! امراضِ وبائی میں پرہیز واحتیاط کا نام تو فخر کے ساتھ ''اصول حفظان صحت'' رکھا جائے اور جو انتظام کفر وطغیان یعنی دنیا وآخرت دونوں کی بربادی سے بچنے کے لئے کیا جائے، اس کا نام ''تنگ نظری'' پڑ جائے، عقل دشمنی کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے!

کافروں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تین ہی ممکن صورتیں ہیں:۔

(۱) موالات یا دوستی (۲) مدارات یا ظاہری خوش خلقی وخاطر داری (۳) مواسات یا احسان ونفع رسانی. علمائے شریعت کی تحقیق ہے کہ شقِ اول یعنی موالات یا حقیقی دوستی تو کسی حال میں جائز نہیں، شقِ سوم بھی اختلافی نہیں، مواسات صرف اہلِ حرب کے ساتھ ناجائز ہے، باقی کے ساتھ جائز. رہی شقِ دوم، سو وہ تفصیل طلب ہے. مدارات تین حالتوں میں درست ہے. ایک اپنے رفعِ ضرر کے لئے، دوسرے خود اس کافر کی مصلحتِ دینی ہو یعنی توقع ہدایت کے موقع پر، تیسرے اکرام ضیف کے طور پر

یعنی کافر جب مہمان ہو اس وقت کے لئے، ان تین صورتوں کے سوا اپنے نفع یا حصولِ مال وجاہ کے لئے مدارات درست نہیں، اور جب اس سے ضررِ دین کا اندیشہ ہو تو یہ اختلاط بدرجۂ اولیٰ ناجائز ہوگا۔

(۳۴۲،۷۰:۳)

اسیرانِ جنگ

اسیرانِ جنگ کا معاملہ ہمیشہ ایک اہم اور دشوار معاملہ رہا ہے، یعنی یہ کہ جو مرد اور عورتیں شکست خوردہ غنیم کے یہاں سے گرفتار ہو کر آئیں، ان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے، انھیں کہاں اور کیسے رکھا جائے؟ کسی نے اس کا حل جبری مزدوری Forced Labour یا بیگار کو نکالا، کسی نے کچھ اور، ہماری شریعت نے صاف، سہل اور سادہ حکم یہ دیا کہ بجائے اس کے کہ ایک بڑی آبادی کا بار حکومت State پر ڈالا جائے، اس تعداد کو افراد میں تقسیم کر دیا جائے اور ہر ایک فرد اس نو وارد کو اپنے خاندان کا ایک جزو بنالے اس سے کام کاج یقیناً لے، لیکن اس کے آرام کا بھی ہر طرح لحاظ رکھے اور ان میں جو عورتیں ہوں، ان سے ہم بستری کا حق بھی حاصل رہے، اس کا قیدی ہو کر آنا یہ خود اعلانِ نکاح کا قائم مقام ہے اور جس کے ہوتے ہوئے کسی مزید ایجاب وقبول اور شاہدین کی ضرورت نہیں، پھر یہ لوگ آسان شرائط پر اپنی آزادی ہر وقت خرید سکتے ہیں (شرائط کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں ملے گی) بلکہ ان کے آزاد کرنے کی فضیلتیں اور اس کے لئے طرح طرح کی ترغیبات خود قرآن مجید میں درج ہیں اور حدیث میں تو اور زائد ہیں ۔۔۔۔ حیرت یہ ہے کہ ایسے صاف،، سیدھے، شریفانہ، حکیمانہ قانون سے شرمانے اور اسے غیروں سے چھپانے کی ضرورت بعض تجدد زدہ مسلمان بھی محسوس کرنے لگے ہیں اس کی نفسیاتی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کا ذہن معاً انگریزی کے لفظ Slave اور ان ساری سختیوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، جو اس لفظ کے تخیل کے ساتھ بجا طور پر وابستہ ہے، حالاں کہ ہمارے یہاں تو غلام زادوں نے بار بار بادشاہتیں تک کی ہیں، اور امراء تو ان میں کثرت سے ہوئے ہیں یہ تو دنیوی حیثیت ہوئی، باقی دینی حیثیت سے بڑے بڑے علماء، فقہاء، وائمۂ فن اُن ہی غلاموں اور غلام زادوں میں تابعین ہی کے زمانہ سے پیدا ہونے لگے تھے۔

(۱۴:۴)

مسئلۂ تقسیمِ وراثت

دنیا کی بہت سی مذہبی اور غیر مذہبی شریعتیں ایسی ہیں جن میں لڑکی کا سرے سے کوئی حصہ ہی نہیں، اور عرب جاہلیت میں بھی ترکہ کے حصہ دار صرف مرد (اور مردوں میں بھی صرف بالغ اور قابل حرب مرد) تھے، ایسے قانون کا ظالمانہ اور خلافِ فطرت ہونا بالکل ظاہر ہے لیکن اب اس کے ردِّ عمل کے طور پر بعض حلقوں سے جو یہ صدا اٹھی ہے کہ مرد وعورت کا حصہ مساوی ہونا چاہیے، یہ دوسری بے اعتدالی، اور افراط کی جگہ تفریط! عورت کی فطری ساخت اور عضویاتی فرائض نے اسے قابل ہی نہیں رکھا ہے کہ تولید، رضاعت اور تربیتِ نسل کے ساتھ ساتھ اس پر فکرِ معاش کی ذمہ داریاں بھی ڈال دی جائیں، قدرت نے، اور اس لئے سچی اور صحیح شریعت نے، اس کا ذمہ دار مرد کو ٹھہرایا ہے۔ گھر اور خاندان کا خرچ چلانا اس کے سر رکھا ہے، اس لئے یہ ظلم نہیں، عین عدل ہے کہ ترکہ میں مرد کو حصہ بھی بڑا ملے، پھر ہر شادی شدہ عورت کو میراث کے موقع پر دُہرے حصے حاصل رہتے ہیں، ایک ادھر میکے میں باپ کے ترکہ میں سے حصہ، دوسرا ادھر سسرال میں شوہر کے ترکہ میں سے حصہ، اس طرح صوری اور ظاہری اعتبار سے بھی عورت گھاٹے میں نہیں رہتی۔

(۴ : ۲۸)

صبر معیتِ الٰہی کی کلید

صبر کرنے کے معنی یہ نہیں کہ بندہ بالکل بے حس ہو جائے اور غم کو غم محسوس ہی نہ کرے۔ اس کا نام صبر نہیں ہے، بے حسی ہے۔ صبر یہ ہے کہ انتہائی غمناک و دردانگیز واقعہ پر عقل کو نفس پر غالب رکھے، زبان کو شکوہ اور ناشکری سے نہ آلودہ ہونے دے اور نظر کو مسبب الاسباب پر اُس کی مصلحت وحکمت پر اُس کی شفقت ورحمت پر رکھے ؎

غم میں بھی قانونِ فطرت سے میں کچھ بدظن نہیں
یہ سمجھتا ہوں کہ وہ میرا دوست ہے، دشمن نہیں!

روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ کسی بڑی اور پُرقوت ہستی سے تعلق قائم ہوجانے سے دل کو کتنی تقویت حاصل ہوجاتی ہے، خطرہ کے وقت پولیس کے پہونچ جانے سے، کسی بڑے حاکم کے آجانے سے دل کو کیسی ڈھارس بندھ جاتی ہے، شدید بیماری کے وقت کسی نامور طبیب کے آجانے سے ٹوٹی ہوئی آس کیسی جڑ جاتی ہے، پھر جب دل کا ربط ہمہ بیں و ہمہ داں، ناصرِ حقیقی ومحافظِ حقیقی سے قائم ہوجائے، تو انسان بے بنیان کی تسکین خاطر وتقویتِ قلب کا کیا پوچھنا! دنیا میں رہ کر، زندگی کی کشمکش میں پڑکر، مشکلات ومصائب کا پیش آتے رہنا ناگزیر ہے، افراد کو بھی اور امت وجماعت کو بھی، اور وہ دستورالعمل ناقص ہے، جو مشکلات کے دفاع اور مصائب سے مقابلہ کا طریقہ نہ بتائے۔

(۵۶۵، ۵۷۰ : ۲)

دعا۔ عبدیت کی مُظہر

اسلام زندگی کے ہر ہر شعبہ کے لئے ایک مکمل دستورالعمل ہے۔ وہ انسان کو خدا کی حاکمیت اور اپنی عبدیت کی طرف سے غفلت کی اجازت کسی وقت نہیں دیتا۔ سواری اچھے گھوڑے کی ہو، یا موٹر کی، یا ریل کی، یا جہاز کی۔ انسان جب کبھی اس نعمت سے مستفید ومحظوظ ہوتا ہے تو اکثر اس میں ایک گونہ تفاخر کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے اور اسے وہ اپنے کمال واستحقاق کی جانب منسوب کرکے فخر کرنے لگتا ہے۔ قرآن نے اس کی جڑ کاٹ دی اور ارشاد فرمایا کہ جب سواریوں سے فائدہ اور لطف اٹھاؤ تو پہلے دل میں خدائی نعمتوں کا استحضار کرلو۔ اور یہ خیال تازہ کرلو کہ یہ جو کچھ بھی مل رہا ہے سب عنایت وافضالِ الٰہی سے مل رہا ہے اسی نے تم میں اتنی طاقت، ہمت وتدبیر دے دی ہے اور بہتر یہ ہے کہ زبان سے بھی کہہ ڈالے کہ ہم میں کوئی ذاتی استحقاق اس کا کب تھا۔ ہم ایسے طاقتور، یا ایسے ہنر ور کب تھے کہ ان سواریوں کو قابو میں لے آتے۔ یہ تو محض آپ کا فضل وکرم ہے۔ اور ہم کو عین وقت فرح ومسرت میں اپنا انجام یاد ہے کہ ہم اور ہماری لذتیں فانی ہیں باقی نہیں، ہم سب کو اپنے پروردگار کے حضور میں حساب وجواب کے لئے حاضری دینا ہے۔۔۔۔ جس قوم کے دل میں اپنی عبدیت کا یہ

استحضار اور جس کی زبان پر اس قسم کے کلمات خود شناسی رہیں، کہیں اسے بھی گھمنڈ اور دعوی اپنے ہائیڈروجن بم، اور دوسری ہلاکت بار مشینوں کا ہوسکتا ہے؟

(۸: ۴۳)

توہینِ انبیاء اور قومِ بنی اسرائیل

اسرائیلیوں کے مسلسل تمرد، سرکشی، نافرمانی کے تذکروں سے توریت وانجیل دونوں کے صفحات لبریز ہیں، سب کی نقل کرنے کی نہ گنجائش، نہ ضرورت. مشتے نمونہ از خروارے صرف دو چار نمونے دیکھتے چلیے:-

''انھوں نے خدا کے پیغمبروں کو ٹھٹھے میں اڑا دیا اور اس کی باتوں کو ناچیز جانا اور اس کے نبیوں سے بدسلوکی کی، یہاں تک کہ خدا کا غضب ایسے لوگوں پر ایسا بھڑکا کہ کوئی چارہ نہ رہا'' (۲تواریخ ۳۶:۱۶)

''تمہاری ہر تلوار پھاڑنے والے شیر ببر کی مانند تمہارے نبیوں کو کھا گئی ہے''

(یرمیاہ ۲:۳۰)

''وہ نافرمان نکلے اور تجھ سے پھر گئے اور انھوں نے تیری شریعت کو اپنی پشت کے پیچھے پھینکا اور تیرے نبیوں کو جو نصیحت کرتے تھے کہ انھیں تیری طرف پھرا لائیں، قتل کیا اور انھوں نے کاموں سے تجھے غصہ دلایا'' (نحمیاہ ۹: ۲۶)

یہ مختصر اور بہت ہی مختصر اقتباسات عہدِ قدیم کے نوشتوں سے تھے، اب عہدِ جدید کے نوشتوں سے ایسے ہی مختصر نمونے ملاحظہ ہوں:-

''اے گردن کش اور دل اور کان کے نامختونو!.....نبیوں میں سے کس کو تمہارے باپ دادوں نے نہیں ستایا'' (اعمال ۷:۵۱،۵۲) ''تم اپنی نسبت گواہی دیتے ہو کہ ہم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہیں.....اے یروشلم، اے یروشلم! تو نبیوں کو قتل کرتی ہے اور جو تیرے پاس پہنچ گئے ہیں انھیں سنگسار کرتی

ہے'' (متی ۲۳:۲۹،۳۷۔لوقا ۱۱:۴۷،۵۱)

غرض توہینِ انبیاء اور پیمبر کشی کا الزام یہود پر قرآن مجید نے دنیا میں پہلی بار نہیں لگایا ہے، ان کی فردِ جرم کا یہ عنوان تو قدیم نوشتوں میں موجود چلا ہی آتا ہے، قرآن مجید نے محض (ویقتلون النبیین بغیر الحق کہکر) اس کی تصدیق کردی۔

(۲:۶۱)

توریت کی تحریف

توریت کی تحریف اب کوئی اختلافی یا نزاعی مسئلہ نہیں، دوست دشمن سبھی کو اب تسلیم ہو چکا ہے کہ یہ کلامِ الٰہی نہیں، اور اس کے دوست زیادہ سے زیادہ یہ کہتے ہیں کہ یہ خدا رسیدہ انسانوں کی تصنیف ہے، کسی جامد سے جامد یہودی میں بھی اب یہ ہمت باقی نہیں کہ توریت کو قرآن مجید کی طرح تنزیلِ لفظی قرار دے، اب زیادہ سے زیادہ جو کہا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ خاصانِ خدا نے الہامِ خداوندی سے مشرف ہوکر اسے اپنے طور پر اور اپنی عبارت میں ترتیب وتالیف دیا اور خدائے تعالیٰ کی جانب اس کا انتساب مجازاً یا بالواسطہ ہے، حقیقی اور براہِ راست کے مفہوم میں نہیں پھر وقتاً فوقتاً جو تصحیفات ہوتی رہی ہے، وہ بالفرض کسی مصلحت یا ضرورت ہی سے ہوئی ہوں. بہرحال نفس ان کے وقوع کا اعتراف، کھلے خزانے سب کو ہے. اور بائبل کی تنقیدِ عالیہ (Higher ritcums) ایک مستقل فن کی صورت اختیار کر چکی ہے، جرمن، فرنچ، انگریزی وغیرہ میں چھوٹی بڑی صدہا بلکہ ہزارہا کتابیں اس موضوع پر تیار ہو چکی ہیں، اور مقالات ومضامین کا شمار ہی نہیں۔۔۔۔یورپ اب جا کر چونکا ہے اور یہ فن ابھی پچھلی صدی یعنی انیسوی صدی سے پیدا ہوا ہے، عرب کے امّی کے لائے ہوئے کلام کا اعجاز ہے کہ اس نے تیرہ صدی بیشتر ہی اہلِ کتاب کی ''کتاب'' (جو لفظی ترجمہ ہے بائبل کا) کو تمام تر محرف وناقابلِ اعتماد قرار دے دیا تھا۔

(۲:۷۹)

توحید۔ اسلام اور عیسائیت

''باپ، بیٹا، روح القدس تین جدا جدا اور مستقل اقنوم ہیں'' ''عالم لاہوت میں تینوں کی وحدت ایک ہی خدا ہے، تین نہیں، بیٹا ازل ہی میں باپ سے پیدا ہوا، اور روح القدس کا صدور بھی ازل ہی میں باپ سے ہوا ہے'' ''روح القدس کا صدور اکیلے باپ سے نہیں، بلکہ بیٹے سے بھی ہوا ہے'' ''خدا ہونے میں تینوں اقنوم برابر کے شریک ہیں، ایک ایک پورا، اور باقی دونوں اپنی اپنی جگہ جزوی حصہ دار ہیں'' ''یہاں ترکیب سے وحدت پیدا ہوتی ہے اور وحدت کا نام ہی ترکیب ہے'' ''اُقنومِ وجود باپ ہے، اُقنومِ حیات بیٹا، اور اُقنومِ علم روح القدس ہے''۔

یہ صرف چند عقیدے بہ طور نمونہ مسیحیوں کے ''اسرارِ الٰہیات'' سے پیش کئے گئے ورنہ اسی طرح اور بھی بہت سے ہیں، قرآن مجید کہتا ہے کہ ایک طرف میرے صاف، سادہ اور ہر شخص کی سمجھ میں آجانے والے بیانِ توحید کو دیکھو اور دوسری طرف الفاظ و اصطلاحات کے اس گورکھ دھندے پر نظر کرو! امام رازیؒ نے سچ کہا جب یہ کہا کہ اس سے بڑھ کر مہمل و نامعقول عقیدے دنیا کے پردہ پر کسے کے نہ ہوں گے۔

(۲۵۶:۵)

دنیا کی بے ثباتی

دنیا کی بے ثباتی کو مثال کی صورت میں (قرآن نے) یوں پیش کیا ہے کہ جیسے آسمان سے خوب زور شور کی بارش ہو، ہر قسم کے نباتات کی روئیدگی خوب ہو، آدمی کے کھانے کے قابل پھل پھلاری، میوہ، غلّہ اور جانوروں کے کھانے کے قابل پتیاں، بھوسہ وغیرہ کی خوب پیداوار ہو۔ پھر جب ہر طرف خوب سرسبزی و شادابی پھیل جائے، لہلہاتے کھیت، سرسبز درخت، شاداب باغ ہر طرف

پورے زیب وزینت کے ساتھ نظر آنے لگیں اور انسان سمجھنے لگے کہ بس ہم ان تمام لذتوں اور نعمتوں سے لطف اٹھانے کے پوری طرح مالک ومختار ہیں، کہ یک بیک حکمِ الٰہی سے کوئی ایسا آسمانی یا زمینی حادثہ پیش آجائے کہ سارا گل وگلزار تہس نہس ہوکر رہ جائے اور حالت یہ ہوجائے کہ گویا کل تک یہاں کچھ تھا ہی نہیں! یہ مرقع ہے انسانی زندگی کا کہ بڑے سے بڑے نامور وبااقبال انسان کا بھی خاتمہ دفعۃً موت پر ہوکر رہ جاتا ہے! اور یہ حال ہے دنیا کا جس میں غافل انسان ہمہ تن مصروف ہے۔

(۴۲:۱۰)

رواداری

آج کے دورِ دجل وتلبیس میں لفظ ''رواداری'' جس معنٰی میں چلا ہوا ہے، اسلام اس کا ہرگز قائل نہیں۔ دوستانِ حق سے وہ اُسی برتاؤ کا حکم دیتا ہے جس کے وہ مستحق ہیں اسی طرح دشمنانِ حق سے بھی اسی سلوک کا جس کے وہ لائق ہیں۔ انسان مرغیوں اور بکریوں کو اپنے پاس سے کھلا کھلا کر پالتا ہے اور محنت اٹھا اٹھا کر انہیں زندہ رکھتا اور بڑھاتا ہے اور سانپوں، بچھوؤں کو بلا تأمل مار ڈالتا ہے، عقل کی تعلیم یہ ہرگز نہیں کہ جانور جانور سب برابر ہیں اور یکساں ''رواداری'' سے سب کے ساتھ پیش آنا چاہیے۔

(۱۳۷:۹)

فصل دوم

قصصِ قرآن

جنگِ بدر

رسول اللہ ﷺ کو مکّہ چھوڑ کر مدینہ ہجرت کئے ہوئے یعنی وطن کو چھوڑ کر بحکمِ الٰہی جلاوطن ہوئے دوسرا سال ہو چکا تھا مگر مکّہ کے مشرکوں کی ایذا رسانیوں کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا کہ اتنے میں خبر ملی کہ ان موذی دشمنوں کا قافلہ پچاس ہزار اشرفیوں کے مالِ تجارت سے لدا پھندا ایک مشہور مکّی لیڈر ابوسفیان کی قیادت و رہنمائی میں شام سے مکہ کو واپس ہو رہا ہے اور مدینہ کے قریب سے گزرے گا۔ رسول اللہ ﷺ کے رفیق اور صحابی برسوں سے ان کے مظالم کے ہدف بنے ہوئے تھے۔ قدرۃً خیال گزرا کہ اچھا موقع ہے، دشمن کی اس شہ رگ کو کاٹ دینا چاہیے۔ آپؐ تین سو تیرہ رفیقوں کے ہمراہ روانہ ہو گئے، نہ یہ کوئی باضابطہ فوج تھی اور نہ فوجی سامان وسلاح سے آراستہ، اس وقت آپؐ نے اپنی بے مثال تنظیمی قابلیت کی بنا پر اتنے ہی لوگوں کو فوجی دستوں کی صورت میں مرتب کر لیا تھا۔ ساتھ میں کل ستر اونٹ اور دو گھوڑے تھے۔ اِدھر یہ ہو رہا تھا۔ اُدھر یہ خبر قافلہ والوں کو بھی لگ گئی، انہوں نے فوراً اپنے آدمی فوجی کمک کے لئے مکہ کو دوڑائے اور خود بالا بالا راستہ کترا کر سمندر کے کنارہ کنارہ نکل آئے۔ جمہور یہ مکہ کا رئیس ابوجہل اپنی ماتحتی میں چھوٹے چھوٹے رؤساء اور عام مسلح سپاہی ۹۵۰ کی تعداد میں لے کر جوش وخروش کے ساتھ مدینہ والوں پر جھپٹا، اور بدر کی منزل پر آ کر دم لیا جو مدینہ سے صرف ۲۰ میل کے فاصلہ پر اور اس کے جنوب ومغرب میں واقع ہے۔ یہ واقعہ رمضان ۲ھ، مارچ ۶۲۴ء کا ہے۔ اِدھر رسولؐ پر وحی آئی کہ قافلہ یا لشکر دونوں میں سے ایک پر آپ کی فتح یقینی ہے لیکن صحابہ تو بہرحال صاحبِ وحی نہیں تھے۔ انہوں نے تو یہ دیکھا کہ اب مقابلہ آ پڑا ہے، تجارتی قافلہ سے یا

فوج کے سامانِ رسد سے نہیں، بلکہ خود لشکرِ جرار سے اور لشکر بھی کیسا، اپنے سے تعداد اور سامان دونوں میں کئی گنا زائد! قدرۃً ایک گروہ کو تذبذب، تأمل، تردد پیدا ہوا، رسول اللہ ﷺ کو اس کم ہمتی پر تأسف ہوا لیکن خود صحابہ ہی کے گروہ میں سے مہاجرین میں، ابوبکرؓ و عمرؓ اور انصار میں، سعد بن معاذؓ رئیسِ اوس نے جوشِ اطاعت سے لبریز تقریریں کیں جب آپؐ بدر کی طرف روانہ ہوئے ۔۔۔۔ سپہدارِ اعظمؐ نے حالتِ جہاد میں ایک مٹھی بھر کنکریاں یا مٹی اٹھا کر مشرکوں کے لشکر کی طرف پھینکیں. ریزے ان کی آنکھوں میں جا کر گھس گئے اور انہیں شکست ہوئی۔

(۲۶،۱۰:۸)

جنگِ احد

احد، مدینہ منورہ سے شمال کی جانب ڈھائی تین میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑی ہے، بدر میں شکست کھائے ہوئے مشرکینِ مکہ جوشِ انتقام سے دیوانے ہو رہے تھے. ہجرت کا تیسرا سال قریب ختم کے تھا اور واقعۂ بدر پر ایک سال گزر چکا تھا، کہ مکہ والوں کی تیاریاں مکمل ہو گئیں، اب کی تیاریاں بڑے انتظام و اہتمام کے ساتھ اور بہت بڑے پیمانے پر ہوئیں تھیں، قریش کی جمعیت ۳ ہزار کی تھی، اُن میں ۷۰۰ جوان زرہ پوش تھے، ۲۰۰ سوار اور باقی شتر سوار تھے. قوم اور قبیلہ کے بڑے بڑے سردار سب ساتھ ہوئے بڑی بات یہ ہے کہ عورتیں بھی شریکِ جنگ ہوئیں، ہاتھوں میں باجے لیے ہوئے، پُر جوش ترانے گاتی جاتی تھیں اور مقتولینِ بدر کے انتقام پر اپنے عزیزوں، قریبوں کو ابھارتی تھیں. اسلامی فوج اس کے مقابلہ میں کل ایک ہزار تھی، اور سامان کی کیفیت یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی سواریٔ مبارک کے فوج بھر میں صرف ایک گھوڑا اور تھا، اس سے بڑھ کر ستم یہ ہوا کہ صبح سویرے عین اس وقت جب غنیم سامنے نظر آیا اور مسلمان اپنے مقدس امیر الجیش کے ساتھ ابھی نماز ہی میں مشغول تھے، عبداللہ بن ابی مدینہ کا پرانا اور ذی اثر لیڈر یہ عذر کر کے کہ جب ہماری رائے نہیں سنی جاتی اور شہر کے اندر محصور ہو کر نہیں لڑا جاتا تو ہم بیکار اپنی جانیں دوسروں کے کہنے پر کیوں دیں، اپنے ۳۰۰ ساتھیوں کو لے کر شہر کو واپس چلا گیا، اور اب لشکرِ اسلام کی کُل جمعیت ۷۰۰ کی رہ گئی، ان

میں زرہ پوش کُل ۱۰۰، مقابل فوج تعداد میں چوگنی سے زائد، اور ساز وسامان کے لحاظ سے بھی کہیں زیادہ آراستہ!

جنگ شروع ہونے سے قبل مسلمانوں کے مقدس اور نہایت درجہ بالغ نظر سپہ سالارِ لشکر نے امکانات نقشۂ جنگ کا بالکل صحیح اندازہ کر کے ایک گھاٹی میں ایک بلند ٹیکری پر ۵۰ چیدہ وماہر تیراندازوں کا ایک دستہ متعین کر دیا تھا اور احکام دے دیئے تھے کہ اس مورچہ سے کسی حال میں نہ ٹلنا، یہاں تک کہ اگر ہماری اصل فوج شکست کھا جائے جب بھی اس کی مدد کے لئے نہ جھپٹنا، بلکہ اپنے عقب کا خیال رکھنا۔

جنگ شروع ہوئی، اور مسلمانوں نے پورے جوش شجاعت کے ساتھ یلغار کی، مشرکین کا لشکر بہ ایں فراوانی وبہ ایں سروسامانی اس زبردست ٹکر کی تاب نہ لا سکا اور اس کے قدم اکھڑ گئے، مسلمان اور آگے بڑھے اور بدر کا جوش وخروش تازہ ہو گیا، لیکن افراطِ جوش میں توازن قائم نہ رہا۔ ان کا خط ٹوٹ گیا اور صفوف میں ترتیب باقی نہ رہی اور انہیں کی ایک جماعت نے مزید پیش قدمی کر کے غنیم کے خیمے ڈیرے لوٹنے شروع کر دیئے اُدھر ٹیکوی والے تیرانداز دستے نے جو یہ دیکھا کہ دشمن میدان چھوڑ چکا ہے اور مالِ غنیمت لٹنا شروع ہو گیا ہے، تو یہ سوچا کہ اب یہاں مورچہ پر جمے رہنے کے کوئی معنٰی نہیں، حکم جس وقت تک کے قیام کے لیے تھا، اس کی تعمیل ہو چکی، چنانچہ اس خیال کے ماتحت ۵۰ میں ۴۰ تیرانداز سپاہی اپنی پوزیشن چھوڑ نیچے میدان میں دوسروں کے ساتھ غنیمت کی تاخت میں شریک ہو گئے۔ خالد بن ولید جو بعد کو ایمان لے آئے اور سیف اللہ کہلا کر مسلمانوں کے مشہور جنرل ہوئے اس وقت تک مشرکوں کے رسالے کے سردار تھے، ان کی دور بین نگاہ موقع کے گھات ہی میں تھی اپنے سواروں کے ساتھ کاوا کاٹ، اسی دُرّہ کی طرف سے ہلّہ بول دیا، گنتی کے دس سپاہی کتنی دیر ٹھہر سکتے تھے، جنگ کا پانسا آناً فاناً پلٹ گیا اور فتح مسلمانوں کے ہاتھ آ کر چھن گئی۔

(۳: ۱۲۵، ۱۲۶)

غزوۂ خندق

شوال ۵ھ کا واقعہ ہے کہ اسلام کے مخالفین نے ایکا کر کے مدینہ پر دھاوا بول دیا، اور شہر کو ہر طرف سے گھیر لیا۔ تاریخ میں اس جنگ کا نام جنگِ احزاب ہے، ۴ ہزار کی تعداد میں قریش ہی کا لشکر تھا جس میں ۳۰۰ سوار اور ڈیڑھ ہزار شتر سوار تھے۔ مجموعی تعداد ان لشکروں کی کم از کم ۷ ہزار کی تھی۔ بعض تخمینے دس اور بارہ ہزار بلکہ بعض پندرہ ہزار کے بھی ہیں۔ افسرِ اعلیٰ ابوسفیان قریشی تھا۔ عرب نے اتنی بڑی فوج کشی کی مثال اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ حضرت سلمان فارسی صحابیؓ کے مشورہ پر لشکرِ اسلام کے سالارِ اعظمؐ نے خود گھوڑے پر سوار ہو کر شہر کا دورہ کرنے کے بعد حکم دیا کہ شہر کے گرد جس جس رُخ سے دشمن کا داخلہ ممکن ہے خندق کھود دی جائے۔ چنانچہ شہر کے شمالی اور کسی قدر غربی رُخ پر بھی ایک خندق ساڑھے تین میل لمبی کھودی گئی۔ اور یہ کام ۳ ہزار رضا کاروں کی دس دس کی ٹولیوں پر تقسیم کر دیا گیا۔۔۔۔ عرب کے لئے یہ نئی حکمتِ جنگ تھی، اور قریش اس پر دنگ رہ گئے۔

محاصرہ طول کھینچتا گیا، یہاں تک کہ شوال ختم ہونے پر آ گیا اور ذی قعدہ شروع ہونے لگا جسے قبائلِ عرب صلح و امن کا مہینہ مانتے تھے۔ اور اس درمیان میں خود سپہ سالارِ اسلامؐ ہی کی حسنِ تدبیر سے دشمن اور حلیفوں کے آپس میں بدگمانیاں اور غلط فہمیاں پھیل گئیں۔ سردار ابوسفیان بددل ہو کر چلا ہی تھا کہ حکمِ قضا سے ایک روز ایک طوفان آندھی اور بارش کا، زور و شور کا آیا۔ اور اس کی پوری زد لشکرِ کفار پر پڑی۔ خیمے اکھڑ گئے، برتن لڑھک گئے، روشنیاں بجھ گئیں۔ غرض ابتری ہر طرح پھیل گئی۔ قریش کا لیڈر اس غیبی گولہ کی تاب اور بھی نہ لا سکا۔ اور سارے لیڈر بھی ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔

(۲:۳۳)

واقعۂ افک

۶ھ کا واقعہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ غزوۂ بنی مصطلق سے مدینہ منورہ واپس ہو رہے تھے۔ حضرت عائشہؓ ہمراہ تھیں، آپ کی سواری کا اونٹ علحدہ تھا اس پر ہودج تھا۔ آپ پردہ چھوڑ کر بیٹھ

جاتیں. جمال ہودج کو اٹھا کر اونٹ پر باندھ دیتے. آپ ہلکی پھلکی کم سن تھیں. ایک روز اتفاق سے ایک منزل پر آپ کو ہودج سے باہر ویرانہ کی طرف جانے کی ضرورت پیش آئی، واپس آئیں تو قافلہ کوچ کر چکا تھا. ہودج پر پردے پڑے ہوئے تھے. جمالوں کا خیال بھی اِدھر نہ گیا، کہ آپ موجود نہیں ہے. اب جب آئیں تو سخت متأسف ہوئیں لیکن آپ نے خیال کیا کہ آگے چل کر جب میری تلاش ہوگی اور میں نہ ملوں گی تو کوئی ڈھونڈنے بہر حال یہاں ضرور آئے گا. رات کا وقت چادر لپیٹ کر وہیں بیٹھ گئیں اور نیند آ گئی۔

ایک صحابی حضرت صفوانؓ تھے ان کی ڈیوٹی یہ تھی کہ قافلہ سے کچھ فاصلہ پر پیچھے پیچھے چلا کریں. گری پڑی چیز کی، بھولے بھٹکے کی خبر گیری کے لئے. وہ جب صبح سویرے یہاں پہنچے تو دیکھا کوئی انسان سو رہا ہے. قریب پہنچے تو پہچانا اور بے اختیار پکار اٹھے انا للہ وانا الیہ راجعون. آواز سے حضرت صدیقہؓ کی آنکھ کھل گئی منہ ڈھانپ لیا. انہوں نے اپنا اونٹ قریب لا کر بٹھا دیا. ام المؤمنین پردہ کے ساتھ سوار ہو گئیں. انہوں نے اونٹ کی نکیل تھامے قافلہ میں جا کر ملا دیا. بات کچھ بھی نہ تھی لیکن مدینہ منافقوں کا گھر تھا ان کے سردار عبداللہ بن ابی کو ایک شگوفہ ہاتھ آ گیا اپنی خباثت سے خوب خوب حاشیہ آرائی کی اور گنتی کے تین مسلمان بھی اس کی سنی سنائی باتوں کو دہرانے لگے۔

تمام پاکیزہ خصلت، پاکیزہ مزاج مسلمانوں کو اس گندے تذکرے سے جیسی کوفت ہوئی ہوگی ظاہر ہی ہے خصوصاً جناب صدیقہ اور خود حضرت رسول اللہ ﷺ کو. یہاں تک کہ ایک مہینہ کے بعد براءت کی آیتیں خود قرآن میں نازل ہو کر رہیں ۔۔۔۔ نبی کی زندگی کا ایک ایک جزئیہ امت کے حق میں رحمت ہے، برکت ہے، امت کی کتنی نیک، پارسا بیویوں پر آج بھی کیسی کیسی تہمتیں لگتی رہتی ہیں. ان سب بیچاریوں کو اس واقعہ سے صبر و تسکین کا کتنا بڑا سہارا ہاتھ آ گیا۔

(۱۶:۲۴)

صلح حدیبیہ

۶ھ کا ماہِ رجب (مطابق مارچ ۶۲۸ء) تھا اور حکومتِ مکہ پر ابھی بدستور مشرکین کا

قبضہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو خواب کی بنا پر کعبہ کی زیارت وعمرہ کا خیال پیدا ہوا اور آپ تقریباً چودہ سو احرام پوش صحابیوں کی جماعت کے ساتھ طوافِ کعبہ کے لیے روانہ ہوگئے۔ شہر مکہ سے تین میل شمال میں ایک مقام حدیبیہ ہے۔ ابھی یہ قافلہ وہیں پہنچا تھا کہ اُدھر حکومتِ مکہ کی طرف سے مزاحمت کی اطلاع ملی آپ نے آگے بڑھنے کے بجائے وہیں قیام فرمادیا۔ اور قاصد کے ہاتھ اہلِ مکہ کے پاس پیام کہلا بھیجا کہ ہم لڑنے کو نہیں، بلکہ صلح وآشتی کے ساتھ عمرہ ادا کرنے کو آئے ہیں، جواب نہ آیا تو آپ نے حضرت عثمانؓ کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا ان کی واپسی میں بھی تاخیر ہوئی اور یہ خبر مشہور ہوگئی کہ یہ سفیرِ رسول شہید کردئے گئے اس پر آپؐ نے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر سب صحابہ سے جہاد کی بیعت لی۔ مشرکوں نے یہ سن کر حضرت عثمانؓ کو واپس بھیج دیا۔

اَب مکہ کے چند سردار بھی آپؐ کی خدمت میں آئے اور گفتگو کے بعد ایک صلح نامہ مرتب ہوا، جس کی اکثر دفعات سے بظاہر مسلمانوں کو سُبکی ہوئی تھی اور اس لیے بعض صحابیوں کو درمیان میں بہت جوش بھی آ گیا، مگر آپؐ نے سب کو روکا اور بالآخر مشرکوں ہی کے شرائط پر صلح نامہ مرتب ہوگیا اور آپؐ مع جاں نثار صحابیوں کے احرام اتار کر بغیر مکہ مکرّمہ تک پہنچے واپس آ گئے۔

(۱: ۴۸)

غزوۂ حنین

مسلمان فتح مکہ کے دو ہزار طلقاء یعنی جدید العہد نومسلموں کو ملا کر بارہ ہزار کی تعداد میں تھے۔ مسلمانوں کو قدرۃً خیال گزرا کہ آج تو ہماری جیت یقینی ہے۔ چنانچہ اول اول ہوئی بھی مسلمانوں کی فتح، مشرکین بھاگے، مسلمان مالِ غنیمت پر ٹوٹ پڑے، مشرکین موقع دیکھ پلٹ پڑے اور تیر اندازی اس غضب کی کی کہ مسلمانوں کے پیر اکھڑ گئے۔ مشرکین کے تیر انداز دستے پہاڑوں کی آڑ میں بہترین کمین گاہوں میں چھپے بیٹھے تھے، مسلمانوں کو جگہ بُری ملی۔ مورچہ جما کر صفیں قائم کرنے کا موقع نہ ملا۔ پہلے پیر طلقاء کے اکھڑے پھر عام مسلمانوں کے، صرف رسول اللہ ﷺ چند مخصوص صحابہ ابوبکرؓ، عمرؓ، عباسؓ، علیؓ، ابنِ سعدؓ وغیرہ کے میدانِ جنگ میں رہ گئے۔ عباس بن عبدالمطلب آپ کے خچر

کی رُکاب تھامے ہوئے تھے، اور آپ تھے کہ اپنی صداقت پر مطمئن دشمن کی طرف بڑھتے ہی جاتے تھے۔ بار بار پکار کر فرمایا انا النبی لا کذب ،انا ابن عبد المطلب ''میں عبدالمطلب کا بیٹا، نبی ہوں اس میں کچھ جھوٹ نہیں'' إلیّ عباداللہ إنی رسول اللہ، آخر مسلمانوں کو دوبارہ غیرت آئی، پھر سے مقابلہ شروع کیا، آسمان سے فرشتوں کی مدد نازل ہوئی، مشرکین آخر بھاگ نکلے، کچھ قید ہوئے، کچھ قتل ہوئے۔

(۳۹:۹)

غزوۂ تبوک

تبوک، مدینہ کے شمال میں سرحدِ شام پر ایک مقام کا نام ہے، شام اُس وقت مسیحیوں کی رومن امپائر کا ایک صوبہ تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ غزوۂ حنین سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ آئے تو آپ کو اطلاع ملی کہ مسیحی فوجیں تبوک پر جمع ہو رہی ہیں اور عنقریب مدینہ پر حملہ کرنے والی ہیں۔ آپ نے خود ہی آگے بڑھ کر مقابلہ کرنا چاہا۔ چنانچہ ۳۰ ہزار کی جمعیت آپ کے ہمراہ ہوگئی۔ تاہم اب کے ایک طرف مقابلہ کسی قبیلہ سے نہیں ایک باضابطہ قواعد دان شاہی فوج سے کرنا تھا۔ پھر موسم بھی شدید گرمی کا۔ فصل پکنے اور کٹنے کا زمانہ بھی قریب اور سفر خاصہ دور دراز! قدرۃً بہتوں کی ہمتیں جواب دے گئیں اور منافقین تو خوب خوب رنگ لائے۔ لشکر نصاریٰ کو جب لشکرِ اسلام کی اس مستعدی کی اطلاع ملی تو خود ہی ان کے حوصلے پست ہوگئے اور ان کی ہمت فوج کشی کی نہ پڑی۔ لشکرِ اسلام ایک مدت کے انتظار کے بعد بلا مقابلہ واپس آیا۔

(۷۳:۹)

واقعہ اصحابِ فیل

سالِ عیسوی ۵۷۰ یا ۵۷۱ تھا، ولادتِ نبوی میں ابھی چند ہفتوں کا زمانہ باقی تھا کہ حجاز کے پڑوس میں جو حبشہ کی پُرقوت مسیحی سلطنت قائم تھی اور جس کی وسعت حدودِ عرب تک پہنچی ہوئی تھی،

اس کے گورنر علاقۂ یمن ابرہہ نے حجاز بلکہ خود خانۂ کعبہ پر چڑھائی کردی، حاکمِ یمن یوں بھی وقت کی ایک زبردست سلطنت کا نمائندہ تھا۔ پھر اس کی بنوائی ہوئی مسیحی عبادت گاہ کی شدید توہین بھی کسی بے ادب عرب نے کردی تھی۔ ابرہہ کو قدرۃً اس پر غصہ آیا اور اس نے فوج کشی پوری قوت کے ساتھ کی۔ اس کی فوج میں ہاتھی بھی تھے، جو عرب میں ایک بالکل نئی چیز تھی۔ جیسے کہ آج کل کی جنگ میں ٹینک، جیپ، آتشیں اژدھا وغیرہ۔

ہوا یہ کہ یک بیک سمندر (بحرِ احمر) کی طرف سے پرندوں کا ٹڈی دل نظر آیا، جن کے پنجوں میں اور چونچوں میں کنکریاں تھیں۔ جن سپاہیوں پر وہ کنکریاں پڑتیں وہ چیچک میں مبتلا ہو جاتے۔ ابرہہ یہ ماجرا دیکھ پریشان ہو کر بھاگا، اور یمن پہنچتے ہی پھنسیوں میں لدا ہوا دنیا سے رخصت ہو گیا۔

(۱۰۵:)

ابتداءِ وحی

آپ ﷺ کی عمرِ مبارک جب قریب چالیس کے پہنچی تو آپ کی طبیعت زیادہ خلوت پسند ہو گئی اور شہرِ مکہ سے متصل ایک پہاڑی حرا نامی کے غار میں آپ اکثر جا کر معتکف رہنے لگے۔ آپ کی امانت و دیانت، آپ کا تقوی و اخلاص، آپ کا حسن خلق پہلے ہی سے قوم میں مسلّم تھا۔ ایک شب میں کہ وہ رمضان ۱۳ ق۔ھ کی کوئی تاریخ تھی کہ دفعۃً فرشتۂ اعظم حضرت جبرئیلؑ نمودار ہو کر آپؐ سے فرمایا کہ اقرا یعنی پڑھیے! آپؐ نے جواب دیا کہ ما انا بقارئ میں تو پڑھنا نہیں جانتا۔ اس پر انہوں نے آپ کو اپنے سے لپٹایا اور بھینچا اور پھر اس طرح کا مکالمہ و معانقہ کا اعادہ ہوا۔ گویا بارِ الٰہی کے اٹھانے کے لئے جن قوتوں کی ضرورت ہے وہ ملکوتی واسطہ سے بشری جسم میں پوری طرح سرایت کر دی گئیں۔ اور تیسری بار کی تکرار کے بعد پوری پانچ آیتیں اقرا سے لے کر مالم یعلم تک فرشتۂ اعظم نے پڑھ کر رسول اللہ ﷺ کو سنا دیں ہیئتِ وحی سے خصوصاً جب کہ اس کا بالکل پہلا تجربہ تھا، تأثر اور خوف و رعشہ بالکل طبعی تھا۔ آپؐ نے گھر آ کر رفیقِ زندگی حضرت خدیجہؓ سے ماجرا بیان فرمایا۔ انہوں نے تسلی دی۔ اور آپؐ ان کے مشورہ سے ورقہ بن نوفل کے پاس گئے جو اس وقت کے عابد

وزاہد موحدِ مسیحی تھے .اوران کے بیان سے آپ کے ایقان کوتقویتِ مزید پہنچی ،جیسا کہ بعض دفعہ استادِ کامل کواپنے شاگرد کے تائیدی بیان سے ہوجاتی ہے۔

(۱:۹۲)

واقعہ عبداللہ ابن ام مکتوم

ایک صحابی عبداللہ ابن ام مکتوم نامی نابینا تھے .رسول اللہ ﷺ کی بعثت اور تبلیغ کا ابھی ابتدائی زمانہ تھا کہ ایسے وقت آپ کے پاس آئے اور کوئی مسئلہ دریافت کرنے لگے ،جب کہ آپ کے پاس قریش کے بڑے بڑے سردار بیٹھے ہوئے تھے .جاہلی تہذیبوں میں اونچ نیچ (Social status) کا فرق ہمیشہ بہت ہی مبالغہ آمیز رہا ہے .برہمن کے برابر شودر بھلا کہیں بیٹھ سکتا ہے؟ قریش کے جاہلی تمدن میں ایک غریب کی جسارت بڑی بدتہذیبی میں داخل تھی .اور رسول اللہ ﷺ کو تبلیغ واشاعتِ دین کی دھن میں اُن لوگوں کی تالیفِ قلب خاص طور پر مدِ نظر تھی .ایسے موقع پر ان نابینا صحابی کی نادانستہ مداخلت آپ کو قدرۃً ناگوار گذری .رسول اللہ ﷺ افضل البشر اور اعلم الناس تھے .آپؐ نے انتہائی اجتہادِ بشری سے کام لے کر یہ خیال فرمایا ،اور بالکل صحیح طور پر ،کہ کلی گمراہی ،جزئی ناواقفیت سے کہیں زیادہ اہم ہے اور اصول ،فروع پر کہیں زیادہ مقدم ہیں .قرآن میں آپ کو علم بشری محدود نہیں ،علمِ الٰہی غیر محدود تنبیہ کررہا ہے کہ ایک میں تو اصلاح کی طلب تھی ،وہ خود دوڑتا ہوا حاضر ہوا تھا .دوسرے فریق سرے سے اپنی ضرورتِ اصلاح سے غافل اور آپ کے مصلح ہونے کے منکر تھے .اس لئے آپ کو چاہیے تھا کہ آپ اپنی توجہ اسی پہلے شخص کے حق میں مقدم رکھتے۔

(۴۱:۸۰)

ایک بدری صحابی

حاطب بن بلتعہ یمنی ثم مکی ایک بڑے صحابی تھے ،بدری مرتبہ کے .خود تو ہجرت کر کے مدینہ آگئے تھے ،خاندان سارا مکہ ہی میں تھا .فتحِ مکہ سے ذرا قبل اپنے خاندان کو خط لکھا کہ عنقریب مکہ

پر چڑھائی ہونے والی ہے۔ آنحضرت کو وحی الٰہی سے خبر ہوگئی۔ آپ کے حکم سے وہ عورت پکڑ آئی۔ جو چھپا کر خط کو لیے جارہی تھی۔ حضرت حاطبؓ نے اپنے بیان میں کہا کہ ''میری نیت بری نہ تھی، میں نے تو محض یہ سمجھ کر لکھا تھا کہ اسلام کا اس سے کوئی ضرر نہیں آپ کو فتح تو بحمد اللہ ہو کر رہے گی۔ ہاں میری اس اطلاع سے اہل مکہ ضرور میرے احسان مند ہو جائیں گے اور میرے خاندان کی رعایت کریں گے کہ مجھ پردیسی اور میرے خاندان کا اہل مکہ پر کوئی حقِ قرابت وغیرہ بھی نہیں'' آپؐ نے ان کی حسنِ نیت کی تصدیق کر کے فرمایا کہ ''تم سچے ہو'' بلکہ حضرت عمرؓ نے اپنے عام جوشِ دینی کے تحت میں اس دفعہ کا نفاذ کرانا چاہا بھی جو دشمن سے مل جانے والوں اور انہیں خبر پہنچانے والوں کے لئے ہے تو آپ نے فرمایا کہ ''یہ تو بدری ہیں اور تمہیں معلوم نہیں کہ اہل بدر کے خلوص وایمان کی جانچ خود اللہ تعالیٰ کر چکا ہے''

(۲ : ۶۰)

مسلمانوں کی بے چارگی پر منافقین کا استہزاء

اہل ایمان کی پختگی واستقامت کی یہ پوری اور سخت آزمائش تھی۔ شدید سردی کا موسم تھا۔ غلہ کی گرانی وکم یابی تھی۔ صحابہ بلکہ خود رسول اللہ ﷺ تک بھوک کی شدت سے پیٹ پر پتھر باندھے ہوئے تھے۔ اس پر بھی ہمت واستقلال کا یہ عالم تھا کہ سنگلاخ زمین کی کھدائی بغیر کسی دستے کے، اپنے ہاتھ سے جاری تھی۔ ظاہری مغلوبیت وبے چارگی کا یہ عالم تھا کہ رسول اللہ نے خود اپنے دستِ مبارک میں پھاوڑا لے کر ایک پتھر پر جو ضرب لگائی تو آگ کے شرارے پیدا ہوئے اور ایسا تین بار ہر ہر ضرب پر ہوا۔ اس روشنی میں آپ کی نگاہِ کشفی کو ایران اور شام اور یمن کے محل دکھائے گئے اور آپ نے اپنے رفیقوں کو بشارت دی کہ یہ سب ملک میری امت کو دیے گئے ہیں۔ کچے اور کمزور ایمان والے تو دودِلے ہو ہی رہے تھے اور اپنی جان کی خیر منا رہے تھے۔ منافقین نے طنز واستہزاء سے کہنا شروع کیا کہ ''یہ لیجئے حالت تو یہ ہو رہی ہے اور خواب دیکھ رہے ہیں ایران اور روم کے شاہی محلوں کے''

(۲۶:۳۳)

اصحابِ کہف

یہ کون لوگ اور کس زمانہ کے تھے؟ قرآن مجید کو بحث وسروکار چونکہ صرف بصیرتوں وعبرتوں اور اخلاقی اسباق ونتائج سے رہتی ہے اس لئے وہ تاریخی جغرافی تفصیلات سے خاموش ہے۔ مفسرین قدیم وجدید کی اکثریت نے اسے مسیحی دور کی حکایت قرار دیا ہے۔ رومی شہنشاہ ڈی سیس یا دقیانوس (التوفی ۲۵۱ء) اپنے مذہب بت پرستی میں غلو رکھتا تھا مسیحی مذہب نیا نیا اسی کے زمانہ میں سلطنت روم میں پھیل رہا تھا، اس نے عیسائی موحدین پر سختی شروع کی، اس سے تنگ آ کر چند شریف نوجوان شہر سے نکل کھڑے ہوئے اور قریب کے ایک پہاڑی غار میں پناہ لی۔ وہاں ان پر ایک غیر طبعی، بلکہ ایک خارقِ عادت نیند مسلط ہوگئی اور وہ کچھ اوپر تین سو سال تک سوتے رہے اور جب ایک عجازی انداز سے جاگے تو روپیہ لے کر کھانا خریدنے چلے تھے۔ جب بازار پہنچے تو چونکہ قرنہا قرن کی مدت گزر چکی تھی۔ شہریوں کے وضع، لباس، زبان، مکانات سب ہی کی ہیئت بدل چکی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حکومت کا تختہ الٹ چکا تھا اور بادشاہت اب بجائے دشمنانِ مسیحیت کے خود مسیحیوں کی قائم تھی۔ وہ صاحب اپنے صدیوں قبل کے لباس ووضع کے باعث یوں ہی تماشہ بنے ہوئے تھے اور جب انہوں نے جیب سے نسلوں قبل کا سکہ نکالا۔ جب تو لوگوں کی حیرت اور بدگمانی بدرجہا بڑھ گئی۔ سب نے انہیں گھیر لیا اور انہیں حیران وپریشان ہوکر مجبوراً اپنا پتہ بتانا اور اپنی سرگذشت دہرانی پڑی اور کچھ لوگ ان کے بیان کی تصدیق کے لیے آخر ان کے ساتھ غار کے دہانے تک آئے۔ ہوا یہ کہ جب لوگ ان کی زیارت کو جوق در جوق آنے لگے اور غار کے دروازہ پر میلا سا لگنے لگا تو ان حضرات کو وفات دے دی گئی۔

(۳۲،۲۶،۱۰:۱۸)

فصل سوم

تفسیری عبارتیں

فیھا ازواج مطھّرۃ (۲:۲۵)

بعض ''روشن خیالوں'' کو پاکیزہ بیویوں کے نام سے خدا معلوم کیوں اتنی شرم آئی کہ انھوں نے اس معنٰی ہی سے انکار کردیا اور ازواج مطھرہ کی تفسیر عجیب توڑ مروڑ کر کی ہے، گویا بہشت میں رضائے الٰہی کے مقام میں ہر قسم کی انتہائی لذت، مسرت وراحت کے موقعوں پر بیویوں اور پھر پاکیزہ بیویوں کا ملنا بڑے ہی شرم وندامت کی بات ہے! جنت کے نفسِ وجود ہی سے اگر کسی کو انکار ہے، جب تو بات ہی اور ہے، ایسے مخاطب کے سامنے پہلے جنت کا اثبات کیا جائے گا لیکن اگر جنت کا اقرار ہے تو پھر وہاں کی کسی لذت، کسی نعمت، کسی راحت سے انکار کے کوئی معنٰی نہ نقل کے لحاظ سے صحیح ہیں، نہ عقل کے اعتبار سے. جنت کے تو معنٰی ہی یہ ہے کہ وہ مادی اور روحانی ہر قسم کی لذتوں، مسرتوں، راحتوں کا گھر ہوگا. یا پھر یہ ہے کہ بیوی کے نعمت ہونے ہی سے انکار ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس عقیدہ کا رشتہ اسلام سے کہیں زیادہ رہبانیت اور مسیح کی لائی ہوئی نہیں، پولوس کی پھیلائی ہوئی مسیحیت سے وابستہ ہے، زوجیت جب دنیا میں اللہ کا ایک اعلٰی انعام ہے تو آخر جنت میں کس جرم میں اس سے محرومی ہوجائے گی؟ حقیقت یہ ہے کہ جسمانی، مادی، حسّی خصوصاً ازدواجی نعمتوں کو حقیر سمجھنا، یا ان سے شرمانا تمام تر جاہلی مذہبوں، خصوصاً پولوسی مسیحیت سے دماغی مرعوبیت کا نتیجہ ہے، اسلام تو حسّی اور معنوی، مادی اور روحانی، جسمانی اور عقلی ہر قسم کی نعمت کی قدر کرنے کی تعلیم دیتا ہے، ایسی خشک لذت جس میں کوئی شائبہ نہ لامسہ کا ہو، نہ باصرہ کا، نہ ذائقہ کا، نہ سامعہ کا، اور صرف اسی پر قانع رہنا کمال نہیں نقص ہے، ہنر نہیں عیب ہے، اور معلوم ہے کہ نقص وعیب جنت کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتے۔

(۱۰۰)

وضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ (۲:۶۱)

مفلسی، محتاجی، تنگدستی کے انتساب پر عجب نہیں کہ ناظرین کو حیرت ہو اور سوال دل میں پیدا ہو کہ تمول تو یہود کا ضرب المثل ہے پھر اس قوم کو محتاج و تنگدست کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ لیکن یہ محض دھوکا ہے اور عام طور سے چلا ہوا مغالطہ ہے. دولت و ثروت جتنی بھی ہے وہ قوم یہود کے صرف اکابر و مشاہیر تک محدود ہے، ورنہ عوام یہود کا شمار دنیا کے مفلس ترین قوموں میں ہے. یہ بیان خود محققین یہود کا ہے. جیوش انسائیکلو پیڈیا میں ہے

''گو یہود کا تمول ضرب المثل کی حد تک شہرت پا چکا ہے، لیکن اہل تحقیق کا اتفاق ہے کہ یہود یورپ کے جس جس ملک میں آباد ہیں، وہاں کی آبادی میں انھیں مفلسوں کا تناسب بڑھا ہوا ہے'' (جلد ۱۰ ص:۱۵۱)

''عوام یہود دوسری قوموں سے کہیں زیادہ غریب ہیں، یہ اور بات ہے کہ ان کے چند افراد بہت زیادہ دولت مند ہیں'' (جلد ۵ ص: ۶۱)

(۲:۶۱)

فویل لھم مما کتبت ایدیھم (۲: ۷۹)

قرآنی اور اسلامی معیارِ صداقت و دیانت سے ہر تحریف اور ہر تصحیف موجبِ لعنت ہے اور حد سے بڑھی ہوئی جسارت، اور اسی لئے یہ بات مسلمانوں کو سمجھ میں نہیں آتی کہ کوئی شخص کسی کلام کو کلامِ الٰہی مان کر اس میں دخل و تصرف کی نیت کیسے کر سکتا ہے، لیکن دوسری قومیں اس معیار ہی سے نا آشنا ہیں، بلکہ بعض اہل کتاب کے ہاں تو بھلائی کے لئے ہر برائی درست اور ''خدا کی سچائی'' اور ''خداوند کے جلال'' کے اظہار کے لئے ہر جھوٹ جائز. آج دنیا میں مسیحیت کے نام سے جو تثلیثی شرک پھیلا ہوا ہے اس مذہب کے بانی پولوس اسرائیلی ہوئے ہیں. آپ کا مقولہ آج تک انجیل مروج میں لکھا چلا آ رہا ہے.

''اگر میرے جھوٹ کے سبب سے خدا کی سچائی اس کے جلال کے واسطے
زیادہ ظاہر ہوئی تو پھر کیوں گنہگار کی طرح مجھ پر حکم دیا جاتا ہے؟ اور ہم کیوں
نہ برائی کریں تا کہ بھلائی پیدا ہو'' (رومیون۔۳:۷)
(۲۷۲:۲)

وما کفر سلیمان (۲: ۱۰۲)

آیت کے اس مقام پر پہنچکر مؤمن کے قلب میں ذرا کھٹک پیدا ہوتی ہے کہ یہ کہنے والی کون سی بات تھی جو قرآن نے فرمادی؟ جب حضرت سلیمانؑ پیغمبر حق تھے، تو یہ کھلی ہوئی اور موٹی سی بات ہے کہ آپ شائبۂ کفر وشبہ کفر سے بمراحل دور تھے، پیغمبر کے حق میں یہ نازل ہونا کہ وہ کفر سے بری تھے، یہ تو کچھ ایسی بات ہوئی، جیسے کسی ملک کا بادشاہ یہ فرمان جاری کر کے رعایا کو بتائے کہ ہمارا نائب السلطنت باغی وغدار نہیں ہے۔ کھٹک بجا ہے، قرآن مجید کبھی کوئی چھوٹا سا بیان بھی بے ضرورت نہیں دیتا، مگر یہاں قرآن کو اس اعلان واعلام کی ضرورت تھی، اس ضرورت کا علم سادہ مسلمان کو کیا ہوسکتا ہے؟ اس کا علم تو اس کے ہمہ بیں وہمہ داں پروردگار ہی کو ہوسکتا تھا۔

سلیمانؑ کو پیغمبر ماننے والی دو قومیں مسلمانوں سے پہلے ہوچکی ہیں، یہ دونوں وہی ہیں جو اہل کتاب کہلاتی ہیں یعنی یہود ونصاریٰ، ان دونوں کے اکابر نے ستم ظریفی کا کمال یہ دکھایا ہے کہ ایک طرف تو ان کی عظمت وپیمبری کے قائل ہیں اور دوسری طرف ان کے نامۂ اعمال میں گندے گندے جرائم بھی ڈال دیئے ہیں! یہاں تک کہ کفر وشرک بھی، کہ اللہ کی عدالت میں کوئی جرم اس سے بڑھ کر یا اس کے برابر بھی سنگین تصور میں نہیں آسکتا۔ یہودی قصص وحکایات اور مسیحی آثار وروایات کی کتابوں کو چھوڑ یئے، خاص الخاص بائبل یعنی عہد عتیق کے صحائف، جن پر یہود ونصاریٰ دونوں کا ایمان ہے، انھیں ملاحظہ فرمالیجیے کہ اس مجموعہ میں آج تک کیا تصریحات لکھی چلی آرہی ہیں۔

''جب سلیمان بوڑھا ہوا تو اس کی جوروؤں نے اس کے دل کو غیر
معبودوں کی طرف مائل کیا اور اس کا دل اپنے خدا کی طرف سے کامل نہ

تھا" (۱۔سلاطین۔۱۱:۴،۶،۱۰)

یعنی محض غفلت یا عدم اعتناء کی بنا پر عملی کوتاہی یا عصیان نہیں، صریح بدعقیدگی، توحید ہی کی طرف سے بے یقینی۔۔۔۔آگے ملاحظہ ہو:-

"سوا زبس کہ اس کا دل خداوند اسرائیل کے خدا سے برگشتہ ہوا، اس لئے خداوند سلیمان پر غضبناک ہوا کہ اس نے اُسے حکم دیا تھا کہ وہ اجنبی معبودوں کی پیروی نہ کرے، پر اس نے خداوند کے حکم کو یاد نہ رکھا" (۱۔سلاطین ۱۱:۹-۱۰)

معاذ اللہ! خدا کا پیمبر اور کفر و شرک میں مبتلا! چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی، دنیا کے سیکڑوں سال تک، ہزار ڈیڑھ ہزار سال تک، انہیں یہودیانہ تحریفات و اختراعات کا شکار ہو کر اس مؤحد اعظم کو نعوذ باللہ کافر و مشرک سمجھتی رہی، یہاں تک کہ قرآن آیا، جو ہر قوم، ہر زمانہ کے سچے پیمبروں کی عزت و ناموس کا محافظ ہے اور اس نے آ کر یقین نہ رکھنے والی دنیا کے سامنے اعلان کیا کہ سلیمانؑ کو معاذ اللہ کافر کہتے ہو! وہ تو کفر کے قریب تک نہیں گئے تھے، قرآن کی صدائے حق فضا میں بلند ہو کر خاموش ہو گئی، جن کے کان تھے انھوں نے سنا، دنیا اپنے کاروبار میں لگی رہی، بائبل والوں نے بائبل کی پرستاری نہ چھوڑی، یہاں تک کہ تیرہ ساڑھے تیرہ صدیاں اور گزر گئیں اور اب قدرتِ حق کا اعجاز دیکھئے کہ اب جو محققانہ و فاضلانہ کتب جوامع و حاویات بائبل ہی کے پرستاروں کے قلم سے نکل رہی ہیں اور شائع ہو رہی ہیں، وہ تائید و تصدیق، بائبل کی الزام دہی کی نہیں، قرآن کے جواب صفائی کی کر رہی ہیں! انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، برطانوی کاوش و تحقیق کا لب لباب ہوتا ہے، اس کے سب سے آخری ایڈیشن میں مقالہ زیرِ عنوان سلیمان دیکھئے، صاف یہ مضمون ملے گا

"سلیمان خدائے واحد کے مخلص پرستار تھے" (جلد ۲ ص:۹۵۲ طبع چہاردہم)

انسائیکلو پیڈیا بیبلیکا، خاص مسیحی فضلاء اور پرستارانِ بائبل کی تحقیق و تدقیق کا ثمرہ ہے، اس میں تو یہاں تک ہے کہ بائبل کی جو آیتیں ابھی اوپر نقل ہو چکی ہیں، ان کا حوالہ دے کر یہ لکھا ہے کہ یہ عبارتیں بعد کو بڑھائی گئی ہیں اور الحاقی ہیں! اور پھر لکھا ہے۔

''یہ تو غالباً صحیح ہے کہ سلیمان کی بیویاں متعدد تھیں، اسرائیلی بھی اور غیر اسرائیلی بھی، لیکن انھوں نے نہ تو سب کے لئے قربان گاہیں ہی تیار کرائیں اور نے خود خدائے واحد کی پرستش کے ساتھ اپنی بیویوں کے دیوتاؤں کی پرستش کا تجربہ ہونے دیا'' (کالم ۴۶۸۹)

(۳۵۴:۲)

ما یفرقون بہٖ بین المرء وزوجہ(۱۰۲:۲)

ذکر (ایک بار پھر حافظہ کو تازہ کر لیجئے) یہود کا چل رہا ہے، یہود عہد سلیمانی کا، نیز ان کی اولاد در اولاد کا، قرآن، ایک امی کا لایا ہوا قرآن، اُن کی فردِ جرم سناتے سناتے یک بیک یہ بھی کہہ ڈالتا ہے، کہ یہود سحر اور عملیاتِ سفلی میں تو مشغول رہتے ہی تھے، ان میں بھی خصوصاً ان اعمال میں جن کا تعلق میاں بیوی کے افتراق سے تھا، قرآن نے تو ضمناً اور گویا بالکل لپیٹ میں ایک بات کہہ ڈالی، اب دیکھیے بیسویں صدی کے علمائے یہود اور محققین اسرائیل اپنے اسلاف کے مشغلۂ سحر وساحری کی نوعیت سے متعلق کیا شہادت دیتے ہیں؟

''سحر کی سب سے زیادہ عام متداول صورت اس نقش کی تھی جو عشق ومحبت کے لئے دیا جاتا تھا، خاص کر وہ نقش جو ناجائز آشناؤں کے لئے لکھا جاتا تھا، اس قسم کے سحر کی ماہر عورتیں ہی زیادہ ہوتی تھیں، چنانچہ ذکر بھی سحر اور حرام کاری کا عموماً ساتھ ہی ساتھ آیا ہے (جیوش انسائیکلوپیڈیا، جلد ۸، ص:۲۵۵)

(۳۶۴:۲)

وابتغوا ما کتب اللہ لکم(۱۶۷:۲)

منع حمل اور قطعِ نسل کی جس جدید تحریک کا اس وقت زور ہے اور جو ''ضبطِ تولید'' وغیرہ مختلف خوشنما ناموں سے پیش ہو رہی ہے، قرآن مجید نے اپنے بلیغ انداز میں ان سب کی تردید کر دی

اور بتایا کہ مباشرت کا جو نتیجہ قدرتاً اور طبعاً نکلتا ہے، اسی کی توقع رکھنا چاہیے اور اسی کا انتظار کرنا چاہیے، عام قاعدہ اور اصل عمومی یہی ہے، باقی اجتماعی تزوج کے قدرتی نتیجوں کو بلاوجہ خاص وضرورتِ شدید مصنوعی ذریعوں اور تدبیروں سے روکنا، اور ربڑ وغیرہ کے آلات کو کام میں لانا، مصیبتوں کو دور کرنا نہیں، جسمانی آلام اور اخلاقی امراض کو بڑھانا اور فرد وقوم دونوں کو نئے نئے فتنوں کی دعوت دینا ہے، انتہائی سرگرم کوششوں کے باوجود اول تو ابھی تک کوئی پوری طرح ''حمل روک'' آلہ دریافت ہی نہیں ہوسکا ہے۔

''اب تک کوئی مانعِ حمل ایسا نہیں دریافت ہوسکا ہے جو ہر طرح قابل اطمنان ہو، یعنی بے ضرر ہو، اور سادہ ہو'' (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع چہاردہم)

اور پھر یہ بھی تو ہے کہ اولاد کی پیدائش ہمیشہ والدین کے ارادہ کے تابع نہیں رہتی، چنانچہ ایسے والدین کی مثالیں بارہا مشاہدہ میں آچکی ہیں کہ پہلے تو انھوں نے امتناع کی صناعی تدبیریں اختیار کر کے اپنے اعضاء تولید کی صلاحیتوں کو ضائع کر دیا، اور پھر آگے چل کر جب اولاد کی خواہش یا ضرورت محسوس کی تو اپنی سابقہ حرکتوں پر پچھتائے ہیں، یہ سب تصریحات انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ہی سے ماخوذ ہے، باقی متعدد دوسرے ڈاکٹروں اور انھیں میں لیڈی ڈاکٹر بھی ہیں، اور سائنس کے ماہرین نے اس جدید فیشن کی لغویت اور بیہودگی پر اس سے بھی زیادہ کھلے لفظوں میں کہا ہے اور اس کی طبعی مضرتیں کھول کر دکھائی ہیں خصوصاً عورت کے حق میں، بلکہ یورپ کے متعدد ملک تو اس تحریک کے نتائج سے تنگ آکر اور طویل تجربوں کے بعد بالآخر اسی پر مجبور ہوئے کہ ماؤں کے لئے انعام دیں اور ہر نئی زچگی پر ایک انعام دیں! جرمنی، اٹلی وغیرہ سے تو یہ خبریں کئی سال سے آنا شروع ہوگئی تھیں، اور اب روس، اور فرانس وغیرہ سے عین دورانِ جنگ عظیم (۱۹۴۲ء) میں آنے لگی ہیں، اور بالآخر بات اسی کی سچی نکلی اور اُسی کی بلند رہی جس نے کہا تھا کہ تزوجو ا الودود الولود شاں کرو زیادہ بچے پیدا کرنے والی بیویوں سے۔

(۱۸۱:۴)

هن لباس لکم و انتم لباس لهن (۲:۱۸۷)

گویا اردو محاورہ میں، چولی دامن کا ساتھ ہے، وہ اُن کے حق میں اوڑھنا بچھونا ہیں، اور یہ اُن کے حق میں، یہ لباس کی تشبیہ کس اعتبار سے ہے؟ مختلف زبانوں سے مختلف جوابات ملتے ہیں، بعض نے کہا ہے کہ ایک دوسرے کے محتاج ہونے کی بناپر، کسی نے کہا کہ اجسام کی ملابست وملامست کی بناپر، وقس علیٰ هٰذا لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ انسان کے حق میں لباس کا ایک وصف امتیازی اس کی پردہ پوشی ہے، لباس جسم کے عیبوں کو چھپاتا ہے، اس کے حُسن وخوبی کو ابھارتا ہے۔ تشبیہ سے خاص اشارہ اسی وصف کی جانب معلوم ہوتا ہے، گویا ہر اسلامی خاندان میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کا پردہ پوش ہونا چاہیے اور ایک دوسرے کی زینت کو بڑھانے والا، جو انتہائی گہرا رشتہ اور تعلق میاں بیوی کے درمیان ہوتا ہے، اس کی بناپر ظاہر ہے کہ جتنا موقع ایک کو دوسرے کے جسمانی، اخلاقی، روحانی عیبوں اور کمزوریوں پر مطلع ہونے کا ملتا ہے۔ اتنا نہ کسی دوست کو مل سکتا ہے نہ کسی عزیز کو، اور نہ ایک کا راز دوسرے سے مخفی رہ سکتا ہے۔ اس صورت حال میں عورت کے اخلاق کا کمال یہ ہے کہ شوہر کی ہر کمزوری چھپائے، اس پر صبر کرے، اسے بہتر سے بہتر صورت میں ظاہر کرے اور ع

ناخوش تو خوش بو بر جان من

کا ثبوت قدم قدم پر پیش کرے، علیٰ هٰذا مرد کے بھی کمالِ اخلاق کی یہی معراج ہے۔

دونوں کی اخلاقی تکمیل کا یہ مؤثر ترین نسخہ اسلام نے باتوں باتوں میں بغیر کسی شدید اور پُر تعب مجاہدہ میں ڈالے ہوئے روزمرہ کے لطیف وسہل مجاہدات کے ذریعہ بتادیا، یہ اس مذہب کی تعلیم ہے جو "فرنگی محققین" کی نظر میں پست اس لئے ہے کہ اُس میں عورت کی تحقیر کی گئی ہے

کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہوگیا

کون جھوٹ اس سے بڑھ کر سخت، کون سا اتہام اس سے بڑھ کر صریح ہوگا؟ منوسمرتی والے ہندو وغیرہ کا تو نہیں جدید عتیق وجدید والے یہودی ونصرانی مذہبوں سے سوال ہے کہ ان کے دفترِ کتب ومصاحف میں اوّل سے آخر تک تعلیم زن وشو کے باہمی محبت واعتماد کے باب میں اس درجہ کی ہے؟

(۲۷۷:۲)

قاتلوا (۲:۱۹۰)

قتال کا حکم اُن مظلوم مسلمانوں کو مل رہا ہے جو دو چار مہینے نہیں، پورے تیرہ برس مکہ میں ہر طرح کے شدائد پر شدائد، اور شدائد کیسے، یہ کہیے کہ شقاوت، سفاکی، بہیمیت پر، صبر کے امتحان میں پورے اتر چکے تھے، اور اب وطن سے بے وطن ہو کر، گھر بار چھوڑنے پر بھی، مدینہ میں چین سے بیٹھنے نہیں پاتے تھے، اللہ تُربت ٹھنڈی رکھے لارڈ ہیڈلے انگریز کی، نومسلم ہو کر بات پتہ کی کہہ گیا ہے کہ تین ابتدائی اسلامی غزوات کے جغرافی محل وقوع کو دیکھ کر خود فیصلہ کرو کہ لڑائی کی ابتدا کس نے کی، اور چڑھائی کون کس پر کر کے گیا تھا؟ حملہ اور جارحانہ اقدام کون کر رہا تھا اور حفاظتِ خود اختیاری و مدافعت میں کون لڑ رہا تھا؟ مکہ کے جنگجو اہل فساد یا مدینہ کے صابر و شاکر مؤمنین؟

(۱) غزوۂ بدر۔ بدر مدینہ سے ۳۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔

(۲) غزوۂ احد۔ احد تو مدینہ سے کل بارہ ہی میل ہے۔

(۳) غزوۃ الاحزاب یا جنگِ خندق۔ اس میں محاصرہ تو خاص مدینہ ہی کا ہوا۔

غرض ہر دفعہ قریش مکہ یا اُن کے حلیف و مددگار ہی مدینہ پر چڑھ کر آئے۔

(۲:۱۹۶)

فی سبیل اللہ (۲: ۱۹۰)

یہ قید کتنی اہم اور دنیا کی تاریخ محاربات میں کیسی انقلاب انگیز ہے! اس دنیا میں لڑائیاں ہمیشہ لڑی گئیں، اب بھی لڑی جا رہی ہیں، آئندہ بھی لڑی جائیں گی، لیکن کاہے کے لئے؟ زر کے لئے، یا زن کے لئے، یا زمین کے لئے، زیادہ سے زیادہ یہ کہ ''قوم'' اور ''وطن'' کے لئے! یعنی زر و زمین کی طلب فرد کے لئے نہیں بلکہ قوم کے لئے رہ جائے، یہ خصوصیت صرف اسلامی جہاد ''بدنام و رسوا'' اسلامی جہاد کی ہے کہ جب کبھی اور جن حالات میں شروع ہو، اللہ کی راہ میں ہو، شرک کو مٹانے اور توحید کو بلند کرنے کے لئے ہو، دیکھ حق کی حمایت و نصرت میں ہو، انسانی حکومت مٹا کر خدائی

حکومت قائم کرنے کے لئے ہو، خودی کے لئے نہیں خدا کے لئے ہو، نفس کے لئے، قبیلہ کے لئے، ''حلقۂ اثر'' کی توسیع کے لئے، ''آزادئ تجارت'' کے لئے، ''آزادئ سمندر'' کے لئے، ''نو آبادیوں کے تحفظ'' کے لئے، ''برآمد کی منڈیاں'' پیدا کرنے کے لئے، غرض نئی اور پرانی کسی قسم کی بھی عصبیتِ جاہلی کے جھنڈے کے نیچے نہ ہو، صاف صاف فی سبیل اللہ ہو، اور فی سبیل اللہ کے معنی لاعزاز دین اللہ۔

(۲:۲۹۶)

ان اللہ لا یحب المعتدین (۲:۱۹۰)

اللہ اللہ! ہر قسم کی زیادتی سے ممانعت کی تاکید عین اُس وقت ہو رہی ہے، جب دل جوشِ انتقام سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں، اور جب غنیم کے ہر ظلم و زیادتی کا جواب، جی یہی چاہتا ہے کہ بھر پور انتقام سے دیا جائے! اس تعلیم کو آج کی ''ترقی یافتہ'' دنیا دیکھئے، Reprisals کا نام لے کر ہر سنگدلی، ہر بربریت، ہر درندگی، ہر جلادی روا رکھے ہوئے ہے۔۔۔۔ غلبہ و اقتدار کے وقت انتقام کے حدود کے اندر رہنا اخلاق کے اعلیٰ مرتبہ کا مقام ہے، اچھے اچھوں کی عقل، متانت اور قوتِ عدل و توازن اس وقت جواب دے دیتی ہے، اور کل کے مظلوم، بے ساختہ اور شاید بے شعوری کے عالم میں آج کے ظالم بن جاتے ہیں، قرآن مجید کا اس موقع پر اپنے پیروؤں کو ضبط و احتیاط کی تلقین کرنا، افرادِ امت کو حکمت و اخلاق فاضلہ کے بلند سے بلند مقام تک پہونچا دیتا ہے، اور پھر جب یاد کر لیا جائے کہ آیت کا موقعِ نزول ذی قعدہ ۶ھ ہے جب معاہدۂ حدیبیہ کے دوسرے سال مسلمان عمرہ کی نیت سے مکہ روانہ ہو رہے تھے، اور اندیشہ تھا کہ مشرکین معاہدہ توڑ کر جنگ شروع کر دیں گے، اور اس کے جواب میں قدرۃً مسلمان بھی اشتعال سے لبریز ہو جائیں گے، تو آیت کے اس تاکیدی اور امتناعی حکم کی قدر و منزلت کس درجہ اور بڑھ جاتی ہے! پھر فتحمندی کی گھڑیوں میں ایسی ہدایت پر عمل کسی قوم نے آج تک کیا ہے، بجز رسول کے صحابیوں اور خلافتِ اسلامیہ کے سپاہیوں کے؟ سوال عقیدت کا نہیں، محض تاریخی ہے۔

(۲:۲۹۷)

فلا رفث ولا فسوق..... (۱۹۷:۲)

اللہ اکبر! ایک معیار یہ ہے عبادت میں طہارت و پاکیزگی کا، اسلام کا قائم کیا ہوا کہ اشارۃً وکنایۃً بھی اس زمانہ میں جائز شہوانی خیالات زبان پر نہ لائے جائیں، اور دوسری طرف مشرکوں کے میلے ٹھیلے تیرتھوار، تیرتھ جاترا، اور نمائش اور جلسے ہیں، جن کی گرم بازاری ہی فحش کاریوں اور شہوت انگیزیوں سے ہے، اور پھر عرب جاہلیت کے تو ارکان حج تک میں فسق داخل تھا..... حج کے موقع پر دنیا کے گوشہ گوشہ کی آبادیاں کھنچ کر آجاتی ہیں. ہر قسم، ہر عمر، ہر مزاج کے لوگ ہوتے ہیں. بوڑھے بھی جوان بھی، بچے بھی، بڑے تند مزاج اور غصہ آور بھی، آوارہ مزاج بھی، حریص وطامع بھی، حسین ونوجوان عورتیں بھی، پھر تکلیفیں اور صعوبتیں بھی، راہ اور سواری کے سلسلہ میں طرح طرح کی پیش آتی ہیں. سب پر مستزاد زبانوں کا اختلاف، وہ ان کو نہیں سمجھتے یہ ان کو نہیں، بڑے بڑے حلیم وعفیف بھی صبر وضبط چھوڑ بیٹھتے ہیں، رشک ومنافقت، بدنظری وبدکاری، نزاع وجدال کے موقع قدم قدم پر رکھے ہوئے ہوتے ہیں. حکیم مطلق کی حکیمانہ نگاہ نے رفث اور فسوق اور جدال سب کی تصریحًا اور تاکیدًا ممانعت کر کے کمزور بندوں کے حق میں کیا خوب انتظام کر دیا ہے۔

(۷۳: ۲)

واستغفروا اللہ (۱۹۹:۲)

حج کا بیان جہاں سے شروع ہوا ہے، دیکھتے آیئے تزکیۂ قلب کا قدم قدم پر کس درجہ اہتمام ہے، حرم شریف نہیں، حدودِ حرم بھی ابھی منزلوں فاصلہ پر ہے کہ ساری عمر کا مالوف ومانوس لباس جسم سے اتر گیا، اور اب نہ سر پر ٹوپی ہے، نہ کسی قسم کی پگڑی صافہ، اور نہ جسم پر شیروانی ہے نہ کوٹ، نہ عبا نہ قمیص، شاہ وگدا، رئیس ورعایا، حکام وعوام سب کے سب دو دو چادروں میں ملبوس! پھر احرام پہنتے ہی جو چیزیں حرام تھیں ان کا ذکر ہی نہیں، جو ہمیشہ حلال تھیں اور فی نفسہٖ جائز ہیں، ایک خاص طویل مدت کے لئے بالکل ممنوع! کتنی ہی مرغوبات ومالوفات سے اس درمیان میں دست

برداری کرنی ہوتی ہے، یہ سب کافی نہیں، گھڑی گھڑی لبیک کہتے رہو، اللہ کے دربار میں حاضری بولتے رہو، مسلسل ذکرِ الٰہی کرتے رہو، اوراب یہ حکم مل رہا ہے کہ خطاؤں کو، گناہوں کو، سیہ کاریوں کو، یاد کرکے اُن سے معافی چاہتے رہو۔۔۔۔اتنے پاکیزہ، ایسے ستھرے اس قدر اصلاحی اجتماع سے دنیا جہاں کے میلوں ٹھیلوں، بُت پرستانہ، وطن پرستانہ، ہوس پرستانہ میلوں، تہواروں کو کوئی بھی مناسبت ہے؟

کوئی نسبت بھی ان آنکھوں سے ہے پیمانہ کو

کیسا صریح ظلم وہ اہل قلم خود اپنی بصارت وبصیرت پر کرتے ہیں، جو اسلام کو دوسرے ادیان ومذاہب کی سطح پر سمجھے ہوئے ہیں!

(۷۴۲:۲)

ربّنا اٰتنا فی الدنیا الخ (۲۰۱:۲)

مال، اولاد، صحت، اطمنان وغیرہ جو چیزیں بھی تحصیل خیر میں معین ہوسکتی ہیں، خواہ بظاہر کیسی ہی دنیوی اور مادّی ہوں، سب مؤمن کا مقصود ومطلوب بن سکتی ہیں، البتہ خود دنیا ہرگز کسی مؤمن کا مُدعا اور مقصود نہیں بن سکتی، آیت کی ترکیب خوب نظر میں رہے۔ اتنا کا مفعول حرف حسنۃ ہے یعنی جس چیز کی طلب وتمنا کی جارہی ہے وہ حسنہ یا بہتری ہے فی الدنیا اور فی الآخرۃ صرف ظرف یا محل ہیں، ترتیب میں یہ مفعول یا معنی کے لحاظ سے مقصود کسی طرح بھی نہیں ہوسکتے، مراد محض یہ ہے کہ ہمیں تو آپ کے دربار سے بھلائی یا بہتری درکار ہے، دنیا میں بھی، ہو تو بھی، اور آخرت میں، ہو تو بھی، مزید تفسیر یہ کہ دنیا میں ہمیں اعمالِ خیر عنایت ہوں اور آخرت میں ثمراتِ خیر۔۔۔۔بعض سطحی دماغ والے اہل قلم نے آیت سے یہ عجیب وغریب نتیجہ نکالا ہے کہ آخرت کی طرح دنیا بھی مؤمن کا مقصود بن سکتی ہے، بلکہ قرآن خود طلبِ دنیا کی تعلیم وترغیب دیتا ہے، تعالی اللہ علوًا کبیرا۔ مغالطہ کی قلعی اوپر کھولی جاچکی ہے، مادہ پرست قوموں کی دنیا طلبی اور دنیا پرستی سے مرعوب ہوکر خود مسلمانوں کو طلبِ دنیا کی تعلیم دینا بلکہ اُسے قرآنی تعلیم قرار دینا خدمتِ اسلام کی عجیب وغریب صورت ہے!

(۷۴۷:۲)

ادخلو افی السلم کافّۃ(۲:۲۰۸)

اسلام صرف چند عقائد یا صرف چند عبادات، یا صرف چند قوانین کا نام نہیں، وہ تو ایک جامع و مانع نظام حیات ہے، ایک مکمل و منظم دستور زندگی ہے، انسانیت کے ایک ایک شعبہ ہر ہر گوشہ پر حاوی، اور اس کا ہر جزو، اس کے کل سے، اس کے دوسرے اجزا سے نہایت درجہ ملحق و مرتبط، یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی شخص توحید تو اسلام سے لے لے، لیکن عبادت کے لئے مسجد، مندر، کلیسا سب کو یکساں سمجھے، یا رسالت پر تو ایمان لے آئے، لیکن معاشیات کے قاعدے کارل مارکس سے اور اخلاق کے ضابطے گوتم بدھ سے لینے جائے، معادیات، معاشیات، اخلاقیات، اجتماعیات اسلام کے سب اپنے ہیں، کسی اور فلسفہ، کسی اور دین، کسی اور نظریہ کی پیوند کاری اس کے ساتھ نبھ نہیں سکتی، آیت کا حکم عام ہے، لیکن شانِ نزول کی روایتوں سے پایا جاتا ہے کہ خطاب خاص نومسلم یہودیوں کی طرف تھا، یہ اسلام لانے کے بعد چاہتے یہ تھے کہ کچھ نہ کچھ رعایت اپنے عقائدِ قدیم کی کئے جائیں، اور اسلام کی ایک مستقل شاخ یہودیانہ اسلام قائم کرلیں، جس طرح بعد کو گمراہ فرقوں کے اثر سے معتزلی اسلام، شیعی اسلام، نیچری اسلام، قادیانی اسلام وغیرہ بہت سے ''اسلام'' قائم ہوکر رہے۔ (۲:۲۰۸)

قل ما انفقتم من خیر .....(۲:۲۱۵)

مصارفِ خیر کی یہ فہرست کیسی جامع اور اس کی ترتیب کس قدر حکیمانہ ہے، سب سے بڑھا ہوا اور اہم ترین حق انسان کے ماں باپ کا ہے جتنی بھی مالی خدمت کرسکے، ان کی کی جائے، پھر دوسرے عزیزوں کا نمبر ہے، اور اس میں بھائی، بہن، چچا، پھوپھی وغیرہ سب آگئے ۔۔۔۔ شریعت نے اپنے نظام میں خاندان کو جو مرکزی حیثیت دی ہے، اس پر یہ ایک اور دلیل ہے ۔۔۔۔ پھر امت کے وہ فرزند ہیں، جو معاش کے سب سے بڑے ظاہری سہارے یعنی شفیق باپ کے سائے سے محروم ہوچکے ہیں، پھر وہ اللہ کے بندے ہیں، جن پر کسی طبعی معذوری کی وجہ سے یا کسی اور خارجی سبب سے

معاش کے عام ذریعے بند یا تقریباً بند ہو چکے ہیں، اور اپنی ضرورتوں کے پورے ہونے کے لئے بیرونی امداد کے محتاج ہیں، اور آخر میں وہ عام انسان آتے ہیں، جو وطن سے علیحدہ ہونے کے باعث عارضی طور پر احتیاج یا تنگ دستی میں مبتلا ہیں، قریبی اور دور کے حقدار اور ملی رشتہ رکھنے والے سب کے سب اپنی اپنی جگہ پر کس خوبصورتی سے ایک فریم کے اندر ''فٹ'' ہو گئے، مقصودِ شریعت یہ ہرگز نہیں کہ پڑوس میں ہمارا بھائی بھوک سے تڑپ رہا ہو، اور ہم اس کی طرف سے بے فکر ہو کر چندہ لکھوا رہے ہوں چین یا جاپان کے کسی ریلیف فنڈ میں!

(۲:۷۸۸)

ولا یزالون یقاتلونکم الخ (۲:۲۱۷)

ایک انگریز مترجم قرآن کیمبرج یونیورسٹی کے استاد عربی پروفیسر ہوئے ہیں، اس موقع پر طنز و تعریض کا نشتر یوں چلاتے ہیں.

''اب اسلام نے کافروں پر ہر چہار طرف سے دھاوا بول دیا''

دھاوا چاروں طرف سے یقیناً بول دیا گیا تھا لیکن اس جھوٹ میں سچ صرف اتنا ہے کہ یہ دھاوا اسلام کا نہ تھا، خود اسلام پر تھا۔

(۲:۷۹۸)

نساء کم حرث لکم (۲ : ۲۲۳)

کھیت کہتے ہیں اس موقعِ زمین کو جس میں تخم ریزی ہوتی ہے، اور اس میں سبزی، غلّہ، نباتات کا نشو و نما ہوتا ہے، کھیت والے اسے اپنی بہت بڑی دولت سمجھ کر نہایت درجہ عزیز رکھتے اور اس کی ہر طرح نگہداشت اپنے اوپر لازم سمجھتے ہیں، اسلام نے ہم بستری کا اصل مقصد طلبِ اولاد کو رکھا ہے، گو اس کے دوسرے پہلو یعنی طلبِ لذت کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔۔۔۔ آیت کے الفاظ سے ضمناً روشنی منعِ حمل کے مسئلہ پر بھی پڑ جاتی ہے، اور کسی جہت سے بھی مسئلہ کی عمومی صورت کی تائید

نہیں نکلتی، بلکہ ایک گونہ تردید ہی نکلتی ہے، کون کاشت کار زمین میں بیج محض ضائع کر دینے کے لیے ڈالے گا؟

(۸۳۱:۲)

وللرجال علیھن درجة (۲:۲۲۸)

تہذیب جاہلی ہر زمانہ میں عجیب عجیب بے اصل اور تمام تر غلط دعوے کرتی رہتی ہے، اور بعد کو ان دعوؤں کی عملی تردید بھی ہوتی رہتی ہے، تہذیبِ جدید کے انھیں بے بنیاد مفروضوں میں سے ایک دعوی یہ بھی ہے کہ مرد وعورت ہر حیثیت اور ہر اعتبار سے ہم درجہ ہیں، محض دعوی کتنی ہی کثرت سے دہرایا جائے دعوی ہی رہے گا، دلیل نہ بن جائے گا۔ قرآن ابھی ابھی جاہلیت ہی کے ایک مفروضہ کی تردید کر چکا ہے، کہ عورت بے حقی نہیں ہے، وہ بھی مردوں کی طرح اپنے حقوق رکھتی ہے، اب وہ جاہلیت کے دوسرے دعوی کی تردید میں بے دھڑک اعلان کر رہا ہے کہ دونوں جنسوں میں مساواتِ مطلق ومساواتِ کامل نہیں بلکہ مرد کو عورت پر ترجیح وفضیلت ہے۔۔۔۔ جدید علوم وطبعیات کے ماہرین جنھوں نے مرد وزن کی جسمانی ساخت وترکیب، دماغی وذہنی قوی اور طبعی خصوصیات کے مطالعہ وتحقیق میں عمریں بسر کر دی ہیں، اُن کی بڑی جماعت آخر اس نتیجہ پر پہونچی ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے متمم ومکمل ہیں، تاہم بہ لحاظ قوت وبہ لحاظ عقل مرد ہی کو فضیلت حاصل ہے اور عورت جن ملکوں میں مردوں کے برابر ثابت بھی ہوئی ہے وہاں اپنی انسانیت کا خون کر کر کے۔

(۸۵۱:۲)

ایود احدکم ان تکون لہ الخ (۲:۲۶۶)

ذرا صورتِ حال کی حسرتناکی کا تصور کیجئے! ایک شخص کی عمر بھر کی کمائی ایک باغ ہے۔ سرسبز وشاداب، خوب پھلا پھولا ہوا، ہر طرح کے میووں، پھلوں سے لدا ہوا، باغ کا مالک بوڑھا ہو جاتا ہے اور اب کسی نئی محنت کے قابل نہیں، بچے موجود ہیں، مگر کمزور، کم سن، جو بجائے اس کے کہ کسبِ معیشت میں باپ کا ہاتھ بٹائیں الٹے اس کے لئے بار ثابت ہو رہے ہیں۔ عین اس وقت شدید ترین

حاجتمندی کے وقت یک بیک معلوم ہوتا ہے کہ باغ میں آگ لگی اور سب کچھ جل کر خاکستر ہو گیا۔ باغ کے مالک کے غم وحسرت کا کوئی اندازہ کرسکتا ہے؟ اس سے کہیں بڑھ کر ہزار گنا اور لاکھ گنا بڑھ کر حالت اس بدنصیب انسان کی ہوگی جس کی آنکھیں زندگی بھر غفلت سے بند رہیں، اور پہلی بار اس وقت کھلیں گی، جب عمل کی مہلت بالکل ختم ہو چکے گی، اور اب وہ دیکھے گا کہ کوئی چیز بھی اُس کے دفتر عمل میں ایسی نہیں جو اس کے کام آسکے۔ کچھ ٹھکانا! کچھ اندازہ! اس کی حسرت وحرماں نصیبی کا ہوسکتا ہے؟

(۱۰۴۲:۲)

انما البیع مثل الربوا (۲۷۵:۲)

آج کل کے ''روشن خیالوں'' کی طرح عہد جاہلیت قدیم کے بھی سفیہوں کا کہنا تھا کہ مالی نفع آخر تجارت میں بھی تو ہوتا ہے۔ پھر جب تجارت حرام نہیں تو سود کیوں حرام ہو؟ ان نافہموں نے اسے بالکل نظر انداز کر دیا تھا کہ دونوں کی ایک سطح نہ اخلاقی حیثیت سے ہے نہ معاشی حیثیت سے، سود تو ایک متعین رقم بے کھٹکے ہر حال میں مہاجن کو ملتی رہتی ہے۔ برخلاف اس کے تجارت میں نفع ونقصان دونوں کے احتمالات ہر وقت لگے رہتے ہیں اور تاجر کو نقصان سے بچنے کے لئے وقت، محنت، ذہانت سب کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے، پھر تجارتی معاملت تو بروقت ختم ہو جاتی ہے برخلاف اس کے مدت اور مہلت کیساتھ سودخوار کے مطالبات کی میزان بھی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک اکثر اوقات قرضدار کی نوبت بالکل تباہ حالی اور بربادی کو پہنچ جاتی ہے۔

(۱۰۷۱:۲)

وقالت طائفة من اهل الكتاب الخ (۷۲:۳)

مدینہ ومضافاتِ مدینہ کے یہود کی چالیں عجیب عجیب رہتی تھیں۔ ایک بار تو آپس میں صلاح ومشورہ کے بعد یہ سوچا کہ ہم میں بعض صبح کے وقت صداقتِ اسلام کا اقرار کرلیا کریں اور پھر چند گھنٹوں کے بعد اس اقرار سے رجوع کرلیا کریں اور کہہ دیا کریں کہ غور وفکر اور مطالعہ توریت کے

بعد اس نئے دین کی تصدیق نہ ہوئی اس لئے ہم اس نئے دین سے نکل آئے۔ اہل عرب پر ہمارے علم واخلاق دونوں کی دھاک تو بیٹھی ہوئی ہے، لوگ کہیں گے آخر کوئی خرابی تو اس نئے دین میں ہے جو ایسے ایسے لوگ اس سے باہر نکل گئے، اور عجب نہیں کہ اس تدبیر سے کچھ پرانے مسلمان بھی اکھڑ جائیں۔

تاریخ یہود میں منافقت کی یہی ایک مثال نہیں، خود اُن کی کتابوں میں یہ واقعہ بہ صراحت درج ہے کہ بارھویں صدی عیسوی میں جب اسپین میں اسلامی حکومت تھی تو حکومت کے ''مظالم'' فرضی یا واقعی کی بناپر، بہت سے یہود نے اپنے رِبّیوں کی اجازت اور فتوی کے مطابق اپنے قبول اسلام کا اظہار شروع کر دیا تھا، درآنحالیکہ دل میں سب کے سب منکر ہی تھے۔ (جیوش انسائیکلو پیڈیا جلد اول ص: ۴۲۲،۴۲۳) اور آج یہ جو بڑے بڑے فرنگی ''محققین'' یہود مسیحی مستشرقین نے فرنگی زبانوں میں سیرت نبوی لکھنے کا یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اپنے علم وتحقیق، وسعتِ مشرب وبے تعصبی کی دھاک بٹھا کر تمہید بڑے زور کی اٹھاتے ہیں اور معلوم یہی ہونے لگتا ہے کہ ''پیغمبرِ عرب'' اور ''مصلح عالم'' کی نعت اور ''مقنن اعظم'' اور ''مثیل موسیٰ'' کی منقبت میں دریا کے دریا بہادیں گے، لیکن آگے چل کر نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) انھیں کچھ خلل دماغ سا تھا یا یہود ونصاریٰ کے مضامین کہیں سے سن سنا کر انھیں چرا لیتے تھے، وقس علیٰ ھٰذا، تو یہ بھی ٹھیک اسی قدیم دجل وتلبیس کا ایک جدید فرنگی نمونہ ہے اور بس!

(۱۶۵:۳)

سنلقی فی قلوب الذین الخ (۱۵۱:۳)

دشمنانِ دین کے دلوں میں القاءِ رعب یا ہیبتِ حق کے معجزانہ ظہور کی ایک مثال تاریخ کے صفحات میں یوں محفوظ ہے کہ معرکۂ احد میں جب فتح بظاہر مشرکین کو ہوگئی تو اب قدرتی نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ وہ لوگ وہیں سے شہر مدینہ پر چڑھ دوڑتے، فاصلہ اب رہ ہی کتنا گیا تھا؟ ۔۔۔۔ لیکن اس کی ہمت انھیں کسی طرح نہ پڑی بلکہ الٹے انھیں واپس ہی جاتے بنی۔ اور تعاقب اس کے برعکس خود ''شکست خوردہ'' مسلمانوں نے اپنے بے مثل وبے مثال سالارِ لشکر کے ماتحت مدینہ سے آٹھ میل

دور حمراء الاسد تک کیا، یہاں تین دن تک مسلمانوں کا کیمپ رہا اور لگے ہاتھوں غنیم کا ایک آدمی گرفتار کرتے لائے۔

(۲۹۵:۳)

تأمرون بالمعروف وتنهون.....(۱۱۰:۳)

آیت اس کے جزو میں امتِ اسلامی کے اعتقادی، اخلاقی اور عملی زندگی کے کامل ومکمل ہونے کا پورا نقشہ آ گیا، مطلب یہ ہوا کہ اے مسلمانو! تم اپنی ذمہ داری پوری طرح محسوس کرو، تم توحید کے امانت دار ہو، زمین پر اللہ کے نائب وخلیفہ ہو، بطور اس کی پولیس کے ہو، الٰہی قانون کے نفاذ وتحفظ کے لئے، دنیا کے نظامِ عدل کو برقرار رکھنے کے لئے بھیجے گئے ہو، تمہاری زندگی کا مشن ہی یہ ہے کہ حکومتِ الٰہیہ کو چلاؤ، نظامِ حق کے ایک ایک کل پرزہ کو درست رکھو اور نظامِ باطل کا زور چلنے ہی نہ دو۔

ظلم ہوتا اگر اس ذمہ دار فعال جماعت کو جدال وقتال کی آزادی کسی حال میں نہ ملتی، بلا اجازتِ جہاد، بلا اجازتِ اجراءِ حدود وتعزیرات، اس قوم پر ذمہ داری ڈال دینے کے معنٰی یہ ہوتے کہ ہاتھ پیر باندھ کر حکم دریا میں پھینکنے کا دیا جا رہا ہے۔۔۔۔ کیا تماشہ ہے کہ انگریز ہندوستان میں ستی کی رسم کو جرم قرار دیں تو وہ ملک کے محسن، ہندوؤں میں بچپن کی شادیوں کے دستور کو روک دیں تو اس کا شکریہ واجب، لیکن اللہ کے سپاہی اور مالک الملک کے پیارے اگر یہ حق حاصل کرنا چاہیں کہ قانونِ الٰہی سے بغاوت کرنے والوں اور امنِ عام کو غارت کر کے رکھ دینے والوں کی داروگیر کر دیں تو ''روشن خیال'' کے جبینِ تحمل پر شکن آ جائے، اور تہذیب کے پروپیگنڈسٹ اسے رواداری کے خلاف قرار دینے لگیں!

(۲۲۸:۳)

ولو كنت فظا غليظ القلب الخ (۱۵۹:۳)

حضور انور ﷺ کے حلم وتحمل، نرمی وخوش خوئی، شفقت وملائمت کے واقعات سے تو حدیث اور سیرت کی کتابیں بھر پڑی ہیں کوئی کہاں تک گنائے، اور یہ حقیقت تو خاص طور پر یاد رکھنے کے

قابل ہے کہ اپنی ذات کے لئے آپ نے کسی سے انتقام نہیں لیا، غیروں (اور غیر بھی کیسے، بعض معاندوں تک) کے دو ایک قول سننے کے قابل ہیں، لین پول نے کہا ہے

''ظلم محمد کی سرشت ہی میں نہ تھا''

اور باسورتھ اسمتھ کا بیان ہے

''انھوں نے عمر بھر کسی کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا، کوئی مصافحہ کرتا تو نہ وہ اپنا ہاتھ الگ کرنے میں سبقت کرتے نہ از خود اس سے الگ ہوتے، گفتگو بہت نرم و شیریں کرتے''

(۳۲۵:۳)

الرجال قوامون علی النساء (۳۴:۴)

روحانیت کی دنیا میں یعنی قربِ حق اور حسنِ عمل کے لحاظ سے مرد و عورت کی حیثیت بالکل مساوی ہے، نماز اور روزہ اور زکوٰۃ اور حج اور دوسری عبادتیں جس طرح مرد کی قبول ہو سکتی ہیں، وہی راہیں عورت کے لئے بھی کھلی ہوئی ہیں، اب یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ مرد و زن کی یہ مساوات دنیوی معاملات میں اور انتظامی حیثیت سے قائم نہیں، باپ اور بیٹے دونوں بہ حیثیت عبد بالکل ایک ہیں، عنداللہ اعمال کی مقبولیت کے معیار سے دونوں بالکل مساوی ہیں، لیکن دنیا میں شریعت ہی کا حکم ہے کہ باپ افسر ہو کر رہے، اور بیٹا ماتحت ہو کر، باپ حکم دے اور بیٹا حکم مانے۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ معاشرت کی انتظامی مشین میں مرد کو عورت پر غلبہ و تفوق حاصل ہے۔ بائبل نے عورت کو کیا درجہ دیا ہے اس کا اندازہ ذیل کی عبارتوں سے ہوگا

''خداوند خدا نے عورت سے کہا کہ اپنے خصم کی طرف تیرا شوق ہوگا، اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا'' (پیدائش ۳:۱۶)

''اے بیویو! اپنے شوہروں کی ایسی تابع رہو جیسے خداوند کی، کیوں کہ شوہر بیوی کا سر ہے، جیسے کہ مسیح کلیسا کا سر ہے، اور وہ خود بدن کا بچانے والا ہے

لیکن جیسے کلیسا مسیح کے تابع ہے، ایسے ہی بیویاں بھی ہر بات میں اپنے

شوہروں کے تابع ہوں'' (افسیون۔۵:۲۲:۲۴)

قرآن حق کا کلام ہے اور ہمیشہ حق ہی کہتا ہے، وہ کلیسا کی کونسلوں اور منوسمرتی کی طرح عورت کی تحقیر وتذلیل کا ہرگز قائل نہیں، لیکن ساتھ ہی اسے جاہلیتِ قدیم وجاہلیتِ جدید کی زن پرستی سے ہمدردی نہیں، وہ عورت کو ٹھیک وہی رتبہ ومقام دیتا ہے، جو نظام کائنات میں فاطرِ کائنات نے اسے دے رکھا ہے، بہ حیثیت ایک عبد اور مکلف مخلوق کے وہ مرد کے مساوی وہم مرتبہ ہے، لیکن دنیا کے انتظامی معاملات میں مرد کے ماتحت اور تابع ہے۔

(۱۱۴:۳)

فی سبیل اللہ ، وفی سبیل الطاغوت (۱۷۶:۴)

فی سبیل اللہ کی قید جو بار بار لگائی جارہی ہے، بے معنی نہیں، بہت ہی پُرمعنی ہے، درحقیقت یہ آیت سلسلۂ جہاد کی آیتوں میں سے ایک کلیدی آیت ہے، اس نے صاف صاف اسلامی جہاد کا فرق دنیا جہاں کی تمام جنگوں اور جاہلی محاربات سے واضح کردیا، اس نے وضاحت کے ساتھ بتادیا کہ سچا مسلمان جب اپنے ابنائے جنس پر ہاتھ اٹھائے گا تو توسیع ملک کے لئے نہیں، قومی تفوق کے لئے نہیں، تجارتی منڈیاں قائم کرنے کو نہیں، دوسرے کو نیچا دکھانے کو نہیں، دوسروں پر اپنی برتری ثابت کرنے کو نہیں، رشک وہوس اور جاہ پرستی کے جذبات سے متاثر ہوکر نہیں، بلکہ دنیا کے بلندترین مقصد، انسانیت کے برترین نصب العین، کلمہ توحید کی برتری اور سربلندی کے لیے رنگ اور نسل مرزبوں اور قوم، وطن اور قبیلہ کی عزت وحمیت پر کٹ مرنے والے، اسلامی نقطۂ نظر کی بلندی کو سمجھ بھی سمجھ سکتے ہیں؟ اسلامی جہاد جب تک اسلامی جہاد رہا، کیا وہاں بھی لشکر کے لئے ہزاروں من اور سیکڑوں ٹن شرابوں کی ضرورت پڑی؟ کیا اس لشکر میں بھی سوزاک اور آتشک کے سیکڑوں ہزاروں مریض سپاہیوں اور افسروں کے لئے امراض خبیثہ کے مخصوص اسپتالوں کا انتظام کرنا پڑا؟ مسلمان سپاہی کے سینہ میں تو یہ زندہ ایمان رہتا ہے کہ اُسے ایک ایک قدم کا حساب دینا ہے کبھی اس کا قدم ان

گندہ راستوں پر بھی پڑ سکتا ہے؟۔۔۔۔(برعکس[1] اس کے) طاغوت اور نفس کی راہ میں آج بھی جو قومیں وطن دوستی، قوم پروری، ملکی آزادی کے خوشنما لفظ اور لقب کے ساتھ جنگ کرتی رہتی ہیں، ان کی اخلاقی حالت کا جائزہ لے لیا جائے، شقاوت وسنگدلی، فریب وخیانت، شراب خواری وحرام کاری، غرض جس معیار سے چاہے جانچ لیا جائے، جانوروں اور درندوں سے بھی بدتر حالت نکلے گی، یہ سب کرشمے فی سبیل الطاغوت لڑنے کے ہیں، محاسبۂ آخرت سے بے نیاز ہوکر جنگ وجدال کرنے کے ہیں۔ نفس قتال دونوں میں مشترک ہے، لیکن آگے طاغوتیوں کو کوئی مناسبت لاہوتیوں سے نہیں رہ جاتی۔

(۲۱۵،۲۱۴:۳)

ولکن شبّہ لھم (۳۹۸:۴)

یہ عقیدہ نو ایجاد نہیں، خود مسیحیوں ہی کا ایک قدیم ترین فرقہ باسلیدیہ Basilides کے نام سے گزرا ہے (باقی بانیٔ فرقہ کا سال وفات ۱۴۰ء) وہ اسی عقیدہ کا قائل تھا اور کھلم کھلا کہتا تھا کہ مصلوب حضرت مسیح نہیں ہوئے، بلکہ شمعون کرینی ہوا ہے۔ قرآن مجید نے اسی عقیدہ کی تصویب کی طرف اشارہ کردیا ہے، لیکن پولوس (متوفی ۶۵ء) کے اثر سے جو مسیحیت چلی اور پھیلی، اس کی تو بنیاد ہی عقیدہ کفارہ پر ہے، یعنی اس عقیدہ پر کہ ابن اللہ نے یا خود خدا نے مجسم ہوکر اور صلیب پر جانکنی کی تکلیف اٹھاکر اور اپنی جان دے کر سب کی طرف سے مخلوق کے گناہوں کا کفارہ ادا کردیا، اس لئے یہ رواجی مسیحیت تو بغیر مصلوبیت مسیح کو مانے اور فرض کئے ہوئے ایک قدم بھی آگے نہیں چل سکتی، اس لئے لا محالہ اسی پولوسی اور کلیسائی مسیحیت نے کل قدیم صحیح العقیدہ مسیحی فرقوں کو، بدعتی، اور مبتدع، قرار دے کر کلیسا سے خارج کردیا، اور خود ہی کہنے لگے جو دشمنانِ عیسیٰ یعنی یہود پہلے ہی سے کہہ رہے تھے یعنی یہی کہ عیسیٰؑ کو موقع تحقیر واہانت میں بیان کرتے ہیں، اور مسیحی بعینہٖ اسی واقعہ سے آپ کی عظمت پر دلیل لاتے ہیں، لیکن نفس عقیدہ بہرحال دونوں میں مشترک ہے، اور بڑے تأسف اور قلق کا مقام ہے کہ آج بیسوی صدی عیسوی میں بعض کلمہ گو فرقے بھی اسی گمراہی کی طرف واپس کئے جارہے ہیں

---

[1] قوسین کے الفاظ الصاقِ مضمون کے لیے مرتب کی جانب سے اضافہ کردہ ہیں

اور طرفہ یہ ہے کہ وفاتِ مسیح کے اس باطل اور خلافِ تحقیق عقیدہ کو ''روشن خیالی'' کا تمغہ اور تحقیق کا پروانہ سمجھ رہے ہیں!

(۳۹۸:۳)

ومن احسن من اللہ الخ (۵۰:۵)

شریعت الٰہی سے بڑھکر عادلانہ وحکیمانہ صحیح ومناسب قانون اور کون ہوسکتا ہے؟ لیکن اتنی موٹی سی بات بھی محسوس وہی کرتے ہیں جن کی عقلیں شرک والحاد کے زنگ سے صاف اور ایمان وایقان کی روشنی سے منور ہوتی ہیں بڑی حیرت اور بڑی حیرت کے قابل آج کی ان آزاد ''مسلم'' قوموں کی حالت ہے، جو فرنگی قوموں کے اثر سے طلاق، خلع، تعدد ازواج، ترکہ وغیرہ معاملات و فقہیات کے متعدد شعبوں میں فرنگی قانون کو دھڑا دھڑ اپناتے چلے جاتے ہیں، اور جوش تقلید فرنگ میں ان شدید مفاسد کو بھی نظر کے سامنے نہیں لاتے جو ان بشری اور محدود دماغوں سے نکلے ہوئے قوانین کے نفاذ سے معاشرے میں پیدا ہو جانے لازمی ہیں، یورپ اور امریکہ کی صنفی انارکی اور خانگی ابتری کو دیکھ کر مسلمان بجائے اس کے کہ فرنگیت سے بچتے اور جھجکتے، الٹے خود اس کے خیر مقدم کے لئے بیتاب رہنے لگی، عدمِ توازن اور معاشرہ میں اختلال وانتشار انسان کی خود ساختہ شریعت پر چلنے کا وہ لازمی نتیجہ ہے، جس سے مفر کی کوئی صورت ہی نہیں۔

(۱۸۹:۵)

اتخذوا دینھم لعبا ولھوا (۷۰:۶)

ایسے کون ہیں جنہوں نے اسلام کو نہیں، خود اپنے دین کو لہو ولعب یا مشغلۂ تفریح بنالیا ہے؟ دین کو بھلا کوئی قوم بھی مشغلۂ تفریح بنا سکتی ہے؟ مفسرین کو اسی لئے یہاں دین کو متعین کرنے میں دقت پیش آئی ہے حالانکہ ہندی مسلمان اپنے گرد وپیش جو کچھ دیکھ رہا ہے اس کے بعد کوئی دشواری باقی ہی نہیں رہتی۔ یہ ہولی جیسے مقدس تہوار کو محض ناچ اور رنگ، فحش گوئی وشراب نوشی کا جلسہ بنالینا، یہ دیوالی جیسے یادگار تہوار کو جوئے اور روشنی کا مستقل تماشہ بنالینا یا یہ دسہرہ کی حیثیت محض ایک سوانگ اور

نانک کی رکھ دینا، یہ ''بڑے دن'' (کرسمس) کے پاک دن کو شراب نوشیوں اور بدمستیوں کے لئے وقف کر دینا، یہ ''نوروز'' کے شاہانہ جلسے، یہ سب مثالیں اور نظیریں اگر دین کو لہو ولعب اور مشغلۂ تفریح بنا لینے کی نہیں تو اور کیا ہے؟۔۔۔عبرت کے ساتھ ہمارے اہلِ اعراس غور کریں کہ خود اُن کے عرس بھی جو بدعات اور منکرات کا مجموعہ ہوتے ہیں، کہیں اس وعید کے تحت میں تو نہیں آ جاتے ہیں؟؟

(۱۰۴:۶)

لا تدرکه الابصار (۱۰۳:۶)

الفاظ پر یہ شبہ کیا گیا ہے کہ جب انسانی آنکھیں حق تعالیٰ کی دید کر ہی نہیں سکتی تو پھر جنت میں اس کی رؤیت مؤمنین کو کیسے ہوگی؟ نیز معراج میں رسول اللہ ﷺ کو کیسے ہوئی؟ مفسرین ومحققین نے اس شبہ کو نقل کر کے مفصل وشافی جوابات دیئے ہیں لیکن اس کم فہم کے نزدیک ایک مختصر اور سیدھی سی بات یہ ہے کہ یہاں تو ذکر اسی مادی وناسوتی دنیا کے قُویٰ کا ہے۔ جنت میں قویٰ ہی دوسرے ہوں گے۔ عالمِ ناسوت میں نفی دیدار سے جنت کے دیدار کو تعلق ہی کیا؟ علیٰ ھٰذا واقعۂ معراج میں رسول اللہ ﷺ کو زیارتِ حق کا تعلق ہی ان قوائے ناسوتی سے بالکل نہیں۔ وہ واقعہ تو خود ہی عالمِ آخرت کا ہے۔ جس کا تجربہ ومشاہدہ بہ طورِ معجزہ کے رسول اللہ ﷺ کو اسی دنیا میں کرا دیا گیا۔

(۱۵۱:۶)

وذروا ظاهر الاثم وباطنة (۶: ۱۲۰)

جاہلی تہذیبوں میں فسق ومعصیت کی بہت سی صورتیں ایسی ہیں کہ بجائے خود وہ ذرا بھی معیوب نہیں۔ صرف ان کا کھل جانا گناہ ہے۔ یونانِ قدیم میں چوری بجائے خود کوئی جرم نہ تھی۔ چوری کا کھل جانا جرم تھا۔ آج فرنگی تہذیب میں حرام کاری بجائے خود کوئی عیب نہیں، صرف اس کا منظرِ عام پر آ جانا، عام رسوائی وتفضیح کا سبب بن جانا صرف یہ جرم ہے۔۔۔عرب کی جاہلی تہذیب میں بھی حرام کاری بجائے خود جائز تھی۔ صرف اس کا افشاء جرم تھا۔ یہ خصوصیت اسلام ہی کی ہے کہ اس نے پوشیدہ وعلانیہ ہر حرام کاری کو جرم ہی قرار دیا۔

(۱۷۴:۶)

زین لکثیر من المشرکین..... (۱۳۷:۶)

مفسرین کا خیال آیت کے الفاظ سے عرب جاہل کی رسم دخترکشی کی طرف گیا ہے، یہ بھی ممکن ہے۔لیکن زیادہ لگتی ہوئی بات یہ ہے کہ اس مقام پر اشارہ دخترکشی کی جانب نہیں، بلکہ عام اولاد کشی کی جانب ہے۔۔۔۔غریب مفسرین کو کیا خبر کہ بڑی بڑی ''مہذب وشائستہ'' لیکن جاہلی مشرک قوموں میں کیسی کیسی ظالمانہ ووحشیانہ رسمیں موجود رہ چکی ہیں !اولاد کو دیوتاؤں کے استھانوں پر بے تکلف بھینٹ چڑھانے کا دستور سامی قوموں میں عام رہا ہے اور خود ہندوستان میں مدتوں یہ رسم رہی ہے کہ بچوں کو گنگا مائی کی موجوں کے آغوش میں ڈال دیا جاتا تھا کہ گھڑیال اور مگرمچھ انہیں نگل لیں اور ان آبی درندوں میں الوہیت کی شان پیدا ہو جائے۔

(۲۰۳:۶)

سیقول الذین اشرکوا الخ (۱۴۸:۶)

خلاصہ اہل شرک وضلالت کے اس استدلال کا یہ ہے کہ خدا جب ہر چیز پر قادر ہے، اور باوجود قدرت اس نے ہمیں شرک وتحریم حلال سے طبعًا وتکوینًا نہ روک دیا تو اس سے یہ معلوم ہوا کہ شرک وتحریم حلال اسے ناپسند ہی نہیں بلکہ اس کی عین مرضی سے ہو رہے ہیں۔مغالطہ استدلال کے اندر یہ ہے کہ مشیتِ تکوینی، اور پسند ورضا کو مرادف سمجھ لیا گیا ہے۔حالانکہ رضائے الٰہی تشریعی کا قانون دوسرا ہے۔اور مشیتِ الٰہی تکوینی کا دوسرا۔دونوں ہی اپنی جگہ کارفرما ہیں۔دونوں کے درمیان کوئی تصادم وتزاحم نہیں۔قانونِ مشیت نے انسان کو آزادی ہر طرح کی دے رکھی ہے۔انسان اپنے طریق عمل کے انتخاب میں آزاد ہے۔وہ اپنے ارادہ کا مالک ومختار ہے۔اچھی وبری جو راہ چاہے، اپنی پسند وقصد سے اختیار کرے، لیکن رضائے الٰہی کا حکم یہ ہے کہ وہ بدی کی راہ سے بچے اور نیکی کی راہ پر چلے ۔۔۔۔بہ حیثیت خالق وقادرِ مطلق اُس نے پیدا از ہر کو بھی کر رکھا ہے اور بیماری کو بھی، لیکن بہ حیثیت حاکم وآمر اس کا حکم یہی ہے کہ بیماری کا علاج کیا جائے اور زہر کا توڑ تریاق سے کیا جائے۔جو کج فہم

خدا کی قدرت اور اپنی مجبوری کو اپنی بے دینی اور بدکرداری کے لئے حیلہ وآڑ بناتے ہیں، وہ آخر بیماری میں اپنا علاج کیوں کرتے ہیں؟ اور روحانیات کی طرح جسمانیات کے ہر آزار میں اپنے کو معذور و مجبور کیوں نہیں سمجھتے؟

(۲۲۵:۶)

ولا تقربوا الفواحش ما.....(۱۵۱:۶)

بے حجابی، لباس میں بے ستری وغیرہ کی تمام خفی صورتیں خواہ پبلک میں ہوں یا پرائیوٹ ہوں، یکساں حرام قرار پا گئیں، چہرے پر پاؤڈر، لپ اسٹک وغیرہ لگا کر، بن سنور کر، نیم برہنہ لباس پہن کر، خوشبوئیں لگا کر، عورتوں کا آزادی کے ساتھ بے تکلف باہر نکلنا، مردوں کے مجمع میں چلنا پھرنا، سینما اور تھیٹر میں گندے نظاروں سے لطف اندوز ہونا، آرٹ گیلری میں برہنہ تصویریں دیکھنا، غرض تہذیب جدید کے سارے جاہلی عنصر اس آیت کی رو سے حرام ٹھہر جاتے ہیں. اخلاق کی پاکیزگی، اور پاکیزہ خیال جو فرد و جماعت دونوں کی حقیقی ترقی کا زینہ ہے. اس کی نظیر شریعتِ اسلام نے قائم کردی ہے وہ کہیں اور تلاش سے بھی نہ ملے گی۔

(۲۲۳:۶)

قل تعالوا اتل ما حرم ربکم علیکم الخ(۱۵۱:۶)

قرآن مجید کی متعدد آیات ایسی ملتی ہیں جو تہذیب فرنگ کی پھیلائی ہوئی فضائے حاضر پر خاص طور سے چسپاں ہیں، لیکن یہ آیت ان خاص آیتوں میں بھی خاص ہے. آیت کے ایک ایک جزو کو غور سے دیکھئے :-

(۱) ممانعتِ شرک۔ آج کے ''روشن خیال'' کتنے مختلف قسموں کے شرک میں مبتلا رہتے ہیں، اُن کی تہذیب اور ان کے علوم کی بنیاد ہی ترکِ توحید پر ہے.

(۲) تعظیمِ والدین۔ اخلاقیات جدید میں والدین کے ساتھ حسنِ کی کوئی دفعہ ہی نہیں۔

(۳) اولاد کشی سے ممانعت۔ ''منعِ حمل''، ''ضبطِ تولید'' وغیرہ تو تمدنِ جدید کے خاص مفاخرین میں سے ہیں۔ وہ بھی معاشیات کا نقاب منہ پر ڈالے ہوئے۔

(۴) منعِ فواحش۔ تمدن جدید کی تو ساری رونق ہی علانیہ ومخفی فواحش کی گرم بازاری سے ہے۔

(۵) انسانی زندگی کا احترام۔ اس ہدایت پر عمل کہیں ہوتا تو جنگِ چین وجاپان، جنگِ جرمنی وفرانس، جنگِ جرمنی وبرطانیہ، جنگِ جرمنی وروس وغیرہ کا وجود ہی سرے سے نہ ہوا ہوتا۔ اور دنیا کو ناقابلِ پیمائش مصیبتوں سے نجات مل گئی ہوتی۔

کاش اب بھی ہماری آنکھیں کھلیں، اور دنیا کی سمجھ میں آئے کہ قرآن نسخہ شفا صرف چھٹی اور ساتویں صدی مسیحی کے عرب کے لئے نہیں بلکہ بیسویں صدی اور اکیسوی اور ہر مابعد صدی کی کل دنیا کے لئے ہے!

(۲۳۶:۶)

قال انا خیر منہ الخ (۱۲:۷)

ابلیس کے اس دعوٰی اور دلیل کو منطقی شکل میں اگر مرتب کیا جائے تو مقدمات اور نتائج کی صورت حسبِ ذیل ہوگی۔

(۱) آگ خاک سے افضل ہے۔

(۲) افضل غیر افضل کے آگے نہیں جھک سکتی، اور پھر افضل کی فرع بھی غیر افضل کی فرع کے آگے نہیں جھک سکتی، میں فرع ہوں آگ کی، اور آدم فرع ہیں خاک کی۔ اس لئے میں آدم کے آگے جھک نہیں سکتا۔ ابلیس کو اپنی عقل وذہانت پر بہت ناز ہے، لیکن یہ استدلال تو مغالطوں کی ایک پوٹ ہے۔ اول تو یہ بنیادی دعوٰی ہی غلط ہے کہ آگ، خاک سے افضل ہے، آگ اور خاک دونوں کے الگ الگ خصوصیات ہیں، کسی لحاظ سے یہ افضل، کسی اعتبار سے وہ۔ پھر یہ دعوٰی بھی تمام تر باطل ہے کہ ہمیشہ غیر افضل ہی کو افضل کے آگے جھکنا چاہیے۔ بہت سے موقع اعلٰی کے لئے بھی ادنٰی کے آگے جھکنے کے ہوتے ہیں، اور پھر یہ مفروضہ تو اور بھی مہمل ہے کہ افضل کی فرع ہر حال میں غیر افضل کی

فرع سے افضل ہی ہوتی ہے، ابلیس اب نافرمانی وکفر کر چکا تھا اور کافر و نافرمان کی عقل میں نورانیت کہاں، وہ تو تمام تر ظلمات سے بھر جاتی ہے۔

(۱۵ :۷)

ائت بقران غیر ھٰذاالخ (۱۰:۱۵،۱۶)

آپؐ ہی کو جاہلیت عرب کے بڑے بڑے ''روشن خیال'' جاہلیتِ فرنگ کے ''روشن خیالوں'' کی طرح قرآن کا مصنف خیال کرتے تھے اور اس لئے قدرۃً فرمائش بھی آپؐ ہی سے کرتے تھے کہ یا تو اپنی کوئی دوسری تصنیف سنایئے یا کم از کم اسی تصنیف میں ہمارے نقطۂ نظر سے مناسب کانٹ چھانٹ کر دیجئے۔۔۔۔ ''روشن خیال'' عرب کی اسی فرمائشی ترمیم کے جواب میں رسول اللہ ﷺ کے جواب کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے۔

(۱) اپنی عمر کے ۴۰، ۵۰ سال تمہاری آنکھوں کے سامنے گزار چکا ہوں۔ میرے تدین، راست بازی، صداقت شعاری پر تم سب گواہ ہو کبھی کسی خفیف معاملہ میں بھی کذب وافتراء سے مجھے کام لیتے تم نے دیکھا یا سنا ہے؟ پھر جب یہ نہیں تو اتنے بڑے افتراء کی کہ اپنے کلام کو خدا کا کلام کہکر پکاروں، آخر مجھے جرأت ہو ہی کیوں کر سکتی ہے؟ تمہاری عقلیں اس احتمال ہی کو کیسے تسلیم کر رہی ہیں؟

(۲) تمہارے درمیان اپنی عمر کا اتنا بڑا حصہ میں گزار چکا۔ میری ایک ایک خُو سے تم واقف ہو چکے۔ میری بولی، میرے اندازِ کلام کو تم خوب اچھی طرح جان چکے، پہچان چکے۔ تمہیں قرآن میں اور میرے کلام میں کوئی فرق نظر نہیں آتا؟ میں چاہوں بھی تو قرآن جیسے ممتنع النظیر کلام پر کب قادر ہو سکتا ہوں؟ اب تک میرا کوئی کلام اس ٹکر کا جب نہ ہوا، تو آج کیسے ہوا جا رہا ہے۔؟ قران کا یہ استدلال اپنے کلام الٰہی ہونے پر پورا وزن دار اُس وقت بھی تھا۔ پھر جس وقت سے احادیثِ رسول مدوّن ہو گئیں اُس وقت سے تو اس دلیل میں اور زیادہ جان پڑ گئی ہے۔ حدیثوں کے چھوٹے بڑے مجموعے ایک دو کی نہیں، بیسوں کی تعداد میں آج سے نہیں صدیوں سے شائع چلے آ رہے ہیں۔ کیا عقل کے اندھوں کو اتنا نظر نہیں آتا کہ جو زبان بخاری، مسلم، ترمذی وغیرہ کی ہے قرآن کی ہے یا

ہوسکتی ہے؟ زبان، اندازِ بیان، اسلوبِ کلام، نوعیتِ تراکیب کا اتنا نمایاں وواضح فرق بھی کیا شام، مصر فلسطین، عراق وغیرہ کے اہل زبان یہود اور نصرانیوں کو نہیں سمجھائی دیتا؟

(۳۰:۳۸)

متاع فی الدنیا (۱۰:۷۰)

متاع فی الدنیا کہکر قرآن مجید نے منکر ومکذب قوموں کی بالکل صحیح تصویر کھینچ دی ہے تفصیل کے لئے مطالعہ ہوروس اور امریکہ اور برطانیہ اور بڑی بڑی مہذب ''ترقی یافتہ'' ''اقبال مند'' قوموں کا حال۔۔۔ان کے آپس کے رشک وحسد کا حال، ان کی حرام کاریوں کا حال، ان کی شراب نوشیوں کا حال، ان کی سود خواریوں کا حال، ان کے جرائم کا حال، ان کے ہاں کے امراضِ خبیثہ کا حال ان کے ہاں کے اسٹرائیکوں اور ہڑتالوں کا حال، ان کے ہاں کے کثرتِ طلاق اور کثرتِ فواحش کا حال، ان کے ہاں کی معاشی ابتری اور بیروزگاری کا حال اور پھر فیصلہ کیجئے کہ متاع فی الدنیا کا زیادہ سے زیادہ ذخیرہ رکھنے کے بعد بھی ان منکرین حق کو باوجود اپنی انتہائی ''ترقیوں'' کے فلاح کسی معنی میں بھی حاصل ہے؟ اور آج جو کج فہم ''ہمدردانِ قوم'' قوم وملت کو انہی ''ترقی یافتہ قوموں'' کی روش پر چلانا چاہتے ہیں. وہ ملت کو فلاح کی جنت کی طرف لئے جارہے ہیں یا دنیا ہی میں دوزخ کے عذاب کی طرف؟۔۔۔قرآن مجید تو ہر جگہ اور بار بار یہی بتا رہا ہے اور ہمارے مشاہدہ سے اس کی تصدیق کرا رہا ہے کہ جو قومیں ایمان صحیح اور تقوی سے عاری ہیں وہ عیشِ ابدی سے تو خیر محروم ہی ہیں دنیا میں بھی ان کا تنعم محض ظاہری وسطحی ہوتا ہے. اندر سے بالکل کھوکلا!

(۱۰۴:۱۰)

فلما رأینہ اکبرنہ وقطّعن ایدھن الخ (۳۱:۱۲)

ہوسکتا ہے کہ یہ کوئی معجزۂ یوسفی ہو جیسا کہ بعض کا قول نقل ہوا ہے لیکن حالاتِ طبعی کا تقاضہ بھی تو کچھ ایسا ہی تھا اور اس کے لئے مجلس کا نقشہ ذرا وضاحت کے ساتھ پیشِ نظر کر لیجئے. دعوت اور

ضیافت کا اہتمام شاہی پیمانہ پر ہے۔ میزبان وزیرِ سلطنت کی بانوئے محترم ہیں۔ عشوہ وناز سے لبریز وزیرزادیاں امیرزادیاں جمع ہیں میووں پھلوں سے شغل ہورہا ہے۔ چھری سے کاٹنے کے رواج سے یوں بھی مصری تمدن ناآشنا نہ تھا اور اس وقت تو دور ہی میووں اور پھلوں کا چل رہا ہے۔ ہاتھوں میں چھریاں ہیں گپ شپ ہورہی ہے یک بیک ایک ڈرامائی انداز سے ایک نور پیکر سامنے لے آیا جاتا ہے۔ نظریں نیچی، آنکھوں پر حیا کے پردے، چہرے پر عصمت کے مہرے، جن کے چہرے اس وقت تک خود ہی سب کو دعوت نظارہ دینے کی عادی تھے وہ آپ اس وقت تماشائی بنی ہوئی اس حسن وجمال عصمت وعفاف کے پتلے کے نظارہ میں محو! اور وہ نہ کسی کی طرف نظر اٹھاتا ہے نہ کسی سے دلچسپی لیتا ہے۔ ایسے میں عجب کیا جو ٹکٹکی لگ گئی ہو اور پلک جھپکانا تک بارہورہا ہو اور چھریاں بجائے پھلوں کے ہاتھوں کی جلد پر چل گئی ہوں!

(۵۹:۱۲)

فلا تضربوا لله الامثال (۷۴:۱۶)

مشرکین کا ایک مایۂ ناز استدلال اس وقت یہی تھا، اور اب بھی ہے کہ آخر دنیا کے بادشاہوں کی خدمت میں براہِ راست عرض ومعروض کون کرسکتا ہے۔ درمیانی واسطوں کی، عرض بیگیوں کی، امیروں وزیروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ پھر جو سب سلاطین کا سلطان اور شہنشاہِ اعظم ہے، اس سے براہِ راست اور بلاواسطہ تعلق پیدا کرنا کیوں کر ممکن ہے؟ اور ہم جو ان مورتیوں کی اور ان ستاروں کی پرستش کرتے ہیں، تو وہ بھی اسی لئے کہ وہ رب الارباب کے خادم اور اُس کے ہاں کے مقرب ہیں۔

استدلال کی خرافت بالکل ظاہر ہے۔ دنیا کا بڑے سے بڑا بادشاہ بھی آخر انسان ہی ہوتا ہے، بشری ہی کے سے محدود ونا قص قوی رکھتا ہے۔ وہ تو اس پر مجبور ہے کہ دوسروں کی اعانت حاصل کرے۔ اس کے برخلاف کہاں رب العلمین، جو ہر قید سے ماورا، ہر اعتبار سے غیر محدود، ہر حدود سے برتر ہے، دونوں کا کوئی مقابلہ ہے؟ دونوں کے درمیان کوئی نسبت ہے؟ اس بے نیاز ہستی کو محتاج

ہستیوں پر کسی طرح قیاس کیا جاسکتا ہے؟ مغالطۂ قیاس مع الفارق کی اس سے زیادہ کھلی ہوئی مثال اور کیا ہوسکتی ہے؟

(۱۱۳:۱۶)

ای الفریقین خیر مقاما الخ (۱۹ :۷۳)

یہ جاہلی استدلال جس زور وشور سے پیش کیا جارہا ہے، پیشتر شاید کبھی نہ ہوا ہو صرف اہل باطل ہی نہیں، بلکہ ان سے مرعوب بہت سے مسلمان بھی مسیحی قوموں، مشرک قوموں، لامذہب قوموں کی مثالیں پیش کرکر کے پکار پکار کر مسلمانوں سے کہہ رہے ہیں کہ ان کی ترقیاں دیکھو ان کی دولت، حکومت، عظمت، جاہ وثروت دیکھو، ان کی اقبال مندی پر نظر کرو اور تم اگر اپنی ترقی اور رفاہ چاہتے ہو تو انہیں کے طریقے اختیار کرو، انہیں کی روش پر چلو اور وہی کرو جو یہ ''ترقی یافتہ'' ''اقبال مند'' قومیں کررہی ہیں ــــ ''ترقی وفلاح'' نام ہی انہیں دنیا پرست قوموں کی تقلید کا ہے! ــــ جواب ملتا ہے کہ یہ ظاہری ساز وسامان، یہ دولت، یہ زرق وبرق لباس تہذیب وتمدن ہی اگر دلیل حقانیت وثبوت صداقت ہوتا تو آخر بڑی بڑی پُر شوکت، پُر قوت، پُر ثروت، نافرمان قومیں کیوں غارت ہوگئیں؟ بابل وکلدانیہ کا تمدن کیا ہوگیا؟ اہرام مصر والی عمارتیں کیوں زمین کے برابر ہوگئیں؟ شاہانِ عجم کا کروفر کیا ہوا؟ یونانیوں کا دم خم کہاں چلا گیا؟ قیصر وکسریٰ کے تاج وتخت کیوں تاراج ہوکر رہے؟

(۱۰۸،۱۰۷:۱۹)

الذین ان مکنّاھم فی الارض الخ (۴۱:۲۲)

یہ ہے اصلی اور سچی تصویر اسلامی طرز حکومت کی. گورنمنٹ اگر مسلمانوں، سچے مسلمانوں کی قائم ہوجائے تو مسجدیں آباد وپُر رونق ہوجائیں. ہر طرف سے صدائیں تکبیر وتہلیل کی گونجا کریں. بیت المال کے بعد کوئی ننگا بھوکا نہ رہ جانے پائے. عدالتوں میں انصاف بکنے کے بجائے ملنے لگے. رشوت، جعلسازی، دروغ حلفی کا بازار سرد پڑ جائے. امیر کو کوئی حق، کوئی موقع، غریب کی تحقیر کا، ایذا

رسانی کا باقی نہ رہ جائے۔ غیبتیں، بدکاریاں، چوریاں، ڈاکے خواب وخیال ہو جائیں۔ آب کاری کے محکمہ کو کوئی پانی دینے والا بھی نہ رہے۔ مہاجنی کوٹھیوں، سودخوار ساہوکاروں، بینکوں کے ٹاٹ الٹ جائیں۔ گویے، نچنئے اگر تائب نہ ہوں، شہر بدر کر دیئے جائیں۔ سینما، تھیٹر، تمام شہوانی تماشا گاہوں کے پردوں کو آگ لگادی جائے۔ گندہ، فحش، افسانہ وشاعری کی جگہ صالح وپاکیزہ ادبیات لے لیں۔ غرض یہ کہ یہ دنیا، دنیا رہ کر بھی نمونۂ جنت بن جائے۔

(۷۷:۲۲)

غلبت الروم ..... فی بضع سنین (۳۰:۲،۴)

آیت کا زمانہ نزول ۶ یا ۷ ق ہجرت ہے یعنی ۶۱۵ء یا ۶۱۶ء۔ عین قریبی زمانہ یعنی ۶۱۴ء میں مسیحی رومیوں کو مجوس ایران کے مقابلہ میں سخت ہزیمت اٹھانا پڑی تھی۔ مجوس ایران کا مذہب چونکہ مشرکینِ عرب سے ملتا جلتا تھا اور وہ لوگ بھی نبوت ورسالت کے قائل نہ تھے اس لئے قدرۃً اہل مکہ اُن کی فتح کو اپنے نیم ہم مذہبوں کی فتح سمجھے اور بڑے خوش ہوئے اور آپس میں چرچے ہونے لگے کہ جیسے دیوتاؤں اور اوتاروں کے قائل ایران نے کتاب ونبوت کے قائل رومیوں پر فتح پالی ہے، ہم بھی اس کتاب اور رسول والے نئے دین (اسلام) کے مقابلہ میں فتح پائیں گے۔ مسلمانوں کی ہمدردی قدرۃً رومی مسیحیوں کے ساتھ تھی کہ بہرحال وہ سلسلۂ وحی اور کتاب آسمانی کے قائل تھے -- گویا قرآن نے دعوے کے ساتھ ہی پیش گوئی یہ کر دی کہ اس نتیجۂ جنگ پر خوش نہ ہو، نو سال کی قلیل مدت کے اندر ہی اندر پانسہ پلٹنے کو ہے اور آج جو فاتح نظر آرہے ہیں وہ مفتوح ہو کر رہیں گے یہ پیش گوئی وقت کی جنگی صورتِ حال کے بالکل منافی تھی خسروئے روم شہنشاہِ ایران کی اقبال مندی اوج پر تھی۔ ہرقل فرمانروائے روم کا عہد حکومت اس وقت بے تدبیری، بداقبالی کا ایک مجسمہ تھا۔ افسرانِ فوج نااہل، خزانہ خالی، دلیر ودلاور سپاہ کا قحط، غرض ظاہری حالات واسباب تمام تر مخالف ہی تھے۔ اور بڑے سے بڑے مبصرِ جنگ کی بھی پیش بینیاں وپیش قیاسیاں رومیوں کے مخالف ہی جارہی تھی کہ یک بیک ۶۲۲ء میں ہرقل سنبھلا۔ اور بجائے مدافعانہ جنگ کے اب جارحانہ جنگ

ایران کے مقابلہ میں شروع کردی. ایران کی قسمت دیکھتے ہی دیکھتے پلٹی. اور ۶۲۴ء میں اس کی قوت بالکل ٹوٹ کر رہ گئی. یہاں تک کہ ایرانیوں کے مقدس ترین آتشکدے برباد ہونے لگے. اور خود شہنشاہ کو بھاگنا پڑا۔

(۳۰:۴)

وما کان لمؤمن ولا مؤمنۃ الخ (۳۳:۳۶،۳۷)

زینب بنت جحش خاندان بنی اسد سے رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی زاد بہن تھیں. حسن صورت میں ممتاز، لیکن ساتھ ہی مزاج کی بھی تیز، آپؐ نے ان کا نکاح زید بن حارثہ صحابیؓ سے کردینا چاہا. اور وہ رسول اللہ ﷺ کے محبوبِ خصوصی تھے. یہاں تک کہ مدتوں عوام میں زید بن محمد کر کے مشہور رہے، لیکن ایک زمانہ میں نصرانی غلام رہ چکے تھے. اور پھر صورت کے لحاظ سے بھی کچھ ممتاز نہ تھے. زینبؓ اور ان کے بھائی کو اپنے شرف ونسب کی بنا پر، نکاح ان آزادشدہ غلام کے ساتھ پسند نہ آیا، تأمل کرنے لگے. اس پر یہ آیت نازل ہوئی، کہ جب رسول اللہ ﷺ ایک امر کا فیصلہ کر چکے تو اب کسی امتی کو چون وچرا کی گنجائش کہاں باقی رہی. آیت کی تنبیہ شدید سن کر حضرت زینبؓ نے نکاح، انہیں زید بن حارثہ کے ساتھ منظور کرلیا. حضرت زینبؓ آخر ان شوہر کو بھی راضی نہ رکھ سکیں، حضرت زید نے طلاق دینے کا فیصلہ کرلیا. رسول اللہ ﷺ نے آپ کو فہمائش کی کہ جہاں تک بن پڑے نباہ کرو ۔۔۔۔ جب شکایتیں اور رنجشیں حد سے زیادہ بڑھ گئیں اور آپ کو خواہ وحی سے خواہ قرائن سے خواہ خود دونوں سے یقین ہوگیا کہ اب یہ تعلق ازدواج نبھ نہیں سکتا، تو قدرۃً آپ کو بڑی فکر اس کی پیدا ہوئی کہ اب آئندہ کے لئے انتظام کیا ہو! زینب کی ایک دل شکنی تو پہلے ہو ہی چکی تھی، جب ان کا عقد اُن کی عالی نسبی کے باوجود ایک آزادشدہ غلام سے کرایا گیا تھا. دوسرا داغ اس سے بڑھ کر اُن کی عزت عرفی اور نیک نامی پر یہ لگ رہا تھا کہ نباہ ان آزادشدہ غلام کے ساتھ بھی نہ ہوسکا! طلاق ان سے بھی مل رہی ہے اور اب ساری زندگی ایک آزادشدہ غلام کی مطلقہ ہی کہلا کر بسر کرنا ہوگی! یہ ننگ درننگ جس قدر شاق ہوا ہوگا ظاہر ہے اس موقع پر اشک شوئی اور دل شکنی کے تدارک کی صورت یہی تھی کہ

سردارِ اعظمؐ زینبؓ کو خود اپنے عقدِ نکاح میں لا کر اُن کی دل جوئی اور قدر افزائی کریں۔ ساتھ ہی یہ خیال بھی تھا کہ قومِ عرب جو منہ بولے بیٹے کے ساتھ نکاح کو اتنا معیوب سمجھ رہی ہے وہ کیا کہے گی۔ آپ اسی فکر و تردد میں تھے کہ حکمِ الٰہی ملا، طعنِ مخلوق سے بے پرواہ ہو کر نکاح کر لیجیے۔ زینبؓ کی اشک شوئی و دل دہی جو تھی، وہ تھی ہی، اصلاحِ عامہ کی طرف بھی کتنا بڑا اقدام اس طرح اٹھ گیا کہ متبنّٰی کی زوجہ سے نکاح کا جواز خود فعلِ رسول سے ثابت ہو گیا۔

(۸۰،۷۹،۷۶:۳۳)

انما اعظکم بواحدۃ الخ (۳۴: ۴۶)

یعنی آؤ تمہیں اپنے دعویٔ رسالت کی جانچ کا ایک آسان سا طریقہ بتاؤں۔ تم اخلاصِ نیت کے ساتھ خدا کو حاضر و ناظر جان کر، انفراداً بھی اور مجتمعاً بھی سوچو، کہ میں جو تمہارے درمیان ہر وقت رہتا ہوں، جو ایسے بڑے بڑے دعوے کرنے لگا ہوں کہ دیوی دیوتاؤں کا وجود باطل ہے، معبود صرف ایک ہے، یومِ حشر کی آمد برحق ہے۔ جب میری دعوتِ اسلام کا محرک نہ حبِ مال و جاہ ہے، اور نہ اس کے تحت میں کوئی جنون یا خللِ دماغی کارفرما ہے، تو اب بجز خالص حق و حقانیت کے اور باقی کیا رہ جاتا ہے ۔۔۔۔ یہی معیار آج بھی زندہ و قائم ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے حالات و سوانح تو تاریخ کا ایک اہم جزو ہیں۔ اور اُن کی روشنی میں آج بھی یہی سوال قائم کر کے جواب بعینہٖ یہی حاصل کیا جا سکتا ہے؟

(۶۵،۶۴:۳۳)

علیہُ اللّٰہ (۱۰:۴۸)

ایک انگریز نے اپنی عربی دانی کے غلط زعم میں اس اعراب پر اعتراض کر کے کہا کہ اسے قاعدہ سے بجائے علیہُ کے علیہِ ہونا چاہیے۔ پرچہ ''صدق'' میں اس کے متعدد شافی جوابات مختلف اہلِ علم کے قلم سے درج ہو چکے ہیں۔ لیکن ایک اصولی سوال ہے کہ خود اعتراض ہی کی بنیاد کیا ہے؟ یہی نا کہ ''خلافِ قاعدہ''؟ لیکن خود ''قاعدہ'' کہاں سے بنا ہے؟ کیا ''قاعدہ'' پر کوئی وحی آئی ہوئی ہے؟ قاعدہ تو خود ہی فصحاء و اہلِ زبان کے کلام سے مستنبط ہوتا ہے تو جو کلام سارے اہلِ زبان کے نزدیک سب سے

افصح ہے، جب اُس نے اس اعراب کو استعمال کر دیا تو اس کے خلاف کوئی قاعدہ مستنبط ہی کہاں سے ہوا؟ اور ایسے با قاعدہ قاعدہ کا استنباط خود قاعدہ ساز یا قاعدہ گر کے سہوِ نظر پر محمول کیا جائے گا۔

(۱۱:۳۸)

خلق الانسان و خلق الجانّ (۵۵: ۱۵، ۱۶)

انسان اور جن کا مخلوق کی دو مختلف نوعیں ہونا یہاں جس صراحت سے مذکور ہے اس کے آگے صراحت کا اور درجہ کیا ہو سکتا ہے؟ حیرت اور اس سے زیادہ افسوس کا مقام ہے کہ ایسی ایسی متعدد قرآنی صراحتوں کے باوجود بھی بعض باطل فرقوں کی کوشش اب بھی جاری ہے کہ جس طرح بھی کھینچ تان کر اور لغت اور نصوص قرآنی سے جس طرح بھی کشتی لڑ لڑا کر ممکن ہو جنات کو انسان ہی کی ایک قسم ثابت کر دکھائیں ۔۔۔۔ اس لئے اور محض اس لئے کہ فرنگیوں کو ابھی تک اپنی کسی تحقیق سے وجودِ جنات کا ثبوت نہیں ملا! اکبر الٰہ آبادیؒ کیا خوب فرما گئے ہیں ؎

کیوں کر خدا کے عرش کے قائل ہوں یہ عزیز
جغرافیہ میں عرش کا نقشہ نہیں ملا !

(۱۰:۵۵)

اعلموا انما الحیوۃ الدنیا الخ (۵۷:۲۰)

دنیا کے مقاصد سب کے سب فانی و سریع الزوال ہوتے ہیں. اور اہل دنیا عمر کے ہر دور میں انہیں کے الٹ پھیر میں رہتے ہیں. لڑکپن کا زمانہ کھیل کود کی نذر ہو جاتا ہے. سن اور بڑھا، تو حسن و عشق کے جھمیلے میں پڑ گئے، یا تجارت، ملازمت وغیرہ زر کشی کے پیشوں میں لگ گئے. سن کہولت آنے لگا تو اب ایک دوسرے کے مقابلہ میں فخر و مسابقت، مال و جاہ و شرافتِ خاندانی وغیرہ کی بنیادوں پر ہونے لگا. غرض ساری عمر انہیں بے بنیاد و بے ثبات مقصدوں کے پیچھے دوڑتے رہنے میں گزر جاتی ہے اور آخرت جو مقصودِ اصلی ہے اور حیات لافانی ہے وہ عمر کے کسی حصہ میں خیال میں نہیں آتی۔

(۲۷:۵۷)

وانزلنا الحدید فیه بأس شدید الخ (۲۵:۵۷)

معمولی اور گھریلو چاقو، چھری، استرہ قرولی سے لے کر تلوار، نیزہ، سنگین، خنجر، پستول، رائفل، مشین گن، توپ وغیرہ سے ہوتے ہوئے جدید ترین قسم کے آلاتِ مہلک، ایٹم بم وغیرہ پر نظر کر جایئے ہر ایک میں کارفرمائی اسی مہلک اور پُر ہیبت دھات لوہے ہی کی نظر آئے گی اور پھر ہتھیاروں یا اسلحہ کے علاوہ دوسرے قسم کے مہلک آلاتِ حرب ٹینک، آرمرڈ کار، ڈریڈناٹ جہاز، آبدوش کشتیاں، تباہ کن کشتیاں، بمبار طیارے، شکاری طیارے وغیرہا، ان سب کو نظر میں رکھیے! جب جا کر لفظ قرآنی کی حیرت انگیز و معجزانہ جامعیت کی قدر ہوگی۔

آج دنیا جس کارخانۂ عالم کو کارگاہِ تہذیب وتمدن کے نام سے یاد کرتی ہے، اس لوہے کے چھوٹے بڑے سارے مصنوعات، گھریلو ہل اور سوئی اور نب اور پن اور سیفٹی پن اور قینچی اور ہولڈر اور پھاوڑہ اور بیلچہ اور کدال اور استرے اور ناخن گیر اور کرچھے اور دست پناہ اور کھرپے اور بسولے اور ہنسیا اور گنڈاسے اور کلہاڑی اور چھلنی اور ہارون دستہ اور کرنی اور ہتھوڑے اور انگیٹھی اور ترازو کے پلڑے اور ترازو کے بانٹ اور کیل اور برنجی کیل اور موٹے چولھے اور کنجی اور قفل اور پتر اور آرے اور قبضے اور پیچکش اور سٹکنی اور زنجیر اور کنڈی اور چھتری کی تیلیوں اور سائیکل کی تیلیوں اور پانرے اور تانگوں، گاڑیوں، اکّوں کی کمانیاں اور دھونکنی اور سلاخیں اور توے اور پہیوں کے آہنی خول اور موٹر اور موٹر سائیکلیں، ریلوے انجن اور فائر انجن اور ٹیلیفون اور ٹیلی گراف اور ریڈیو کے تار اور ریل کی پٹریاں اور خود اور ٹراموے اور ان سب کے اندر کے بیشمار پُرزوں اور جنگی وغیر جنگی، رزمی، بزمی ان گنت بڑی چھوٹی مشینوں کو زرا معدوم فرض کر کے دیکھیے کہ اعلیٰ شہری تمدن تو خیر بڑی چیز ہے ادنیٰ دیہاتی تمدن بھی باقی رہ جاتا ہے؟ یہ سارے جائزے لے ڈالنے کے بعد الفاظِ قرآنی کی معجزانہ جامعیت پر بے اختیار قربان ہونے کو جی چاہے گا۔

(۳۹:۵۷)

رب المشرق والمغرب (۹:۷۳)

اس آیت پر پہنچ کر ذرا ملک کی اس فضا کا نقشہ ذہن کے سامنے لے آیئے جس میں توحید کی یہ آواز اول اول بلند ہوئی تھی۔ ایک تجارت پیشہ قوم جو اپنی آزادی وخودمختاری، اپنی اقبال مندی، اور اپنی شرافت نسب پر نازاں تھی، اور اپنے جاہلی دین واخلاق اور مشرکانہ تہذیب وتمدن میں مست توحید اور پاکبازی کے نام سے ناآشنا۔ اس مغرور قوم کے آگے اس کا ایک فرد، جو اس وقت تک نہ ثروت وو جاہت میں ممتاز تھا نہ ملک گیری وفوج کشی میں، تنِ تنہا کھڑے ہو کر صدا یہ بلند کر رہا ہے کہ جن ویویوں اور دیوتاؤں کی پرستش تم پشتہا پشت سے کرتے چلے آرہے ہو، سب کو چھوڑ چھاڑ کر صرف ایک کو مانو، اپنے فیشن کو بدلو، اپنے دین کو بدلو، شرابیں چھوڑو، بیحیائیاں چھوڑو، عریانیاں چھوڑو، قمار بازیاں چھوڑو، خونخواریاں چھوڑو، سودی کاروبار چھوڑو، غرض دین کے ساتھ اپنی دنیا بھی بدل ڈالو، خیال تو کیجیے کہ اس داعی کو کس دل وجگر، کس ہمت وعزم کا ہونا چاہیے۔

(۷:۷۳)

قال اساطیر الاولین (۱۳:۸۳)

مکذبین ومنکرین میں بھی ایسے بہت سے گزرے ہیں، اور اب بھی بہت سے ایسے ہیں جو اس کی آیتوں اور ان کے مضامین کو سن کر بول اٹھتے ہیں کہ یہ بے سند اور بے بنیاد باتیں تو اگلے صحیفوں اور پرانے نوشتوں سے منقول چلی آرہی ہیں ۔۔۔۔ گویا حقانیت قرآن کے خلاف یہ بھی کوئی دلیل ہوسکتی ہے کہ اس کی بیان کی ہوئی بعض روایتیں کسی نہ کسی بگڑی ہوئی شکل میں پہلے سے بیان ہو چکی ہیں! عجب مسخ شدہ ذہنیت منکرین قرآن کی ہر زمانہ میں رہی ہے۔ قرآن کوئی نئی تعلیم پیش کرے تو یہ کہکر اسے رَد کر دیجیے کہ یہ نئی بات دل کی گھڑی ہوئی ہے۔ اگر صحیح ومستند ہوتی تو آخر پہلے بھی تو کبھی سننے میں آئی ہوتی! اور قرآن کریم اگر قدیم حقیقتوں کو ان کی اصلی اور غیر محرف شکل میں پیش کرے، تو بس یہ کہکر انکار کر دیجیے کہ یہ تو پہلے صحیفوں کی نقل یا سرقہ ہے!

(۳:۸۳)

فصل چہارم

اعلام القرآن

توریت اور انجیل

توریت اور انجیل قرآن مجید کی اصطلاح میں دو مستقل آسمانی کتابوں کے نام ہیں، اور قرآن تصدیق انہی کی کرتا ہے۔ لیکن موجودہ بول چال میں توریت نام ہے متعدد صحیفوں کے مجموعے کا جن میں سے ہر صحیفہ کسی نہ کسی نبی کی جانب منسوب ہے، لیکن اُن میں سے کسی ایک صحیفہ کی بھی تنزیلِ لفظی کا دعوٰی کسی یہودی کو نہیں، اسی طرح انجیل نام ہے متعدد صحیفوں کے مجموعہ کا، جن میں حضرت مسیحؑ سے متعلق مجہول الحال لوگوں کی جمع کی ہوئی حکایتیں اور ملفوظات ہیں، لیکن ان میں سے کوئی صحیفہ بھی مسیحیوں کے عقیدہ میں آسمانی نہیں بلکہ مسیحی صاف صاف کہتے ہیں کہ یہ مجموعہ

''حواریوں کے دور میں بلا ارادہ اور بلا توقع تیار ہو گیا (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۳ ص ۵۱۳ طبع چہار دہم)

خوب سمجھ لیا جائے کہ ایسے بے سند ''مقدس نوشتوں'' کی تصدیق وتوثیق کی ذمہ داری قرآن ہرگز نہیں لیتا اور موجودہ بائبل، یعنی عہدِ عتیق وعہدِ جدید کا کوئی جزو قرآن مجید کے ماننے والوں پر حجت نہیں۔

(۷:۳)

عیسیٰؑ

آپ سلسلۂ انبیاءِ بنی اسرائیل کے خاتم ہیں۔ سنہ عیسوی آپ ہی کے نام سے جاری ہے، آپ کے بعد صرف نبوت محمدی ہوئی، ملک شام کے علاقۂ ارض گلیل میں ایک قصبہ ناصرہ نامی ہے،

وہی آبائی وطن ہے، ولادت بیت المقدس کے ایک گوشہ میں ہوئی، خاندان یوسف بن یعقوب بن ماشان نامی ایک حکیم تھا. جناب یوسف لکڑی کا کام کرتے تھے، اسی لئے یوسف نجار کے نام سے مشہور تھے، شام اس وقت رومی سلطنت کا ایک نیم خود مختار صوبہ تھا اور اس وقت والیٔ شام ہیرود تھا. مسیحی تقویم میں تین سال کی غلطی شروع سے چلی آرہی ہے بلکہ اس سے تین سال کے بعد کا ہے، اس لحاظ سے کہنا چاہیے کہ آپ کی ولادت ۴ ق۔م میں ہوئی۔

(۲۹۹:۲)

کئی سال کی تبلیغ ودعوت کے بعد ۳۳ سال کی عمر میں اور غالباً ۲۹ء میں آپ پر رومی عدالت میں مقدمہ الزامِ بغاوت میں، یہود کی تحریک پر چلا اور انھیں کے شور وغوغا کی بنا پر آپ کی سزا بھی حاکمِ عدالت نے سولی کی دے دی. اب اس کے بعد مسیحی عقیدہ یہ ہے کہ آپ سولی پر وفات پاکر اور مدفون ہوکر تیسرے دن پھر زندہ ہوگئے اور آسمان پر چلے گئے، لیکن جمہورِ اسلام کے عقیدہ کے مطابق آپ مصلوب ہونے سے بچ گئے، اور جس طرح آپ کی ولادت خارقِ عادت ہوئی تھی اسی طرح بہ طورِ خرقِ عادت آپ زندہ آسمان پر اٹھالئے گئے. سید احمد خان اور بعض اور حدیث العہد فرقے اس کے نہیں، بلکہ آپ کی وفاتِ طبعی کے قائل ہیں.

آپ کی تعلیمات مسیحی عقیدہ کے مطابق اناجیل اربعہ میں محفوظ ہیں. ان میں سب سے زیادہ زور حلم وعفو، صلح وآشتی، صدقہ وخیرات پر ہے۔

(قرآنی شخصیات ص:۹۸)

شہر حرام

شہر حرام کے لفظی معنی ہیں، حرمت والا مہینہ،، عرب کے قبائل آپس میں سخت جنگوں چلے آرہے تھے، لیکن آپس میں یہ بھی ٹھہر گئی تھی کہ سال میں چار مہینے جنگ بند رہے، اور یہ زمانہ امن وصلح کے ساتھ گزارا جائے. اور یہ چار مہینے یہ تھے.

(۱) محرم سنہ قمری کا پہلا مہینہ۔

(۲) رجب سنہ قمری کا ساتواں مہینہ۔

(۳) ذی قعدہ سنہ قمری کا گیارہواں مہینہ۔

(۴) ذی الحجہ سنہ قمری کا بارہواں مہینہ۔

عرب جاہلیت اپنی جہالت، شقاوت، جنگجوئی کے لئے بدنام اور بجا طور پر بدنام ہے لیکن اس کے باوجود سال کے دو تہائی حصہ لڑتے تھے اور باقی ایک تہائی حصہ امن و آشتی ہی کے مشغلہ میں گزار دیتے تھے۔۔۔ یہ کمال تو جاہلیتِ جدید یا جاہلیتِ فرنگ ہی کے لئے اٹھ رہا تھا کہ فرنگی قوموں کے بڑے بڑے سورما، نہ اتوار دیکھیں نہ تہوار، نہ کوئی موسم نہ کوئی مہینہ، ہر روز اور ہر ہفتہ اور ہر موسم میں، توپیں اور ٹینک اور ہوائی بم ہیں بلکہ اب تو ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم ہیں کہ ایک دوسرے کی جانیں لینے پر تلے ہوئے، ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتارنے پر اڑے رہتے ہیں۔

(۷۰۸:۲)

عرفات

مکہ معظمہ سے جو سڑک مشرق کی جانب طائف کو جاتی ہے، اس پر مکہ سے کوئی بارہ میل کے فاصلہ پر کئی میل کے رقبہ کا ایک لمبا چوڑا میدان پڑتا ہے، اور اس کا نام عرفات ہے۔ اسی کی ایک پہاڑی بھی اسی میدان میں واقع ہے۔ سطحِ زمین سے کوئی ۲۰۰ گز بلند، سال بھر یہ میدان بالکل سنسان پڑا رہتا ہے، صرف ایک دن ۹ ذی الحجہ کو اس کی پوری کسر نکل آتی ہے۔ اس روز یہ میدان انسانوں اور سواریوں سے کھچا کھچ بھر جاتا ہے۔ حاجیوں کو ۸ ذی الحجہ کی دوپہر تک منیٰ میں آ جانا چاہیے اور ۹ کی صبح کو بعد اشراق قافلے عرفات کے لئے روانہ ہو جائیں، تاکہ ۸۔۹ میل درمیانی فاصلہ دوپہر تک طے ہو جائے، دوپہر سے لے کر آخر وقت عصر تک اسی میدان میں رہنا چاہیے، اور اسی کا اصطلاحی نام وقوف ہے، یہی حاضری اعمالِ حج کی جان ہے اور یہ سارا وقت توبہ و استغفار، عبادت، انابت ہی میں صرف ہونا چاہیے۔ قریب غروب مزدلفہ (مشعر الحرام) کے لئے کوچ ہونا چاہیے، اور جس طرح

آج ظہر کے ساتھ عصر کی نماز (بہ قاعدۂ تقدیم) عرفات کی مسجد نمرہ میں ملالی گئی تھی، اسی طرح آج مغرب کی نماز (بہ قاعدۂ تاخیر) عشاء سے ملا کر اُس وقت پڑھی جائے گی، جب قافلے مزدلفہ پہونچ جائیں۔

(۷)

سلیمان

سلیمان بن داؤد (۹۹۰ق۔م تا ۹۳۰ق۔م) اسرائیلی سلسلہ کے ایک نامور پیمبر گزرے ہیں اور اپنے والد ماجد ہی کی طرح ایک بڑے تاجدار بھی، شام و فلسطین کے علاوہ آپ کے حدودِ حکومت، مشرق کی سمت میں عراق کے دریائے فرات کے ساحل تک اور مغرب میں سرحدِ مصر تک وسیع تھے۔ آپ کی سلطنت کی عظمت و شوکت پر دوست دشمن سب کو اتفاق ہے، اسلام میں اعلیٰ سے اعلیٰ روحانی و اخلاقی مرتبہ، یعنی نبوت و رسالت کے ساتھ جس طرح فقر و مسکنت جمع ہو سکتے ہیں اسی طرح دولت و امارت، حکومت و ریاست بھی، اسلام کا خدا غریبوں اور امیروں، ناداروں اور زرداروں سب کا یکساں خدا ہے۔

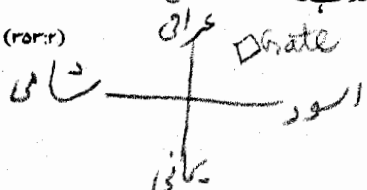

سیاہ پتھر کی اس بلند اور مستطیل عمارت کا نام ہے، جو صحن الحرام (مکہ معظمہ) میں بنی ہوئی ہے، اور جس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنا ہر مسلمان پر فرض ہے، اور حج و عمرہ میں طواف اسی کا کیا جاتا ہے ۔۔۔۔ عمارت کی پیائش میں اختلاف ہے، بلندی ۴۷ فٹ یا ۵۰ فٹ ہے، طول ۳۱ یا ۴۰ فٹ اور عرض ۳۰ یا ۳۵ فٹ، کرسی سنگِ مرمر کی ہے، اور زمین سے ۱۰ انچ بلند، شمالی کونے کو رکنِ عراقی کہتے ہیں، مغربی زاویہ رکن شامی کہلاتا ہے، جنوبی گوشہ رکنِ یمانی، اور مشرقی زاویہ رکنِ اسود، حجرِ اسود جس کا بوسہ طوافِ حج میں لیا جاتا ہے، اسی رخ پر دیوار میں نصب ہے زمین سے پانچ فٹ

بلند، دروازہ ایک ہے جو شمالی مشرقی دیوار میں ہے، زمین سے ۷ فٹ بلندی پر، جس زمانہ میں کھلتا ہے، تو اترنے چڑھنے کو ایک پہیہ دار زینہ لگا دیا جاتا ہے۔

(۳۰۵:۵)

آدم

قرآن مجید کی تصریحات واشارات، سطور وبین السطور سے نکلتا ہے کہ آدم سب سے پہلے انسان بھی تھے اور سب سے پہلے پیمبر بھی، نسلِ انسانی کے مورثِ اعلیٰ ۔۔۔۔ جنات اور ملائکہ کی تخلیق اِن سے قبل ہو چکی تھی۔ ان کا قالب گیلی مٹی سے تیار کیا گیا، جو ہر قسم کی تبدیلی قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ جب وہ مٹی پختہ ٹھیکری کی طرح آواز دینے لگی، تو اس میں روحِ الٰہی پھونک دی گئی۔ اور وہی قالب ایک زندہ متحرک عقل وہوش اور روح وضمیر والا انسان بن گیا۔ خلقتِ آدم کی غایت آدم ونسلِ آدم کے ذریعہ سے زمین پر خلافتِ الٰہی کا قیام، یعنی خدائی حکومت اور خدائی قانون کا نفاذ ہے۔ اور قرآن مجید نے آدمؑ کے وصفِ خلافت کو نمایاں کیا ہے۔ اِس منصب پر سرفراز ہو جانے کے بعد فرشتوں کو حکم ملا کہ (اور جو مخلوق ان سے ادنیٰ یعنی جنات وغیرہ اُسے تو یہ حکم بدرجہ اولیٰ ملا ہوگا) کہ سرِ اطاعت آدم کے آگے جھکاؤ، سب نے تعمیل کی، صرف ایک جن ابلیس نامی نے نہ کی، وہ اکڑ گیا اور کہنے لگا میں آگ سے بنا ہوں اور آدم مٹی سے، خاکی کے آگے ناری کیسے جھک سکتا ہے۔ اِس خود بینی ونافرمانی پر ابلیس جنت سے نکالا گیا۔ اور اس وقت سے وہ کھلم کھلا آدم اور نسلِ آدم کا دشمن ہو گیا۔

حضرت آدم اور ان کی زوجہ حوا کو حکم مل چکا تھا کہ جنت میں آزادی سے جو چاہو کھاؤ پیو! لیکن ایک خاص درخت سے الگ ہی رہنا۔ اب ابلیس نے وسوسہ اندازی کر کے دونوں کو پھسلایا، ورغلایا کہ اس درخت سے جو ممانعت تھی وہ عارضی تھی۔ اب اس کا پھل کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ سرتا سر نفع ہی ہے کہ اس کے بعد ہمیشہ جنت ہی میں رہو گے۔ اور قربِ حق کے مزے لوٹتے رہو گے۔ حضرت آدم اس کی چال کا شکار ہو گئے۔ اور اس امید میں کہ اس سے قربِ حق کا دوام حاصل رہے گا۔ خلافِ اجازت اس درخت کا پھل کھا بیٹھے۔ عتاب ہوا اور دونوں کے جسم سے جنت کا نورانی لباس معا

اتر گیا۔دونوں نے لجاجت سے معذرت پیش کی قصور معاف ہوا،لیکن حکم ہوا کہ جنت سے نیچے روئے زمین پر جاؤ،اس پھل کے کھانے سے طبعی اثرات کے ساتھ جنت میں نہیں رہ سکتے تھے آدم زمین پر آئے مگر اس کے کس حصہ میں؟ قرآن مجید بلکہ حدیثِ صحیح بھی اس باب میں خاموش ہے۔بعض روایتیں سراندیپ (سیلون) سے متعلق بھی آئی ہیں۔

لیکن زیادہ قرینِ قیاس ملک عراق ہے۔یعنی دجلہ وفرات کا دوآبہ۔

عہدِ جدید سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے معصیت اور سزائے معصیت کا وجود آدم کے وجود سے وابستہ ہے اور نجات عیسیٰ مسیح کے دم سے۔قرآن مجید میں بھی ایک جگہ ذکر حضرت آدمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا ساتھ ساتھ آیا ہے۔مگر وہاں صرف یہ کہا گیا ہے، کہ حضرت عیسیٰؑ کا حال اللہ کے ہاں حضرت آدمؑ ہی کی طرح ہے کہ انھیں بھی اللہ نے مٹی سے پیدا کر دیا تھا۔

(قرآنی شخصیات ص:۱۲)

ابراہیمؑ

اسلامی نام ابراہیم بن آزر ہے لقب خلیل اللہ۔پیدائش ملک عراق کی۔پھر ہجرت کر کے ملک شام میں آ گئے۔سلسلۂ نسب دس درمیانی واسطوں سے حسبِ بیانِ توریت حضرت نوحؑ تک پہنچتا ہے۔آپ ان کی گیارہویں پشت میں تھے۔سالِ پیدائش، برطانوی ماہرِ اثریات سر چارلس مارسٹن کی جدید تحقیق کے مطابق ۲۱۶۰ق۔م۔عمر حسبِ روایت توریت ۱۷۵ سال پائی۔اس حساب سے سالِ وفات ۱۹۸۵ق۔م پڑتا ہے۔

عقد تین فرمائے۔پہلی بیوی حضرت سارہ تھیں۔آپ ہی کے خاندان و برادری کی،ان کے بطن سے کبرسنی میں حضرت اسحاق پیدا ہوئے،خود بھی پیمبر اور بہت سے پیمبروں کے مورثِ اعلیٰ۔دوسری حرمِ محترم حضرت ہاجرہ تھیں۔غالباً عرب خاندان کی تھیں۔اُن کے بطن سے آپؑ کے سب سے بڑے صاحبزادہ حضرت اسمٰعیل تولد ہوئے۔خود بھی پیمبر اور نبی الانبیاء حضرت محمدؐ کے جدِ اعلیٰ بھی۔تیسری بیوی قنتورہ کے ساتھ عقد حضرت سارہ کی وفات کے بعد ہوا۔

آپ بڑے اقبال مند اور صاحبِ نصیب، کثرتِ اولاد کے اعتبار سے بھی تھے، اور یہ اس تمدن میں تھی بھی بڑی فضیلت کی چیز۔ قرآن مجید کے جامع و بلیغ الفاظ میں ابراہیم سے وعدۂ الٰہی ہے کہ

انی جاعلک للناس اماما میں انسانوں کا پیشوا تجھے بناؤں گا

چنانچہ یہ مشاہدہ ہے کہ دنیا کی تین بڑی قومیں یہود، نصرانی اور مسلمان آپؑ کو اپنا مسلّم پیشوا مانتے ہیں۔ اور آج سے نہیں، سینکڑوں ہزاروں برس سے مانتے چلے آرہے ہیں۔

قبائلی تمدن کے دور میں شیخ القبیلہ، حاکم یا امیر کے مترادف ہوتا تھا۔ ابراہیمؑ ہجرت کے بعد اپنے علاقۂ ملک کے شیخ القبیلہ ہوگئے تھے۔ جاہ و اقتدار آپ کو ہر طرح حاصل تھا۔ قبیلہ کے ہر معاملہ میں آپ کا حکم فیصلۂ ناطق تھا اور دولت و ثروت کے لحاظ سے بھی آپ کا شمار متمول افراد میں تھا۔ معاش و دولت کا معیار اس وقت قبائلی تمدن میں گلہ بانی تھی۔ اور آپ جانوروں کے بہت سے گلّوں کے مالک تھے۔

فیاضی اور مہمان نوازی مشرقی تمدن میں انسانیت کا جوہر خصوصی سمجھے گئے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ ان دونوں اوصاف میں ممتاز تھے۔ آپ کی مہمان نوازی کے بہت سے قصے مشہور ہیں۔ آج تک یہ ضرب المثل چلی آتی ہے۔ قرآن مجید سے بھی اس پر روشنی پڑتی ہے۔ قرآن مجید نے آپ کے دوسرے اوصاف حلم و تحمل، توکل و اعتماد علی اللہ، عفو و شفقت علی الخلق کو بھی نمایاں کیا ہے۔

عراق (کلدانیہ) کا مذہب آپؑ کے زمانے میں شرک تھا۔ آفتاب پرستی، ماہتاب پرستی اور کواکب پرستی کے ساتھ مورتی پوجا بھی جاری تھی اور آپؑ کے والد آزر تو بت تراش و بت فروش بھی تھے۔ آپؑ نے شروع ہی سے اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور ایک عام فہم استدلال سے جسے قرآن نے نقل کیا ہے اس نتیجہ تک بہ آسانی پہنچ گئے کہ ستارے، چاند، سورج جیسی تغیر پذیر اور غروب ہوجانے والی (حادث) ہستیاں ہرگز اس قابل نہیں کہ معبود یا الٰہ مانی جائیں۔ اس توحید کی تبلیغ آپؑ نے اپنے والد پر بھی کی۔ وہ ناخوش ہوکر بولے کہ ''اگر تم اس بدمذہبی سے باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کرادوں گا''۔ اس پر بھی آپؑ نے ان کے حق میں دعا اور ان پر تبلیغ جاری رکھی۔ مشرک بادشاہ

وقت نے غضبناک ہوکر آپ کو آگ کی بھٹی میں جھنکوایا۔ قدرتِ حق سے آگ آپ پر گلزار بن گئی۔ خانۂ کعبہ کی بنیاد بھی آپ ہی نے رکھی اور اپنے کم عمر صاحبزادے حضرت اسمٰعیلؑ کے ساتھ مل کر اسے تعمیر کیا۔

(ایضاً ص:۱۹،۲۱)

ابولہب

پورا نام عبدالعزیٰ بن عبدالمطلب مکی ہاشمی قریشی تھا متوفی ۲ھ۔ رشتہ میں رسول اللہ ﷺ کا چچا اور عبدالمطلب کا بیٹا تھا۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ عبدالمطلب کے دس فرزندوں میں یہ کس نمبر پر تھا۔ ابن سعد کی روایت کے مطابق یہ چھٹے نمبر پر تھا۔ بہر حال اتنے جزو پر اتفاق ہے کہ عبداللہ اور ابوطالب سے چھوٹا تھا۔

مکہ کی شہری مملکت میں مرتبۂ خصوصی، شرفائے بنی امیہ کے ساتھ ساتھ شرفائے بنی ہاشم کو حاصل تھا اور عبدالمطلب کی وفات پر شیخ القبیلہ کی حیثیت ان کے فرزندوں ابوطالب و ابولہب کو حاصل ہوئی۔ ابوطالب نسبۃً مفلس تھے، ابولہب اچھا خاصا سرمایہ دار تھا۔ جب برادرزادہ محمد بن عبداللہ نے دعویٔ نبوت کیا، اور خلقت کو توجہ اس طرف ہونے لگی، تو ابولہب اسے اپنے عقائدِ آبائی کے علاوہ اپنی سرداری اور اقتدار پر بھی ایک کاری ضرب سمجھا اور بھتیجے کی مخالفت میں اس کے غم و غصہ کی آگ پوری طرح بھڑک اٹھی۔ چچا ہونے کے علاوہ یہ رسول اللہ کا سمدھی بھی تھا قبلِ نبوت آپ کی دو صاحبزادیاں اس کے لڑکوں عتبہ و عتیبہ کو بیاہی جا چکی تھیں۔ گویا قرابت کے حق پہلے ہی کیا کم تھے، اب دو چند ہو گئے، اس کے باوجود شدتِ عناد کا یہ عالم تھا کہ ۷ھ نبوی میں جب قریش کے دوسرے قبیلوں نے مل کر رسول اللہ ﷺ اور آپ کے گنے چنے پیروؤں کا مقاطعہ شدید کیا ہے، اور سارے بنی ہاشم نے بلا لحاظِ عقائد محض برادری کے خیال سے آپ کا ساتھ دیا۔ اور سب شعبِ ابی طالب میں محصور ہو گئے، تو یہ ابولہب ہی اکیلا تھا جس نے ساری برادری کو چھوڑ باہر رہ جانا گوارا کر لیا تھا عرب کے معیارِ قرابت وصلۂ رحم سے یہ ایک شدید ترین جرم تھا۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید

نے ہمارے اعداء و معاندین رسولؐ میں نام لے کر ذکر صرف ابولہب کا کیا ہے۔ ابولہب کا مکان بھی رسول اللہؐ کے مکان کے برابر میں تھا۔ یہ خود اور عتبہ بن معیط دو موذی پڑوسی غلاظت لالا کر کاشانۂ رسول کے دروازہ پر ڈال دیتے تھے۔

(ایضاً ص:۲۶)

خندقوں والے

تلمیح ایک تاریخی واقعہ کی جانب ہے، جس سے اہل عرب بہ خوبی واقف تھے ظہور اسلام سے ذرا قبل ۵۲۳ء میں یمن کے تخت پر حمیری شاہی خاندان کا ایک قاہر و جابر فرد ذونواس متمکن تھا جس نے دین یہود اختیار کیا تھا (مذہب اس وقت دینِ مسیح تھا) یعنی توحید حضرت عیسیٰؑ کی اصل و غیر محرف تعلیم کے مطابق، پھر اس بادشاہ کو مسیحیوں سے خاص کد پیدا ہوگئی۔ اور ان پر اس نے شدید ستم توڑنے شروع کئے۔ یہاں تک کہ ایک بڑی خندق کھدوا کر اس میں آگ بھر کر ان مظلوموں کو ان میں جھونکنے لگا۔ رُومہ کے تخت پر اس وقت مشہور شہنشاہ جسٹینین جلوہ افروز تھا۔ اس کی تحریک اور ایما سے حبشہ کے مسیحی والی و حاکم نجاشی نے یمن پر حملہ کر کے بالآخر اس پر قبضہ کر لیا۔ اور ذونواس شکست کھا کر بھاگا، تو سمندر میں کود کر خودکشی کر لی۔

گبن وغیرہ انگریزی مؤرخین نے بھی اس تاریخی تعدّی کا ذکر کیا ہے اور قرآن مجید کی اس تلمیح نے اس کی اہمیت پر مہر تصدیق لگا دی ہے ذونواس کی حمایت و دفاع میں جو کچھ کہا جا سکتا ہے، جیوش انسائیکلوپیڈیا میں موجود ہے۔

(ایضاً ص:۳۶)

بنی اسرائیل

دوسرا نام حضرت یعقوبؑ (۲۰۰۰ق۔م تا ۱۸۵۰ق۔م) کا ہے۔ آپ کے بارہ فرزندوں سے جو نسل آگے کو چلی، بنی اسرائیل کہلائی۔ اور اس کا مذہب یہودیت ہے ایک مذہبی نسل کے اعتبار

سے تاریخ میں اس کی عظیم الشان اہمیت ہے، توحید کی علمبردار۔ یہ بحیثیت ایک قوم ونسل کے بھی ایک مدت تک دنیا میں رہی اور سوددوسو سال تک نہیں، تقریباً دو ہزار سال تک۔ اس نسل کے اندر انبیاء ومرسلین پیدا ہوتے رہے اور دنیاوی عروج بھی اُسے صدیوں تک حاصل رہا۔ داؤدؑ وسلیمانؑ جیسے عظیم الشان بادشاہ اور یوسفؑ جیسے عظیم المرتبت وزیر سلطنت اسی قوم سے اٹھے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ جہاں بھی آیا ہے مراد حضرت یعقوبؑ کے صلبی بیٹے نہیں، بلکہ بنی اسرائیل ہے۔

ظہورِ اسلام کے وقت یہ لوگ اپنے وطن شام (یا اگر اسے محدود کر لیجئے تو فلسطین) سے نکل کر ایک طرف عراق اور دوسری طرف مصر وغیرہ اطراف شام میں پھیل چکے تھے۔ اور ان کے بعض قبیلے حجاز میں بھی آبسے تھے۔ خصوصاً شہر یثرب (جس کا نام ہجرت کے بعد مدینۃ النبی پڑا) کے حوالی میں یہ لوگ مالدار تھے ساہوکار تھے، اور تجارت کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ سحر، کہانت، اور عملیات وغیرہ میں ممتاز تھے۔ مشرکین عرب ان کے علم وفضل کے قائل تھے، ان کی تہذیب وتمدن سے متأثر تھے اور مالی ومعاشی معاملات میں بھی انھیں حاجت روا سمجھتے تھے۔ قرآن مجید نے بار بار ان پر اللہ کے انعاماتِ خصوصی کا ذکر کیا ہے۔ اور تکرار کے ساتھ ان کی افضلیت کی صراحت کی ہے۔ اور مشرکین کو بار بار ان کی طرف رجوع کرنے کی ہدایت کی ہے، ساتھ ہی قرآن مجید نے ان کی بدعملی، زبوں حالی، بددیانتی، حرام خوری، بدعہدی، مسلم آزاری، سنگ دلی، پیغمبر کشی، اور پیغمبر آزاری کی پردہ دری کی ہے۔

(ایضاً ص:۶۳)

فرعون

قرآن مجید کے سارے بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ فرعونِ مصر نہ صرف ظالم وستمگر تھا، بلکہ بد دینی میں ترقی کر کے دعویٰ الوہیت وربوبیت تک پہنچ گیا تھا اور مغرور ومتکبر بھی تھا۔ حضرت موسیٰؑ جن کی پرورش ایک معجزانہ طریقہ پر محل شاہی میں ہوئی تھی۔ ان کے اور ان کے بھائی حضرت ہارونؑ کی ہر قسم کی افہام وتفہیم، پند وموعظت اس پر بے اثر رہی، نہ وہ خدائے واحد پر ایمان لایا، نہ ظلم وسرکشی

سے تائب ہوا، الٹا انھیں دونوں پیغمبرانِ برحق کی تکذیب وتضحیک کرتا رہا۔ حضرت موسیٰؑ سے خوارق کا طالب ہوا۔ اور جب آپ کی تائید میں معجزات ظاہر ہونے لگے تو ان کا بھی اس پر کچھ اثر نہ ہوا ہر بڑے معجزے کے ظہور کے وقت ہنگامی طور پر وہ خائف ومرعوب ہوجاتا اور بہ ظاہر توبہ کرتا نظر آتا، لیکن معاً بعد پھر اس کی اکڑ عود کر آتی اور انکار میں شدت بڑھ جاتی۔

اس نے اور اس کے ارکانِ دولت نے تشخیص یہ کی، کہ یہ دونوں بھائی سحر ویز نجات کے ماہر ہیں۔ ان کا مقابلہ سلطنت کے ماہرین سحر سے کرادیا جائے۔ چنانچہ بڑی دھوم دھام اور سلطانی پروپیگنڈے کی مدد سے اس نے یہ مقابلہ کرایا، ساحروں کو شکست فاش ہوئی، انھیں یقین ہوگیا کہ موسیٰؑ کے ساتھ سحر سے برتر وبالاتر کوئی روحانی قوت ہے، وہ ایمان لے آئے۔ فرعون نے انھیں بڑی شقاوت کے ساتھ ہلاک کرڈالا۔

آخر ایک شب حضرت موسیٰؑ اپنے ہمراہ قومِ بنی اسرائیل کو لے کر فلسطین کے ارادہ سے، مصر سے نکل کھڑے ہوئے۔ رات کے اندھیرے میں راستہ بھٹک کر سمندر کے کنارے جا پہنچے۔ پیچھے سے فرعون اور لشکرِ فرعون نے آلیا، معجزۂ خداوندی سے سمندر پایاب ہوگیا۔ حضرت موسیٰؑ مع اپنی قوم کے پار ہوگئے، فرعونیوں نے جب قدم بڑھائے تو سمندر پھر سے مل گیا اور فرعونی ڈوب گئے۔ خود فرعون جب غرق ہونے لگا، تو تائب ونادم ہوا، اب وقت توبہ کا گزر چکا تھا، حکم ہوا نجات صرف جسم کو ملے گی اور دنیا کی عبرت کے لئے باقی رکھا جائے گا۔

قرآنی بیانات کا لبِ لباب اتنا ہی تھا۔

تاریخِ مصر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعون کسی بادشاہ کا شخصی نام نہیں، بلکہ کئی صدیوں کی مدت تک شاہانِ مصر کا عمومی لقب رہا۔ جیسے قیصرِ روم، کسرائے ایران، سلطانِ ترکی اور فراعنۂ مصر کا ذکر بہ صیغۂ جمع اسی طرح آتا ہے جیسے قیاصرہ، اکاسرہ اور سلاطین کا۔ توریت کے بین السطور سے ایسا معلوم ہوتا ہے، اور شارحین وعلماءِ توریت کا مستحکم خیال ہے کہ موسیٰؑ کے معاصر ایک نہیں، دو فرعون ہوئے ہیں۔ ایک کا نام غالباً عمیس ثانی تھا۔ اور دوسرے کا نام پنتحا ثانی۔ ایک کے زمانہ

میں ظلم وستم اسرائیلوں پر ہوئے اور دوسرے کے عہد میں اسرائیلیوں کو مجبوراً مصر چھوڑنا پڑا۔ناموں کی یہ تعیین محض ظن وتخمین سے ہے، مصر کے اوراقِ تاریخ میں کوئی بات صاف نہیں ملتی۔۔۔۔قرآن مجید کا یہ بھی ایک اعجاز ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے معاصر اگر متعدد شاہانِ مصر بھی ثابت ہوجائیں تو فرعون کا عمومی لقب سب پر حاوی ہوگا۔

(ایضاً ص:۱۰۲،۱۰۳)

محمدؐ

محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب ہاشمی قریشی ہیں۔ پیدائش مکہ معظمہ میں اپریل میں ۵۷۱ء میں، وفات شریف مدینہ منورہ میں ۱۲ربیع الاول ۱۱ھ (۸رجون ۶۳۳ء) کو۔عرب کے متمدن ترین قبیلہ، اور شریف ترین خاندان میں پیدا ہوئے، لڑکپن، نوجوانی، جوانی کا ہر دور انتہائی پاکیزگی وشرافت کے ساتھ گزارا۔۔۔۔تجارت پیشہ قوم میں بہ حیثیت ایک کامیاب متدین تاجر کے بھی شہرت حاصل کی عبادت ویادِ الٰہی میں شروع سے ممتاز رہے۔تقوی کی ہر شاخ میں دوسروں کے لئے نمونہ ثابت ہوئے۔ چالیس سال کی عمر میں مرتبۂ نبوت سے سرفراز ہوئے مختلف مصلحتوں اور ضرورتوں سے متعدد عقد فرمائے۔اولادیں بھی خاصی ہوئیں، جوان ہوکر صرف چار صاحبزادیاں زندہ رہیں۔بعد نبوت ساری عمر دعوتِ توحید اور تبلیغی اصلاحی مشاغل میں صرف کی اور جہاد کی ہمہ جہتی کوششوں کے ساتھ قتال کی بھی نوبت بارہا آئی اور بڑے بڑے معرکے سر کئے۔اپنے بعد دنیا میں، اللہ کی بھیجی ہوئی بہترین کتاب کے علاوہ خود اپنے ملفوظات ومعمولات کا ایک عظیم الشان ذخیرہ اور اپنے مخلص پیروؤں کو ہزار ہا ہزار کی تعداد میں چھوڑ کر دنیا سے تشریف لے گئے۔۔۔۔قرآن مجید نے آپ کے کمالات اور کرامات کا ذکر بار بار کیا ہے اور بڑا زور آپ کی عبدیت ورسولیت پر دیا ہے، کہ عقیدۂ ابنیت، مظہریت وغیرہ کی جڑ ہمیشہ کے لئے کٹ جائے۔دنیا کی تاریخ میں یہی نہیں کہ کامیاب ترین شخصیت آپؐ کی ہوئی ہے بلکہ تاریخیت کے لحاظ سے بھی آپ کی شخصیت بے نظیر ہے۔جس تعداد میں اور جتنی جزئی تفصیل کے ساتھ حالاتِ زندگی آپ کے ملتے ہیں مشاہیرِ عالم میں کسی ایک شخص

کے بھی نہیں ملتے۔

(ایضاً ص:۱۱۳)

موسیٰ

موسیٰ بن عمران نسل لاوہ بن یعقوب (اسرائیل) سے تھے۔اور سلسلۂ اسرائیل کے مشہور ترین پیغمبر گزرے ہیں۔آپ کی ولادت کے وقت فرعون قاہر نے حکم دے رکھا تھا کہ حدودِ مصر میں کوئی اسرائیلی بچہ زندہ نہ چھوڑا جائے۔آپ معجزانہ طور پر بچ گئے،اور آپ کی والدہ ماجدہ نے اشارۂ غیبی پاکر صندوق میں لٹا کر اُسے دریائے نیل میں ڈال دیا،نیل قصرِ شاہی کے نیچے سے گزرتا تھا۔ فرعون مع ملکہ کے اتفاق سے اس وقت دریا کی سیر کررہا تھا۔بہتا ہوا صندوق دیکھ کر بچہ کو نکال لیا۔ملکہ کو بہت محبوب لگا اور فرعون سے پرورش کرنے کو مانگ لیا۔اس طرح آپ کی پرورش و پرداخت شاہی محل میں ہونے لگی۔جب آپؑ جوان ہوئے تو ایک روز سرِ راہ ایک مصری (قبطی) ایک اسرائیلی کو پیٹ رہا تھا،اس نے آپ سے فریاد کی۔آپ نے مظلوم کی حمایت میں اس کے ایک مُکا دے مارا اور اتفاق سے وہ اس کے ایسا لگا کہ وہیں ختم ہوگیا۔دوسرے دن بات پھوٹی اور آپ کی تلاش شروع ہوئی،آپ مصر چھوڑ کر مدین پہونچے اور یہاں حضرت شعیبؑ کے ہاں ان کا کاروبار دیکھنے پر ملازمت کرلی۔اور یہیں ان کی صاحبزادی بی بی صفورہ کے ساتھ آپؑ کا عقد بھی ہوگیا۔کئی سال بعد آپ اپنی اہلیہ کو لے کر مصر واپس ہوئے،راستہ میں ایک اندھیری رات میں آپ کو کوہِ طور پر روشنی نظر آئی۔آگ کی تلاش میں آپ قریب گئے تو معلوم ہوا کہ تجلیٔ خداوندی ہے،وہیں آپ کو نبوت اور باری تعالیٰ سے ہم کلامی کی سرفرازی حاصل ہوئی،ساتھ ہی یہ حکم ملا کہ جاکر فرعون کو دعوتِ توحید وایمان دو۔اور آپؑ کی درخواست پر حضرت ہارونؑ بھی اس خدمت میں آپؑ کے شریک قرار پائے۔

آپؑ نے مصر پہنچ کر ہر طرح کی کوشش دعوت وتبلیغ کے سلسلہ میں کرڈالی،معجزات وخوارق بھی اذنِ خداوندی سے طرح طرح کے دکھائے۔فرعون اور اس کے درباریوں پر کچھ اثر نہ ہوا۔فرعون

اپنے کو سورج دیوتا کا اوتار اور اس لئے اپنے کو خود بھی معبود یا دیوتا سمجھتا رہا۔ اس کی سمجھ ہی میں خدائے واحد کی دعوت اور اپنی عبدیت کسی طرح نہ آئی اور وہ اپنی ضد اور ہٹ پر اڑا رہا۔ معجزات وخوارق دیکھ کر یہ سمجھا کہ یہ سب سحر کی کرشمہ سازی ہے۔ بڑے بڑے ماہرین سحر کو بلا کر پیمبرؑ سے مقابلہ کرایا۔ ساحروں کو شکست فاش ہوئی اور سب کے سب موسیٰ کی پیمبری پر ایمان لے آئے فرعون الثانی پر بھی برہم ہوا اور انھیں سخت سزاؤں کے ساتھ ہلاک کر ڈالا، آخر میں عذاب الٰہی کی گرفت ہوئی۔ سالہا سال کے بعد اشارۂ خداوندی سے حضرت موسیٰ اپنی ساری قوم کو لے کر وطن اسرئیل ارضِ فلسطین کے ارادہ سے شبا شب روانہ ہوئے اور راستہ بھول کر بجائے خشکی خشکی نکل جانے کے بحر قلزوم کی ایک شاخ کے سامنے آ گئے۔ فرعون کو خبر ہوئی، تو مع لشکر کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ پیمبر نے حکم خداوندی سے سمندر میں قدم رکھ دیا تھا۔ اور سمندر معاً سمٹ کر اسرئیلیوں کے لیے پایاب ہو گیا اور اسرائیلی دوسرے کنارے پر سلامتی کے ساتھ پہنچ گئے، لیکن جب یہ دیکھ کر فرعون نے بھی سمندر پار کرنا چاہا تو پانی کی سمٹی ہوئی دیواریں یکبارگی پھر مل گئیں اور فرعون مع لشکر کے غرق ہو گیا۔

(ایضاً ص: ۱۱۷، ۱۱۸)

دوسرا باب

آپ بیتی

کوئی انسان اپنی خلوت وجلوت کی ہر بیتی گذری بلا کم وکاست جوں کی توں سنانے کیوں کر آمادہ ہوجائے گا؟ اور پھر جب کہ اس سے اس کی شخصیت پر حرف بھی آسکتا ہو؟ لیکن ''مدیر صدق'' جب اپنے عزیزوں، دوستوں اور مخلصوں کے اصرار پر اپنی آپ بیتی کے لئے قلم اٹھاتا ہے تو شروع ہی میں بے ساختہ اس کے قلم سے اپنے پروردگار سے ملتجیانہ یہ الفاظ بھی چھلک پڑتے ہیں.

''صرف دعا اپنے پیدا کرنے والے سے یہ ہے کہ جو کچھ آپ بیتی ہو، اسے
بشری حد تک بے کم وکاست سپردِ قلم کرڈالنے کی توفیق اس بدہمت کو ہوجائے''

مدیر صدق کو یہ توفیق میسر آئی بھی یا نہیں، اور ''بشری حد تک بے کم وکاست سپردِ قلم کرڈالنے'' کے اپنے قول میں وہ صادق رہا بھی یا نہیں؛ یہ محض آپ بیتی کے منتخب جملوں پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے نہیں، بلکہ ایک مرتبہ پوری آپ بیتی پڑھ ڈالنے ہی سے معلوم ہوگا

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی یہ آپ بیتی ادب وانشاء کی تاریخ میں بلحاظ طرزِ بیان ایک مایہ ناز شاہکار اور آپ بیتی وخودنوشت سوانح حیات کے باب میں باعتبار ترتیبِ مضامین ایک لائقِ تقلید فنکار کی حیثیت رکھتی ہے۔۔۔۔اس آپ بیتی پر مقدمہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے ادیبانہ قلم کا تحریر فرمودہ ہے. اس پُر مغز وجامع مقدمہ کے ہوتے ہوئے ''آپ بیتی'' اور پھر ''مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی آپ بیتی'' سے متعلق کچھ لکھنے کی قطعاً ضرورت محسوس نہیں ہوتی. اور پھر ''آب'' کے ہوتے ہوئے کوئی ''تیمم'' کی جرأت بھی کیسے کرسکتا ہے؟؟ لیجئے اسی مقدمہ کے چند طول طویل اقتباسات ملاحظہ فرمایئے اور بس!

''اگر یہ سوال کیا جائے کہ ادب وانشاء، اور تاریخ وتذکرہ کے اصناف

میں سب سے زیادہ دل چسپ، دلآویز، خوش گوار، اور شوق انگیز صنف کون سی ہے، تو شاید اکثر اہل ذوق کا یہی جواب ہوگا کہ ایک اچھے صاحبِ قلم اور ادیب کے قلم سے نکلی ہوئی ''آپ بیتی'' یہ انسانی نفسیات کا عجیب معمہ ہے، کہ انسان کو دوسرے کی کہانی میں بعض اوقات وہ مزہ ملتا ہے، جو اپنی کہانی میں آتا ہے، خاص طور پر وہ کہانی کہانی کی طرح سنائی جائے، وہ حکمت وفلسفہ اور پند وموعظت کے عناصر، اور ادب وانشاء کے تکلفات سے زیادہ گراں بار نہ ہو، اس میں سادگی اور بے ساختگی، جذبات واحساسات کی ترجمانی، واقعات ومناظر کی سادہ تصویر کشی، غلطیوں اور کوتاہیوں کا کہیں اظہار یا کہیں اقرار، آورد سے زیادہ آمد، اور ہدایت سے زیادہ حکایت ہو، اس کو لکھنے والے نے اپنی یا دوسروں کی بھاری بھرکم تصنیفات میں اضافہ کرنے کے لئے نہ لکھا ہو، بلکہ بھولی ہوئی یادیں تازہ کرنے، مٹے ہوئے نقوش اجاگر کرنے، خود اپنی مسرت، حسرت، عبرت اور اپنے عزیزوں، افرادِ خاندان، اور نیازمندوں کو اپنے سے واقف کرنے اور اپنی زندگی کی داستان سنانے کے لئے لکھا ہو۔

اس آپ بیتی میں اگر یہ چند خصوصیات اور جمع ہو جائیں تو پھر ''سونے پہ سہاگہ'' ہو جاتا ہے، ایک یہ کہ اس کا لکھنے والا زبان کا اداشناس، اپنے زمانہ اور اہل زمانہ کا مزاج شناس، کہنہ مشق اور صاحب طرز ادیب بھی ہو، قدرت نے اس کو قوتِ مشاہدہ کی دولت سے مالا مال کیا ہو، وہ روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو بھی بڑے غور کی نظر سے دیکھتا ہو، اور ان سے بڑے بڑے نتائج نکال لیتا ہو، گرد وپیش کی دنیا سے واقف ہونے کا شوق رکھتا ہو، اس کی اچھی چیزوں کی دل سے قدر کرتا ہو، اور ان کے متعلق بے تکلف اظہار کرنے میں کوئی شرم مانع نہ ہو، ناگوار اور تکلیف دہ واقعات سے

ناگواری محسوس کرتا ہو، اور اس کے اظہار میں بھی وہ کسی تکلف سے کام نہ لیتا ہو، نامور مصنف، عظیم دانشور، مانے ہوئے مفسر، معلم اخلاق اور ماہر فلسفہ و نفسیات ہونے کے باوجود وہ معصوم بچپن کی پھر اٹھتی ہوئی جوانی کی، پھر ڈھلتی ہوئی عمر کی وہ کیفیتیں، اور سطح آب پر پیدا ہونے والے ان تموجات اور اشکال وصور کو جو حباب کی طرح اٹھیں اور حباب کی طرح بیٹھ گئیں، بھولا نہ ہو، اور اب عمر و علم کی اس پختگی اور شہرت و عظمت کے اس مقام پر پہونچ کر جس پر وہ برسوں فائز ہے، ان کے ذکر کرنے میں وہ کوئی حقارت، یا حیا محسوس نہ کرے، بلکہ موئے قلم سے ان کی تصویر اس طرح کھینچے کہ پڑھنے والے اس کو پڑھ کر جھوم جائیں اور ان کو اپنا گزرا ہوا زمانہ، اپنا معصوم بچپن، اور اپنی بیتی جوانی یاد آجائے، اور اس زمانہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے، جو تاریخ میں محفوظ ہے نہ ادب کی کتابوں میں۔

مثال کے طور پر اس کتاب میں رسم بسم اللہ کی تصویر کشی دیکھئے، جو مسلمان شرفاء اور کھاتے پیتے گھرانوں میں بڑے اہتمام سے منائی جاتی تھی، اور جو اسلامی تہذیب کی ایک برکت تھی، عہد طفلی کے تذکروں کے موقعوں پر مولانا کے جادو نگار قلم نے نہ صرف گزرے ہوئے زمانے کے مناظر کو آنکھوں کے سامنے لا کھڑا کر دیا ہے، بلکہ ان کے قلم سے وہ جملے بھی نکل گئے ہیں، جو سادگی کے باوجود ادب وانشاء کا نمونہ ہیں۔ مثلاً وہ دایہ کی گود میں جانے کی کیفیت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:-

''ہائے وہ دایہ کے گود میں جانے کی لذت! اب کیا بیان ہو؟ وہ لذت جس کا بدل نہ جوانی کی گرمیاں دے سکیں، نہ بڑھاپے کی حکمیاں''

اپنے بچپن اور اس کے واقعات کو یاد کرتے ہوئے انھوں نے اس جملہ

میں کتنا درد بھر دیا ہے ''غضب کی حسرت ناک سچائی بھر دی ہے کسی نے اس مصرعہ میں دو دن کو اے جوانی دے دے ادھار بچپن''

زمین داری، پھر اودھ کی زمین داری کا دور گزر گیا، جنھوں نے وہ دور نہ دیکھا ان کو ہزار بتائے جائے، وہ اس کا صحیح تصور ہی نہیں کر سکتے، اس کی کمزوریاں اور خامیاں اور ان میں دبی ہوئی کچھ خوبیاں، ایک چھوٹی سی نوابی اور ایک خیالی بادشاہی، سخت گیری کے ساتھ رعایا کی کچھ خبر گیری بھی، کچھ ہمدردی بھی، زمین داروں کے لڑکوں کا احساس برتری، اس زمانہ کی مرفہ الحالی اور بے فکری، یہ سب دیکھنا چاہیں تو اس حصہ کو دیکھیں جہاں، مولانا نے زمین دار معاشرے کے گھروں کا نقشہ کھینچا ہے۔

ازدواجی زندگی کا باب انسانی زندگی کا ایک اہم فطری اور شرعی باب ہے جس کے بغیر کوئی ''آپ بیتی'' مکمل نہیں اس کے بیان کرنے میں بھی مولانا کی حیثیت ایک ادیب، ماہر نفسیات و معلم اخلاق، ایک احساس و محبت آشنا انسان اور ایک عالم دین کی ہے۔

غرض یہ کتاب جو مولانا نے اپنی زندگی کے آخری دور میں لکھی اور اس پر بار بار نظر ثانی فرمائی، ادبی، اخلاقی اور تاریخی تینوں لحاظ سے قدر و قیمت کی حامل ہے۔

ادب کے طالب علموں بلکہ ادب کے استادوں اور معلموں کو بھی اس میں ادب و زبان کی خوبیاں، لکھنؤ اور اودھ کے محاورے، اساتذہ کے آبدار اشعار اور جاندار مصرعے، اردو ادب و زبان کے گزشتہ دور، اور لکھنؤ کے ادیبوں اور شاعروں سے تعارف ہوگا، دین و اخلاق اور اصلاح و تربیت نفس کے سلسلہ میں بھی اس سے رہنمائی حاصل ہوگی، اور اس سے ظاہری و معنوی

دونوں طرح سے یہ کتاب ہر طبقہ کے لئے دلچسپ، دل کش، اور دلآویز ہوگی

ع

بہ رنگ ارباب صورت را، بہ بو ارباب معنی را''

ماحول

اُنیسویں صدی عیسوی کا آخری دہا ہے، برطانیہ اور پھر ملکہ وکٹوریہ کے عہد واقبال کا برطانیہ، آج بعد زوال کوئی اس عہد کی تصویر کھینچنا بھی چاہے تو کیوں کر کھینچے، کس مُصور کے بس کی بات ہے کہ ستر سال کے پیر مرد کے چہرے مہرے میں ۲۵ سال والے جوان کی رعنائی، شادابی، شگفتگی بھر دے! ہندوستان پر برطانیہ کے تسلط واقتدار کا عین شباب تھا، محض سیاسی ہی حیثیت نہیں، علمی، مجلسی، تمدنی، تعلیمی، غرض دنیوی زندگی کے بھی مختلف شعبوں میں بھی جاری وساری۔

مسلمان ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ ''غدر وبغاوت'' اور اس کے عواقب ونتائج سے کچھ ایسے ڈرے سہمے ہوئے تھے کہ سرکار جو کچھ بھی چاہے کرے، بس اپنی خیریت اسی میں ہے کہ اس کی ہاں میں ہاں ملائے جایئے۔ یہ کونسلیں اور اسمبلیاں جنہوں نے بعد کو اتنی نمود حاصل کی، انیسوی صدی کے دسویں دَہائی میں اگر تھیں، تو اپنی بالکل ابتدائی صورت میں، بلکہ کہیے کہ بالکل برائے نام۔ معراج ترقی مسلمان شریف زادوں کی، خصوصاً یوپی اور شمالی ہند میں، بس یہ تھی کہ ڈپٹی کلکٹری یا منصفی مل گئی بس، اکثر کے لئے تو ان سے بھی چھوٹے عہدے ایک نعمت تھے۔

یہ خیر سرکاری طبقہ کا حال تھا۔ باقی شعروادب بول چال، وضع ولباس، مکان اور فرنیچر، سواری اور سفر، مُہد پن اور عیاشی، کھیل کود، دوا علاج، غرض زندگی کے چھوٹے بڑے ہر جزئیہ میں ''صاحب'' اور صاحبیت ہی کا سکہ رواں تھا۔ حد یہ ہے کہ اپنی مادری زبان، اردو قصداً لہجہ اور تلفظ بگاڑ کر بولی جانے لگی۔ تاکہ بول چال میں بھی ''صاحب بہادر'' سے مشابہت پیدا ہو جائے!۔۔۔۔ اور دین وعقیدہ کے دائرے میں تو یہ مرعوبیت تکلیف دہ حد تک بڑھ چکی تھی۔ یورپ کی ہر بات پر ''آمنا

صدقتا'' ''دانایانِ فرنگ'' ''حکمائے فرنگ'' ''عقل فرنگ'' یہ سب الفاظ خواص وعام دونوں کے زبان زد تھے۔

نئے فیشن کی پیش قدمی پوری تیزی سے جاری تھی، قدیم وجدید کی آویزش قدم قدم پر تھی، اور قدیم ہر محاذ پر، اور ہر میدان میں شکست پر شکست کھا رہا تھا، زک پر زک اٹھا رہا تھا۔ سارے شعائر اسلامی ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے تھے، اور ''اقبال سرکار'' اور ''دانایانِ فرنگ'' گویا ہر مسئلہ میں ''سند'' کا درجہ رکھنے لگے تھے۔

مرزا غریب چپ ہیں اُن کی کتاب ردّی
بدھو اکڑ رہے ہیں کہ ''صاحب'' نے یہ کہا ہے

(ص:۲۱،۲۲)

والدہ ماجدہ

نام بی بی نصیر النساء تھا۔ اپنے والد حکیم نور کریم کی پانچ لڑکیوں اور تین لڑکوں میں سب سے چھوٹی تھیں، جیسے میرے والد مرحوم بھی اپنے سارے بھائی بہنوں میں چھوٹے تھے۔ سال ولادت غالباً ۱۸۵۳ء تھا۔ کہا کرتی تھیں کہ ''غدر'' کے وقت میں ۴،۳ برس کی تھی، اور ''غدر'' کا سال ۱۸۵۷ء تھا۔

صورت شکل میں اپنے زمانہ میں ممتاز رہی تھیں۔ میں نے جب دیکھا تو ادھیڑ سن کی ہو چکی تھیں۔ نانا صاحب کے یہاں تنگ دستی تھی اور خرچ میں اولوالعزمی، قدرۃً ان کے بچپن کا زمانہ تنگی وترشی میں گزرا۔ اب جب ہم لوگوں کے سامنے بچپن کی ناداری کے قصے سناتیں تو ہم لوگوں کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ جاتے۔ بے چاری کو کیسا کیسا چمار کے رہنا ہوتا تھا! اللہ نے صبر کا پھل میٹھا دیا۔ شادی کے بعد ہی مالی حالت بہتر ہونے لگی۔ یہاں تک کہ آگے چل کر تو خاصی خوش حالی سے گزرنے لگی۔ شوہر سے بھی خوب بنی۔ اس لئے خرچ پر بھی پورا اختیار حاصل رہا۔ کہنا چاہیے کہ گھر میں ملکہ بن کر رہیں، اور راج کرتی رہیں۔

مزاج کی نیک، ہمدرد، غریب پرور، اور بڑی فیاض تھیں، گھر میں جو کچھ آتا بانٹ کر رکھ

دیتیں اور بچا بچا کر رکھنا تو جیسے جانتی ہی نہ تھیں بارہا ایسا ہوا کہ ہم لوگوں کو حصہ بس واجبی ہی ساملا اور ہم لوگ کہ ان کی اولاد تھے، جھنجھلا کر رہے، ایسا بھی ہوا کہ خاصے کی چیز اٹھا کر کسی غریب پڑوسن یا عزیز کے یہاں بھیج دی۔ اور خود موٹے جھوٹے پر گزر کر لی۔ عفت وحیا داری کے جس ماحول میں ساری زندگی گزاری، اس کا اب سمجھ ہی میں آنا مشکل ہے۔

۵۹ سال کی عمر میں بیوہ ہوئیں اور چند سال پھر تنگ دستی کے اٹھائے، بھائی صاحب کی تنخواہ اس وقت قلیل تھی، اور وہ صاحب اولاد بھی ہو چکے تھے، اور میں تو کچھ بھی نہیں کما رہا تھا۔ گاڑی گھوڑا اور گھر کا زائد سامان سب الگ کرنا پڑا، معیارِ معیشت نیچے لانا پڑا، کھلے ہوئے ہاتھوں کا روکنا مشکل ہی ہوتا ہے، خیر بشتم پشتم گزار دی، اُدھر بھائی صاحب کی تنخواہ بڑھنے لگی، ادھر میری بھی آمدنی ہونے لگی، اس پر بھی میں دیکھتا تھا کہ جس طرح والد مرحوم سے لڑ جھگڑ کر وہ لیتی تھیں اس کے آدھے کی بھی فرمائش ہم لوگوں سے نہ کرتیں۔۔۔۔ شوہر کی کمائی اور اولاد کی کمائی میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ شوہر سے بیبیاں مچل کر، جھگڑ کر حاصل کر لیتی ہیں، بیٹوں سے کہتے ہوئے مائیں خود لجی جاتی جھجکی جاتی ہیں۔ اُلٹے خود ان کی مروّت میں، رعایت میں دبی ہوئی، پسی ہوئی رہتی ہیں۔ یہ حقیقت شروع شروع سمجھ میں نہ آئی جب اپنا ادھیڑ سن آیا، جب جا کر آنکھ کھلی اور اب تو ایک موٹی سی بات معلوم ہوتی ہے۔

(ص: ۴۲، ۴۳، ۴۴)

بہن

سن میں مجھ سے کوئی پانچ چھ سال بڑی۔ نام ظریف النساء رکھا گیا تھا۔ پھر بارہ تیرہ سال کی عمر میں بدل کر بی بی سکینہ کر دیا گیا۔ قد کی چھوٹی، چہرہ گول، اور بھرا ہوا، رنگ خوب صاف، صورت شکل میں ممتاز، اتنی بے نفس و بے زبان کہ اچھی صالح بیبیوں میں ایسی مثال کمتر ہی ملے گی۔ نہ کسی سے لڑائی بھڑائی، نہ کسی کی غیبت و بدگوئی (اور خیر کسی سے رشک و حسد کا ذکر ہی کیا) ہنس مکھ چہرہ، ہر ایک کے دکھ درد میں شریک، عبادتِ الٰہی بس اوڑھنا بچھونا۔ اسی میں جوانی پوری کی پوری گزار دی۔ والدین

کی اطاعت تو گویا فریضہ زندگی ہی تھا. بڑے بھائی کو بھی کبھی الٹ کر جواب نہ دیا. خود مجھ سے جو اتنا چھوٹا تھا اپنے کو چھوٹا ہی سمجھا کیں، انھیں اتنا دبا لچا ہوا پا کر میں اور ہر طرح ان پر شیر ہو گیا، اور اپنا اچھا خاصا سن آ جانے پر بھی، ان غریب سے یہ برتاؤ رکھا کہ جیسے میں بڑا ہوں اور وہ چھوٹی ہیں.

والدہ ماجدہ کے بعد، خالص بے لوث، بلا توقع مُزد و معاوضہ کا مزا انھیں کے دم سا تھا. اور میرے اوپر تو گویا جان ہی چھڑکتی تھیں. لفظ "معصوم" کا اطلاق اگر انبیاء معصوم کے علاوہ دنیا میں کسی کے لئے جائز ہوتا تو عجب نہیں کہ اس مرحومہ کا شمار بھی انھیں گنی چنی مثالوں میں ہو۔۔۔۔ عجب ذات والا صفات تھی اس مرحومہ کی، جس کی کوئی قدر اس بدنصیب نے زندگی بھر نہ کی۔

(۵۰،۴۸)

بسم اللہ رکھائی

زمانہ یہی کوئی اخیر ۱۸۹۵ء کا ہوگا، کہ ایک سہ پہر کو بعد عصر، وہیں لکھیم پور میں زنانہ مکان کے صحن میں تخت پر فرش بچھا دیا گیا، گھر والے جمع ہوئے. اور میں انھیں مولوی صاحب کے سامنے بسم اللہ پڑھنے بٹھا دیا گیا. اور رسوائی، زندگی کی پہلی رسوائی کا تماشہ اب شروع ہونے کو ہوا. اردگرد عزیز، دوست، ملازمین کچھ کھڑے کچھ بیٹھے ہوئے والدہ ہمشیرہ وغیرہ چلمنوں کی آڑ سے ادھر آنکھیں لڑائے ہوئے ہے. سب کے چہروں سے مسرت ٹپکتی ہوئی، لیکن یہ کیا، دیر ہوئی چلی جاتی ہے اور ضدی لڑکے کی زبان پر بسم اللہ نہیں آتی! مزاج میں شرمیلا پن پیدائشی تھا، وہ اس وقت اور کیسی بُری گھڑی رنگ لایا، جھٹ سے فر فر سنا دینا الگ، ہا، یہ بھی نصیب نہ ہوا کہ اٹک کر کچھ تو زبان سے نکالتا ایک دم سے چُپ ہو گیا، اڑ گیا! اب مولوی صاحب بچارے ہزار چمکا رہے ہیں، بڑھاوا دے رہے ہیں، دلاسے دے رہے ہیں، اور کھڑے بیٹھے جتنے ہیں سب ہی اپنی والی شاباشی کی تھپکیاں دے رہے ہیں. لیکن چاروں طرف سے جتنا اصرار ہو رہا ہے، اسی قدر اپنی زبان گنگ سے گنگ تر ہوتی جا رہی ہے ۔۔۔۔ والد صاحب مرحوم بڑے ہی حلیم المزاج تھے، لیکن آخر انسان تھے، غصہ کب تک نہ آتا،

بھرے مجمع کے سامنے یہ منظر بالکل خلاف توقع، خلاف امید دیکھ کر اور زیادہ جھنجھلا اٹھے بالآخر ایک پتلی چھڑی اٹھا کر میرے جمادی، ضدی بچہ نے مار گوارا کر لی، لیکن زبان نہ کھلنا تھا نہ کھلی لوگوں نے سمجھا بجھا کر الگ کیا اور کچھ دیر کے لئے مجھے مہلت دلا دی۔ اور خوش دلی و مسرت کی تقریب ایک عجیب قسم کی بے لطفی و اداسی پر ختم ہو گئی۔

کچھ دیر بعد وہی اَن پڑھ کھلائی بالآخر کام آئیں اور مجھے گود میں اٹھایا، خوب باتوں میں لگایا، خوب بہلایا، اور جب دیکھ لیا کہ بھوت سر سے پوری طرح اُتر چکا ہے تو آخری تیر یہ چلایا کہ ''شاباش، کیا ہمارے بھیا کو بسم اللہ کہنا نہیں آتی! اچھا ذرا پکار کر مولوی صاحب کو تو سنا دے'' اب کیا تھا، شرم کا بند ٹوٹ چکا تھا مولوی صاحب مکان میں تھے، کڑک کے پوری بسم اللہ انھیں دروازے ہی سے سنا دی۔ اب کیا تھا اُداس چہرے بحال ہو گئے۔ خوشی کی لہر گھر بھر میں دوڑ گئی، مٹھائی کی تقسیم دُھوم دھام سے ہوئی۔

ابھی ابھی فقرہ زبان سے ادا ہوا ہے کہ ''بوا نے مجھے گود میں اٹھا لیا'' فقرہ آج ۶۷ء میں ۷۴، ۷۵ سال کے پیر سال خوردہ کی زبان سے ادا ہوا ہے۔ ہائے، وہ دایہ کے گود میں جانے کی لذت! اب کیا بیان ہو؟ وہ لذت جس کا بدل، نہ کبھی جوانی کی گرمیاں دے سکیں، نہ کبھی بڑھاپے کی خنکیاں!۔۔۔ پڑھنے والے اس مقام پر پہنچ کر ایک پیر نابالغ پر ہنسنے اور مضحکہ کرنے میں جلدی نہ کریں، عجب نہیں کہ اس سن پر پہنچتے پہنچتے انھیں بھی بچپن کی پیاری معصومانہ شرارتوں کی یاد تازہ ہو جائے!۔۔۔ غضب کی حسرت ناک سچائی بھر دی ہے کسی نے اس مصرعہ میں

دو دن کو اے جوانی دے دے ادھر بچپن

جملہ معترضہ سمجھئے مگر یہاں ہے ضروری، سرشت کی اُفتاد ہی کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ ادھر کسی نے سختی کی، اور اُدھر طبیعت مقاومت و بغاوت پر تُل گئی، اور ادھر کسی نے نرمی سے کام لیا اور ادھر اپنی طبیعت بھی مروت سے دب گئی، ڈھیلی پڑ گئی، عمر بھر طبیعت کی کجی قائم رہی اور مظاہرے، ناشائستگی کے ہوتے رہے۔ آہ، یہ بدسرشتی جس کی اصلاح عمر کی آخری منزلوں میں بھی نہ ہو سکے! اسی کو کہتے ہیں ع

ٹیڑھا لگا ہے خط قلم سرنوشت کو!

دو دن کو اے جوانی.....

اب سن ۶ سال کا تھا، پڑھائی جاری تھی، اور دل ہر قسم کے پڑھنے لکھنے میں لگ گیا تھا. لیکن دوسری طرف کھیل کود اور شرارتوں میں کمی نہ تھی. بچپن سب ہی کا جیسا ہوتا ہے، اپنا بھی ایسا ہی تھا. اس سن کی بے فکری یاد آتی ہے تو فرط حسرت سے بہ قول شخصے سینے پر سانپ سا لوٹنے لگتا ہے اور مصرعہ وہی یاد آنے لگتا ہے ع

دو دن کو اے جوانی دے دے ادھار بچپن

اور جوانی کا دور ختم ہونے کے بعد جوانی سے بھی اسی قسم کے خطاب کا جی چاہتا ہے لیکن مرغوبیت بچپن کی اب بھی نمبر اول پر۔۔۔۔شام کے وقت، عین اس وقت یاد پڑ گیا کہ خوانچہ والا، خوانچہ لگا کر آواز دیتا آتا، اس کا انتظار کس شوق سے ہر روز رہتا، وہ آتا، اور میں چیزیں اس سے لے لے کر اندر والد صاحب کے پاس جاتا خریداری اکثر ہو جاتی، اور اپنے حصے میں بھی کوئی مٹھائی آ جاتی، کس مزے سے اچھل اچھل کر کھاتا! گویا گھڑی بھر کے لئے ہفت اقلیم کی بادشاہت ہاتھ آ جاتی!۔۔۔۔اب اس سن پر پہنچ کر جو سوچتا ہوں تو دنیا کی ساری ہی مادی لذتوں کی حقیقت اس خوانچہ والے کی مٹھائی سے کیا کچھ بھی زائد نظر آتی ہے!۔۔۔۔وہ سن نادانی کا کہہ لیا جائے، اب اس ''دانائی'' کے سن میں کیا حال ہے؟ انتظار ہر لذت کے لئے ہفتوں اور دنوں کا، اور کبھی ہفتوں اور مہینوں کا، بلکہ برسوں کا بھی، اور حاصل ہو جانے پر ہر بڑی سی بڑی مادّی لذت کی عمر کتنی! اور اس کے بعد پھر وہی انتظار کا چکر، کسی دوسری لذت کے لئے! اور بادشاہ سلامت ہیں کہ ایک ملک کی فتح کے بعد پھر وہی ہوس، وہی دھن، وہی فکر، دوسرے ملک کے فتح کی! ''ہم چناں در بند اقلیمے دگر!''

ایک آگ ہے کہ برابر بھڑکتی ہی رہتی ہے، سُلگتے ہی چلی جاتی ہے!۔۔۔۔اکبرؔ نے بات کتنے تجربے کی کہہ دی ہے ۔

کارِ جہاں کو دیکھ لیا میں نے غور سے
ایک دل لگی ہے سعی میں حاصل میں کچھ نہیں

اور عمر ہے کہ اس دل لگی کی نذر ہوتی ہی جارہی ہے۔ اسی حاصل لاحاصل کے پیچھے بسر ہوئی جارہی ہے! کسی اور نے بھی عمر کی بے حاصلی کے مضمون کو کیا خوب باندھا ہے ؎

عمر درا زمانگ کے لائے تھے چار دن
دو کٹ گئے آرزو میں دو کٹ گئے انتظار میں!

(۷۰۶۹)

گورکھپور سے نقلِ مکانی

۱۸۹۸ء کی دوسری ششماہی تھی کہ والد صاحب کا تبادلہ گورکھپور سے فیض آباد ہوا، وہ کچہری ہی میں تھے جب حکم نامہ ملا! اطلاعی رقعہ اسی وقت انھوں نے گھر بھجوادیا خبر پاتے ہی گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، خیر بڑوں کو تو خوشی اس کی تھی کہ وطن دریاباد قریب ہوجائے گا، فیض آباد اپنے اودھ ہی میں تھا اور دریاباد سے قریب ہی نہیں بلکہ اس کی کمشنری بھی لکھنؤ قریب اور آب وہوا بھی گورکھپور کی طرح مرطوب نہیں بلکہ معقول۔ چھوٹوں کو ان مصلحتوں اور دوراندیشیوں سے کیا سروکار۔ یہاں تو خوشی اور بے انتہا خوشی اس کی کہ ریل پر بیٹھنے کا موقع ملے گا، نئے نئے اسٹیشن دیکھنے میں آئیں گے، سارا گھر ساتھ ہوگا، نوکر چاکر ساتھ ہوں گے، اسباب کے بکس، صندوق اور گٹھر، منوں کے وزن کے ساتھ ہوں گے، بڑی ''چکلس'' رہے گی! ساری خوشی اس ہنگامے اور ہلڑ کی تھی۔ سفر کی ساری فکریں اور انتظامات تو بڑوں کے سر تھے۔ اپنے حصہ میں محض ہلو بازی آئی۔ یہ چیز توڑی، وہ پھوڑی، ایک ادھم مچاکر سارا گھر سر پر اٹھالیا۔ اور اس سارے تماشہ میں اور کون شریک ہوتا، ہاں شریک رہیں تو ہمشیرہ جو ۵، ۶ سال بڑی تھیں۔ آج یہ ساری شوخیاں، شرارتیں، جس درجہ نامعقول نظر آرہی ہیں۔ اس سن میں قوت کا فاضل یا فالتو ذخیرہ جو جسم میں فاطر کائنات کی طرف سے جمع رہتا ہے، وہ آخر اپنی نکاسی کا راستہ اور کس طرح ڈھونڈ نکالتا! اور ''نامعقول'' ہی سرتاسر ان حرکتوں کو کیوں کہیے! اور ان سے شرمندگی ہی اتنی کیوں محسوس کیجئے۔ ذکر کرتے کرتے کچھ رشک سا بھی تو اپنی اس معصومیت، سادہ دلی،

خام عقلی اور بے تصنع نادانیوں پر آ گیا!

کم فہم تھے تو کم تھے پریشانیوں میں ہم
دانائیوں سے اچھے تھے نادانیوں میں ہم

سفر کا سماں اب تک نظر کے سامنے ہے، روانگی رات کے ۹، ۱۰ بجے گاڑی سے طے ہوئی تھی، منکاپور اور لکڑی منڈی کے راستے سے. رخصتی مجمع سرشام سے ہونے لگا. وسیع مردانہ صحن کھچا کھچ بھر گیا تھا، خدا معلوم خلقت کہاں سے ٹوٹ پڑی تھی، خیر صاحب! اسٹیشن پہنچے، والد ماجد اور والدہ وہمشیرہ کے ٹکٹ سکنڈ کلاس (آج کے فرسٹ کلاس) کے تھے، ہم لوگوں کے انٹر (آج کے سکنڈ کلاس) کے. یہ درجہ خوب ہی بھرا ہوا تھا، لیکن یہاں باہر جھانکنے اور سیر دیکھنے کے شوق میں لیٹنے اور بیٹھنے کی پروا ہی کس کو تھی! نیند آنکھوں میں تھی کہاں؟ ساری خوشی اس کی کہ کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر باہر جھانکنے کو خوب ملے گا. اس کا ہوش ہی نہیں کہ آخر باہر اندھیرے گھپ میں دیکھنے ہی کو کیا ملے گا. یہ بچکانہ ذہنیت اگر بچپن میں نہ ہو، تو اسے بچپنا کہا ہی کیوں جائے. نیند آخر کب تک نہ آتی، والد ماجد کے متوسلوں میں کوئی صاحب بیٹھے ہوئے تھے، انھوں نے اپنے گھٹنے پر میرا سر رکھ کر سُلا دیا. سن پھر یاد کر لیجئے کہ ۶ سال کا تھا۔

منکاپور میں گاڑی آدھی رات کے بعد پہنچی. جہاں سے گاڑی لکڑ منڈی کے لئے بدلنا تھی، ویٹنگ روم میں ٹھہرے، اسے پہلی بار دیکھا. اور اس سن میں یہ کمرہ خوب سجا سجایا نظر آیا. پٹریوں کے درمیان اس زمانہ میں چھوٹے چھوٹے پتھر رہتے تھے، صبح انھیں دیکھ کر طبیعت لہرائی اور دوسرے بچوں کی طرح اپنے دل میں بھی یہ آئی کہ کوئی پتھر اٹھا کر پٹری پر رکھ دیجئے اور ٹرین کے گرنے اور الٹنے کا تماشہ دیکھیے ۔۔۔۔ خیر ایسا ہونے کیوں پاتا، بڑوں میں سے کسی نے دیکھ لیا اور ڈانٹ کر وہاں سے ہٹا دیا. مقصود اس ذکر سے ان لوگوں کو چونکانا ہے، جنھوں نے بچوں کو مطلق صورت میں معصوم فرض کر لیا. یہ معصوم صرف اس معنی میں ہے کہ ابھی ان کی عقلیں خام ہیں، ذہنیت کے لحاظ سے معصیت کی ذمہ داری ابھی ان پر نہیں آتی، ورنہ نفس شرارتیں تو بچوں کی اس غضب کی ہوتی ہیں کہ بڑی سی

بڑی تباہی اور بربادی دم بھر میں بُلا کر رکھ دیں.

(ص:۷۱،۷۲)

دانایانِ فرنگ کا عطیہ

عمر میں پہلی بار تھیٹر یہیں دیکھا تماشہ میرے لئے واقعی عجیب وغریب اور قابل دید تھا. وہ رنگ برنگ کے چمکیلے پردے، اور زرق برق پوشاکیں، اور گیس کے ہنڈوں کی تیز روشنی، اور پاؤڈر کے زور سے خوب گورے کئے ہوئے چہرے، وہ چمک دمک اور ایک لَے سے سب کا گانا، ناچنا، تھرکنا، بس آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں. معلوم ہوتا تھا کہ راجہ اندر کے دربار کے سچ مچ ہی ''یہ جنت نگاہ فردوس گوش ہے'' کا سامنا ہے!۔۔۔۔ اخلاق کا درس دینے والا اور دنیا کے بھی اونچ نیچ کا بتانے والا، اس وقت کون تھا؟ سب یہی سمجھے کہ چھ برس کے معصوم بچہ نے اگر ایک دفعہ ایک معصوم سا تماشہ دیکھ لیا تو اس میں قباحت ہی کیا ہوئی؟ نادان والدین اور مُربی خدا معلوم کتنے معصوموں کو اپنی نادانی اور کورفہمی سے اسی طرح غفلت بلکہ معصیت کے غار میں اپنے ہاتھوں ڈھکیلتے رہتے ہیں. والد مرحوم اور خود بھائی صاحب مرحوم دونوں ''ناچ'' کو بُرا ہی سمجھنے والوں میں کب تھے اور کبھی ناچ مجرے کی محفل میں میرے جانے کے ہرگز روادار نہ ہوتے لیکن یہ ڈرامے اور تھیٹر کی بلا تو ''صاحب'' کی لائی ہوئی چیز تھی، اور انتساب ''دانایانِ فرنگ'' کی جانب رکھتی تھی، اس کے عیب کا عیب ہونا ہم مشرقیوں کی نظر میں، اور وہ بھی انیسویں صدی کے اخیر میں، رہ ہی کیا گیا تھا! فسق ومعصیت کے کریہہ چہرے پر جب غازہ فیشن اور ''کلچر'' کا مل دیا ہے تو اس کی بدنمائی اور زشت روئی پر نظر کس کی پڑتی ہے!

(ص:۷۷)

راجہ صاحب کی کوٹھی

آدھی رات کا وقت تھا اور اخیر مارچ کا خوشگوار موسم، جب ہمارا قافلہ دریا باد اور لکھنؤ سے سیتاپور اُترا. ۶۷ سال گزر گئے، بات کل کی معلوم ہوتی ہے! بچپن کے بعض نقش کس درجہ گہرے ہوتے

ہیں!۔۔۔آدھی رات کا وقت، مگر کیسا کسل اور کہاں کا تکان! خوش خوش اور چاق چاق اترا۔ کسے معلوم تھا کہ کئی کئی سال اسی شہر میں، مثل وطن کے رہنا ہوگا، آئندہ زندگی کی اہم ترین بنیادیں یہیں قائم ہوں گی، بچپن کی معصومیت یہیں ساتھ چھوڑے گی، لڑکپن کی شرارتوں، اور پھر جوانی کی غفلتوں، سرمستیوں کا آغاز بھی یہیں سے ہوگا! اس زمانہ کی ڈپٹی کلکٹری کے رعب وداب، اثر واقتدار کا کیا کہنا۔ اسٹیشن پر چپراسیوں اور عملہ والوں کا پورا پرا جماہوا، ناوقت ہونے کے باوجود کوئی دقت نہ ہوئی۔ متعدد سواریاں موجود۔ ہم لوگ کئی من نہیں، کئی ٹن کا وزنی ساز وسامان لئے ہوئے بہ آرام اپنی عارضی فرودگاہ پر پہنچ گئے، لیکن اب اندازہ ہوا کہ یہ مکان ہماری ضرورتوں کے لحاظ سے بالکل ناکافی بلکہ تنگ ہے، پلنگ، تخت، بھاری بھاری بکس، بہت سارے سامان کا ڈھیر باہر ہی لگا دیا، صبح ہی تلاش دوسرے مکان کی شروع ہوگئی، جو بندہ یا بندہ چند ہی روز کی دوادوش میں ایک کوٹھی مل گئی وسیع وشاندار، شہر کی عام آبادی سے ذرا ہٹ کر، سول لائنز کے حدود میں۔۔۔کوٹھی راجہ صاحب محمود آباد کی تھی .....کوٹھی میں آ کر آنکھیں کھل گئیں، ایسا عالی شان مکان رہنے کے لئے اس سے قبل کیوں ملا تھا۔ کمرے چھوٹے بڑے کئی کئی۔ ایک وسطی حال بھی اور بغلی کمرے بھی۔ کئی کئی برآمدے، غسل خانہ وغیرہ۔ زنانے مکان کا صحن لمبا چوڑا اور چار دیواری نیچی ہونے کے باعث خوب کھلا کھلا۔ اصل کوٹھی سے ذرا ہٹ کر جنوب میں خوب پُر بہار چمن زار پھولوں، بیلوں، پودوں سے آراستہ، مغرب وشمال کی جانب گھنا باغ۔ آم کے علاوہ بھی طرح طرح کے درختوں اور سبزی ترکاری سے لبریز، غرض گھر بیٹھے پورا مزہ پارک کا حاصل۔ اب تک یاد ہے کہ جب پہلی بار اس کوٹھی میں قدم رکھا ہے تو اس کی وسعت تو بے پایاں نظر آئی اور حسن وزیبائش کے لحاظ سے وہ تاج محل (آگرہ) کا نمونہ بن کر نظر میں سمائی، خوب اُچھلا کودا، خوشی منائی، اور میں تو خیر بچہ ہی تھا، بڑوں کو دیکھا، سب کے چہرے کھلے ہوئے، سب ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے ہوئے۔

(۸۴۸۰)

اسکولی زندگی

سیتاپور ہائی اسکول میں عمر کے چھ سال ایک لخت گزرے، ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۸ء پانچویں میں داخلہ ہوا، اور دسویں پاس کر کے نکلا ..... لڑکپن یہیں کھویا، نوجوانی یہیں پائی. جب داخل ہوا ہوں تو دسویں سال میں تھا، جب چھوڑا ہے تو سولہویں سال میں تھا. سبزہ آغاز بلکہ مونچھیں خاص نمایاں. اور چہرے پر استرا پھیرنے کی نوبت بھی ایک آدھ بار آ ہی چکی تھی ---آہ، قلم سے ابھی یہ کیا نکل گیا؟ دسواں سال؟ اور سولہواں سال! ہائے! کبھی یہ سن بھی آج کے پیر فرتوت کا رہ چکا ہے؟ نہیں، نہیں، یہ سن کبھی اپنا کیا رہا ہوگا؟ ہاں یہ خواب دیکھ لیا ہوگا؟ کاش اس خواب سے جاگنا ہی نصیب نہ ہوتا! کتنی بھولی بسریں یادیں ان سطروں کی تحریر کے وقت تازہ ہوگئیں. کیسی کیسی حسرتیں، کیا کیا تمنائیں زندہ ہوا ٹھیں! کیا معصومیت تھی، کیسے بھولے پن، کس بے خبری کا زمانہ تھا! دنیا اس وقت کیسی رنگین، کتنی پُر بہار، کتنی دل فریب نظر آ رہی تھی!

ع گزر چکی ہے یہ فصل بہار ہم پر بھی

ع یک کاشکے بود کہ بہ صد جانو نوشتہ ایم!

ع دو دن کو اے جوانی دے دے ادھار بچپن

شوخیاں تھیں تو معصومانہ، شرارتیں تھیں تو طفلانہ، قلب میں کہاں تھیں یہ قساوت، اور کہاں تھیں فسق کی یہ گہری چھاپیں! ---کاغذ پر اب نقوش کو کوئی کیسے منتقل کر دے! وہ تو صرف تمامتر اعمال کے کاغذ پر فرشتوں ہی کے قلم سے ثبت ہیں. محبت اس اسکول کی عمارت سے، کلاسوں سے در و دیوار سے، فیلڈ سے اس کے چھٹنے سے سالہا سال تک باقی رہی، جوانی بھر باقی رہی، اور بالکل تو اب بھی کب مٹی ہے؟

ایک لمحۂ فکریہ

کالج کی زندگی میں قدم رکھتے ہی عقائد کی دنیا کہنا چاہیے کہ زیر وزبر ہونا شروع ہوگئی، تفصیل تو ایک باب میں آئے گی. یہاں سلسلۂ بیان میں بس اتنا سمجھ لیجیے کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس مسلمان قالب کا قلب باضابطہ مرتد ہوئے یا کوئی دوسرا مذہب قبول کئے اسلام اور ایمان سے یکسر خالی ہوگیا. یہاں تک کہ دوسال بعد شروع ۱۰ء میں جب انٹرمیڈیٹ کا فارم بھرنے کا وقت آیا تو مذہب کے خانے میں بجائے مسلمان لکھنے کے ''ریشنلسٹ'' لکھ دیا. یہ تفصیل اب خوب ذہن میں نہیں، بہرحال دوسال کے اندر ہی اندر یہ نوبت آ گئی تھی کہ اپنے کو مسلمان کہلانے میں تکلف ہونے لگا تھا، بلکہ اس انتساب سے اپنے کو ایک طرح کی شرم آنے لگی تھی۔۔۔۔لفظ ''تعلیم'' و ''اعلیٰ تعلیم'' سے مرعوب بلکہ مسحور ہوکر جو پرانے قسم کے مسلمان والدین اپنی اولاد کو بے تحاشہ انگریزی کالجوں میں جھونکتے جاتے تھے یہ بات ان کے سوچنے کی تھی کہ ''تعلیم'' کو وہ اپنے مکتبوں اور مدرسوں پر، اپنے دیوبند وفرنگی محل پر قیاس کررہے تھے، جہاں گانے بجانے کی آواز ہی کان میں پڑجانا ایک جُرم تھا. یہاں تو اس کے برعکس گانا بجانا داخلِ ہنر اور دلیل کمال تھا. اور نقالی سے بچنا کیسا ایکٹ کرنا اور سکھایا جاتا تھا. اچھی ایکٹنگ (نقالی) کی تو داد دل بھر دیجاتی اور انعام اور تحفے جو ملتے وہ الگ، ایسے ماحول میں لڑکے کو ڈال کر، سادہ دل مسلمان والدین کا یہ توقع رکھنا کہ لڑکا پارسا، صالح، اور کسی درجہ میں متقی ہوکر نکلے گا، کس غضب کی سادہ لوحی تھی!

درمیانِ قعر دریا تختہ بندم کردہٴ
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

کا موقع اگر یہ نہیں، تو اور کیا ہوگا۔۔۔۔یہی غنیمت تھا کہ اس وقت تک ''مخلوط تعلیم'' کا قدم درمیان میں نہیں آیا تھا، اور بنی ٹھنی لڑکیوں کو ہم نشینی شوقین لڑکوں کی میسر نہ تھی، پھر بھی ماحول جیسا بھی تھا، وہ کیا کچھ تھوڑا تھا!

(ص:۱۱۹،۱۲۰)

کتب بینی کا شوق

۱۹۶۰ء تھا کہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا نیا ایڈیشن ۳۵ ضخیم جلدوں میں لائبریری میں آ گیا۔ دیکھنے کا اشتیاق اس درجہ غالب تھا کہ نیند آنا مشکل ہوگئی۔ خدا خدا کر کے زیارت لائبریری میں ہوئی، لیکن لائبریری کے گھنٹے محدود، یہاں شوق نامحدود، اتنے سے تسکین کیا ہوتی۔ جوینده یابنده۔ آخر خبر ملی کہ مجھ سے ایک سال جونیئر، رئیس اور رئیس زادے نے اپنے ہاں منگالی ہے، شوق کے پیروں سے دوڑ کر نہیں شوق کے پروں سے اڑ کر ان کے ہاں ناخواندہ مہمان بن کر پہنچا، اور اپنا تعارف اپنی زبان سے کرایا۔ وہ بچارے ایسے بھلا مانس نکلے کہ بلا تکلف اس کی اجازت دے دی کہ ایک ایک جلد لے جایئے اور گھر پر اطمنان سے پڑھیے۔۔۔۔ اس دن کی خوشی بیان میں نہیں آ سکتی۔ جب پہلی جلد گھر پر لایا ہوں۔ باریک نفیس، انڈیا پیپر پر تھی۔ بیٹھ کر اور لیٹ کر کبھی میز پر رکھ کر اور کبھی ہاتھ میں لے کر، ہر طرح اور ہر ڈھب سے پڑھنا شروع کر دی۔ کتاب کیا ملی، دولت ہفت اقلیم ہاتھ آ گئی۔ اسے زیادہ مبالغہ نہ سمجھئے شاید پہلے کہیں کہہ آیا ہوں کہ کتابوں سے ایک نسبتِ تعبدی قائم ہوگئی تھی۔ بس چلتا تو انھیں کلیجہ سے لگاتا، چومتا، چاٹتا، ان کی پوجا کرتا!

آنکھیں خراب پہلے ہی سے تھیں اور نزدیک بینی کی علت میں عینک اسکول ہی سے لگانا شروع کر دی تھی۔ کالج میں آ کر پڑھنے کا ہَو کا اور بڑھ گیا۔ اور بے احتیاطیاں بھی اسی نسبت سے بڑھتی گئیں، دھیمی اور دھندلی روشنی میں پڑھنا، چت لیٹے ہوئے پڑھنا، تیز روشنی آنکھ پر پڑتی ہوئی میں پڑھنا، اس قسم کی ساری بد پرہیزیوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ بصارت خراب سے خراب تر ہوتی گئی۔ پھر یہ نہ جسمانی ورزش کا التزام نہ کھانے کے اوقات و نوعیت کا کوئی نظم و انتظام، نہ اور قواعدِ صحت کا اہتمام، صحت قدرۃً خراب ہی رہنے لگی۔ کہیں زکام کہیں قبض، اور کہیں گلے میں خراش، یہ معمولات میں داخل ہوگیا۔۔۔۔ یہ سب تفصیل اس لئے لکھ دیتا ہوں کہ شاید کوئی نوجوان اس سے سبق حاصل کرے۔ آنکھ، دانت، معدہ، سب ہی اللہ کی بڑی نعمتیں ہیں، ان میں سے ہر نعمت بے بدل، اور ہر نعمت کی قدر،

نعمت کے زوال کے بعد ہی ہوتی ہے. دوا علاج میں بے شک بڑا اثر ہے، لیکن جو نقصان اعضائے جسم کو مسلسل بے احتیاطیوں، بے پروائیوں، بد پرہیزیوں سے پہنچ جاتا ہے، اس کی تلافی بہتر سے بہتر علاج سے بھی ممکن نہیں۔

(ص:۱۳۳)

شکار کرنے کو آئے تھے.....!

خاندان کی ایک شاخ شہر باندا میں آباد تھی، سن میں مجھ سے بہت بڑے، بلکہ میرے والد کے ہم سن لیکن رشتہ میں میرے حقیقی خالہ زاد بھائی شیخ محمد یوسف الزماں رئیس شہر تھے، ان کے لڑکے کا نام مسعود الزماں تھا، ان سے چھوٹی ان کی دو بہنیں تھیں، بڑی عصمت النساء کی شادی اسی مارچ ۱۳ء میں ہو چکی تھی. چھوٹی بہن کا نام عفت النساء تھا، اسی شادی کے اہتمام میں پانی سے بھیگ کر سخت بیمار پڑ گئیں. ٹانگوں میں شدید درد علاج، معالجہ بہت کچھ کر ڈالا، نفع خاطر خواہ نہ ہوا۔۔۔۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ میں نے ہپناٹزم کا عمل اپنی سائیکالوجی دانی کی راہ سے نیا نیا سیکھا تھا اور خوب اس کی مشق پڑی ہوئی تھی، بیماروں کو منٹوں میں اچھا کر دیتا تھا عزیزوں اور جاننے والوں کے محدود حلقہ میں میری مانگ خاصی رہنے لگی تھی، ایک عزیز نے میری یہ شہرت ان باندے والوں تک پہنچا دی، ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ ان کے ہاں کی ایک ماما، انھیں صاحبزادی کی کھلائی، میرے ہاں موجود اور یہ درد ناک پیام لئے ہوئے ''سنتی ہوں کہ آپ سب کی دوا کرتے ہیں، اور میں اتنی سخت تکلیف میں پڑی ہوئی ہوں، ایک مجھی کو نہیں پوچھتے''.

کہہ دیا کہ ''اچھا آؤں گا'' اور سہ پہر کو اپنے مکان واقع نئے گاؤں (موتی لال بوس روڈ) سے سائیکل پر بیٹھ، ان کے ہاں پہنچ گیا وہ لوگ قیصر باغ نمبر ۲۲ میں تھے، کوئی پانچ فرلانگ کا فاصلہ ہوگا یہ لوگ قریب ہی کے عزیز تھے، میرے حقیقی خالہ زاد بھائی کا خاندان تھا، کسی سے پردہ نہ تھا، لڑکیاں سب سامنے آتی تھیں، ہم لوگوں کے ہاں برابر آمد و رفت رہتی تھی، خود اس لڑکی کا بارہا سامنا ہو چکا تھا لیکن اس وقت تک تھا اتنا جھیپو اور شرمیلا کہ کبھی نظر بھر کر دیکھا ہی نہ تھا، غرض میں پہنچا اور

کمال معصومیت کے ساتھ اس کمرے میں نیم تخلیہ کرا کے عمل ہپناٹزم (تنویم مقناطیسی) کا شروع کیا۔ایک چمکیلا بٹن دکھا کر غنودگی طاری کر دی اور یقین دلانے والے لہجے میں الفاظ بار بار اس طرح کے دُہراتے رہا کہ ''درد گیا'' ''اب بالکل گیا'' ''اب تم اچھی ہو رہی ہو،اب بالکل اچھی ہو گئی ہو'' ۔۔۔۔ہاتھ پھرانے یا پاس کرنے کا کام بجائے اپنے،مریضہ کی خالہ کے ہاتھ سے لیتا جاتا تھا اور اسی لئے ان کو مریضہ کے پلنگ پر بیٹھا رہنے دیا تھا۔اتنی احتیاط طبعی حجاب کی بنا پر اس وقت بھی تھی، کہ بدن کے کسی حصہ کو اپنا ہاتھ نہیں لگنے دیا۔۔۔۔دو چار منٹ قبل کہاں کراہ رہی تھیں،اور کہاں اب جو آنکھ کھولی ، تو درد کا فور تھا۔ہشاش بشاش مسکراتے ہوئے چہرے سے،دوسرے کمرے میں بیٹھی ہوئی اپنی والدہ کو پکار کر بولیں ''باجی اب ہم بالکل اچھے ہیں''

نوجوان قبول صورت لڑکی کی مسکراہٹ اور اس پُر مسرت آواز میں جادو کا اثر تھا! مریضہ کا چہرہ آناً فاناً معالج کی دلچسپی اور توجہ کا مرکز بن گیا!۔۔۔۔اب وہ میری مریضہ نہ تھی،اتنی ذرا سی دیر میں ''کچھ اور'' بن گئی تھی،اور معالج اب خشک معالج نہ رہا خود علاج طلب مریض سا بن گیا!

شکار کرنے کو آئے تھے شکار ہو کر چلے!

شاعری نہیں اب واقعہ تھا۔۔۔۔کہاں تو آنے میں یہ پس وپیش،تکلف وحجاب تھا اور اب کہاں اٹھنے میں طرح طرح کی بہانہ بازیاں اور حیلہ سازیاں!

خیال پہلی بار دل میں آیا کہ شادی یہیں ہو جائے،تو کیسا اچھا ہے،منہ مانگی مراد مل جائے، لیکن ہونے کیوں لگی؟ اونچا کھاتا پیتا گھر ہے بڑے لوگ ہیں، پیام اچھے اچھوں کے آئیں گے ان کے سامنے مجھے کون پوچھے گا؟ میری آمدنی ہی کیا؟ ابھی تو کماتا کچھ بھی نہیں ہوں،اور پھر پُرانی لگی ہوئی نسبت چھوڑنا آسان نہیں، برادری بھر نکو بنائے گی۔۔۔۔دن پر دن اسی ادھیڑ بن میں گزرنے لگے،باتیں بس آپ ہی اپنے دل سے کر لیتا اور طرح طرح کے خیالی پکاؤ پکا کر دل کو سمجھا لیا کرتا، کہتا بھی تو کس سے۔آخر ڈرتے ڈرتے ایک آدھ بے تکلف عزیز کے سامنے زبان کھولی۔جس نے یہ سنا واہ واہ کی،میرے انتخاب کی داد دی لیکن ساتھ ہی سب نے کہا کہ ''تمہارا خیال ادھر گیا کیسے؟ تم

ٹھہرے ایک خشک مزاج فلسفی، بیوی کا خیال اور وہ بھی اس زور کے ساتھ آخر پیدا کیسے ہوا؟''
۔۔۔۔دوسروں کی حیرت کیا دور کرتا، جب خود ہی نقشِ حیرت بنا ہوا تھا!

(ص:۱۵۹،۱۶۰،۱۶۱)

''بس یہ حضرت ملازمت کر چکے''

جوانی کا سن یوں ہی حماقت اور ناعاقبت اندیشی کا ہوتا ہے، اور پھر جب محبت کا جنون بھی شامل ہو جائے! صاحبزادہ صاحب نے جب اس فوری سفر کی خبر سنی تو بڑا بلیغ فقرہ کہا کہ ''بس یہ حضرت ملازمت کر چکے''! اور یہی ہوا، طبیعت علی گڈھ چھوڑ گھر آنے کے بہانے ڈھونڈنے لگی. برسات کے موسم میں کچھ معمولی طور پر صحت خراب ہوئی اور یہ ایک بہانہ مفت کا ہاتھ آ گیا. پورے دو مہینے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ اس کو عذر بنا کر استعفاء پیش کر دیا. صاحبزادہ صاحب خود اور دوسرے ساتھی سب منہ دیکھتے رہ گئے۔

فراق کی لذتیں بھی اس کی تلخیوں سے کچھ ایسی کم نہیں ہوتیں یہ راز ذاتی تجربہ سے علی گڈھ جا کر کھلا، ڈاک کا کتنا انتظار ہر روز رہتا؟ کچھ لفافے نفیس و رنگین فینسی قسم کے خرید کر دے آیا تھا، اور فرمائش کر آیا تھا کہ خط اگر ہر روز نہیں، تو ہر دوسرے دن ضرور لکھا کرو! ان ''روزناموں'' کے لئے مضمون ہر روز تازہ کہاں سے لایا جائے، اس سے کوئی بحث ہی نہ تھی، بحث اس سے تھی کہ خط ہر روز چلا آیا کرے، مدت فراق چند ہی روز رہی اور وہ کاٹے نہیں کٹتی تھی، ہر وقت وہی تخیل، وہی دھیان، وہی یاد۔۔۔۔محبت ان تلخیوں، گرانیوں، رنجشوں میں بھی ایک لطف، ایک لذت، ایک چاؤ پیدا کر دیتی ہے لکھنؤ میں ایک بزرگ و محترم دوست مرزا ہادی مرزا اور سوا تھے، امراؤ جان وادا والے، پتے کی بات اپنی ایک غزل کے شعر میں کہہ گئے ہیں

عشق میں حسرت دل کا تو نکلنا کیسا
دم نکلنے میں بھی کم بخت مزہ ہوتا ہے!

(ص:۱۸۱،۱۸۲)

ازدواجی زندگی

نئی بہو کی شرم ولحاظ، چاؤ چونچلے چند روز خوب چلتے ہیں، لیکن کب تک؟ آخر ہر شے کی ایک عمر بھی ہوتی ہے، ناز برداریوں کا زمانہ ختم ہوا، اور ان کی جگہ خانہ داری کی ذمہ داریاں سر پڑیں، اور بڑھیں بڑھتی گئیں اور سر پڑتی گئیں، اور ادھر اپنی بھی آنکھ کھلتی گئی اور اندازہ ہوتا گیا کہ بیوی گل اندام و پری وش سہی، ہمیشہ بزم عشرت کی تصویر اور بستر کی تفریح ہی بن کر نہیں رہ سکتی، اسے گھر کی منتظم اور بچوں کی ماں ہو کر بھی رہنا ہے، اور ان کے علاوہ بھی بہت کچھ، گوشت پوست رکھنے والی، خواہش و پسند رکھنے والی، مقصد وارادہ رکھنے والی زندہ ہستی بہر حال ہوتی ہے، اور جوں جوں یہ حقیقت کھلتی گئی، ان ناول لکھنے والوں اور شاعری کرنے والوں کم بختوں پر غصہ بھی بڑھتا گیا جنھوں نے عورت کو محض ایک حسن ونزاکت کی گڑیا اور آلۂ عیش ولذت کی حیثیت سے پیش کیا اور کبھی یہ پہلو، ان کے سامنے آنے ہی نہ دیا کہ عورت بھی مرد ہی کی طرح کتنی جسمانی معذوریوں اور بشری حاجت مندیوں کا مجموعہ ہوتی ہے، اور دل رکھتی ہے، دماغ رکھتی ہے، معدہ رکھتی ہے، بشری کمزوریوں سے محفوظ و مستثنیٰ کسی درجہ میں بھی نہیں، اور زندگی اگر ہے تو جوانی کے بعد پیری کی منزل اس کے لئے ناگزیر ہے۔

اولاد کا سلسلہ شادی ہی کے سال سے شروع ہو گیا اور کم وبیش ۱۷ سال جاری رہا۔ ظاہر ہے کہ سن کے ساتھ ساتھ نہ وہ رنگ وروغن قائم رہ سکتا تھا نہ وہ چہرہ کی آب وتاب، نہ وہ قد وقامت کی رعنائیاں، نہ وہ زلف وکاکل کی سیاہیاں، نہ وہ شباب کی رنگینیاں، لیکن یہ ''ظاہر'' اس وقت کہاں تھا؟ اتنی موٹی سی بات بھی، حقیقت اس وقت روشن دعیاں کس پر تھی؟ ''ظاہر'' کا لفظ تو قلم پر آج آ رہا ہے، جب اس دور کو نصف صدی سے زائد گزر چکا، جب اپنا سن ۷۵ ویں سال کو پہنچ گیا، اور جب وہ ۱۶ء کی نئی نویلی دلہن ۷۱، ۷۲ کے لپیٹے میں آ چکی! ایسی بات کوئی اس وقت زبان سے نکالتا تو اس بچارے کی شامت ہی آ جاتی اور بس چلتا تو اس کی زبان گدی سے کھینچ کر رکھ دی جاتی!۔۔۔۔ یہ اور

بات ہے کہ اُڑے ہوئے رنگ روپ، جُھریوں پڑے ہوئے چہرے، مرجھائے ہوئے رخساروں، دھنسی ہوئی آنکھوں، گرے ہوئے دانتوں، بھاری بلغمی جسم، نقرس زدہ ٹانگوں والی خاتون، آج بھی میری نظر میں محبوبہ ہی بنی ہوئی ہے!

۷۰، ۷۲ سال کی بوڑھی محبوبہ! آج کہاں ہے اس کی وہ خوبی و زیبائی، رعنائی و شادابی! لیکن نورِ عصمت سب سے بڑھ کر، سب سے مقدم، سب سے فائق! اقبال حکمت و معرفت کی منزلوں سے پہلے عشقِ مجازی کے بھی رہ نورد رہ چکے تھے، عمر کی ایک منزل پر پہنچ کر یہ "ترجمانِ حقیقت" شعر انھیں کی زبان سے ادا ہو سکا ہے ؎

میں نوائے سوختہ در گلو، تو پریدہ رنگ رمیدہ بو
میں حکایت غم عاشقی، تو حدیثِ ماتم دلبری!

اور اکبر تو مجاز و حقیقت کے جامع اور ایک ہی وقت میں عاشق، حکیم، عارف سب ہی کچھ تھے، کیسے اس حقیقت کا پتا نہ بتا جاتے ؎

حُسن ہے بے وفا بھی، فانی بھی
کاش سمجھے اسے جوانی بھی!

اور اس نامہ سیاہ کے ایک مخلص رقم لکھنوی مرحوم تھے وہ بھی کس مزے سے سنا گئے ہیں ؎

ہے یہ حقیقت مجاز، اب یہ کھلا ہے جا کے راز
سب ہے فریبِ آب و گل، حسن و جمال کچھ بھی نہیں

وقت کی رفتار روک دینا کس بندے کے بس کی بات ہے؟ سن و سال کے اثرات کو روک دینا کس کے اختیار میں ہے؟ کہنگی کا نقش کون دھو سکا ہے؟ جدت قدامت میں، جوانی پیرانہ سالی میں، قوت ضعف میں، ہر لحظہ و ہر آن کس قیامت خیزی سے، کس برق رفتاری سے تبدیل ہوتی رہتی ہے، اور انسان غریب کے بس میں بجز حسرت و تمنا کے اور کیا ہے؟ ۔۔۔ دعائیں بارہا کی ہیں، کہ یہ رفیقۂ حیات اُس عالم میں حور بن کر ملے، ایسی دعائیں اور مُرادیں اہل جنت کو تو ضرور مل کر رہیں گی

لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ فِيهَا وَ لَدَيْنَا مَزِيْد کا وعدہ صراحت کے ساتھ موجود ہے، ہاں اپنا نصیبہ مغفوریت کا ہونا چاہیے۔

(ص:۱۸۳،۱۸۴،۱۸۵)

بی بی کی شکل وصورت کا سوال، شادی پر چند سال گزر جانے پر کچھ زیادہ اہم نہیں رہ جاتا، درجۂ ثانوی پر آجاتا ہے، ناک، نقشہ ہر جوان عورت کا مرد کے جذبۂ شوق کو تسکین دینے کے لئے کم وبیش یکساں ہی ہوتا ہے۔ فطرت کہنا چاہیے کہ ہر جوان عورت کے چہرے پر ماء الشباب کا غازہ مَل کر اسے مرد کے لئے قبول صورت بنا ہی دیتی ہے، اور اکیلا چہرہ کیا معنٰی اس کی ساری ہی جسمانی ساخت کا تقریباً یہی حال ہے، سابقہ پڑنے پر خصوصاً ہمہ عُمری اور ہر جہتی سابقہ پر صورت سے کہیں بڑھ کر سیرت کو اہمیت حاصل ہوجاتی ہے اور سیرت کا مفہوم بڑا وسیع ہے، رہنے سہنے کے سارے رنگ ڈھنگ اور حسن معاشرت کی ساری صورتیں اس کے اندر آگئیں، میاں بیوی کا سابقہ، دنیا کے سارے سابقوں سے نرالا ہے، باہمی الفت ومحبت جتنی بھی ہو، یہ ناممکن ہے کہ روزانہ زندگی کے بے شمار جزئیات میں دونوں کے سوچنے کا ڈھنگ بالکل ایک سا ہو۔

فہم اور اختلاف کا مذاق تو لازمۂ بشریت ہے، اور پھر سابقہ اکثر صورتوں میں بیوی کو تنہا میاں سے نباہنا نہیں ہوتا، بلکہ سارے سسرال والوں اور سسرال والیوں سے نباہنا ہوتا ہے، ان میں بڑے بھی ہوتے ہیں، اور چھوٹے بھی، عورتیں بھی، مرد بھی، خود اپنی اولاد بھی، اور خوش حال گھرانوں میں نوکر چاکر بھی، یہ امتحان دنیا کے سخت ترین امتحانوں میں سے ہے، اور بڑی ہی قابل داد اور قابل تہنیت ہیں وہ بیویاں جو اس مرحلہ کو کامیابی سے طے کرے جائیں۔۔۔۔ اپنی قسمت پر رشک کرنے اور اپنے کو مبارک باد دینے کو جی چاہتا ہے کہ اپنی رفیقۂ حیات، بہ حیثیت مجموعی اسی قسم کی نکلیں، اونچے گھر کی تھیں، بڑی مغرور ہوتیں، بڑی مُسرف ہوتیں، بڑی تیز زبان ہوتیں، بڑی کاہل وآرام طلب ہوتیں، مال کی بڑی حریص ہوتیں تو میں کیا کرلیتا؟ ہر وقت کے جھگڑے قضیوں سے زندگی کیسی اجیرن ہوجاتی؟ علمی اور قلمی مشغلوں کے لئے وقت اور سکون خاطر کہاں سے لاتا؟ اللہ کا کتنا بڑا احسان ہے

کہ اس نے ان سارے خطروں سے بچادیا. یہ نہیں کہتا کہ وہ فرشتہ خصلت ہیں، بے زبان ہیں، بے نفس ہیں درویش صفت ہیں، کبھی بھی مجھے یا میرے والوں کو ان سے اذیت نہیں پہنچی ایسے بے مزہ مبالغہ کے ڈانڈے جھوٹ سے مل جاتے ہیں، اور عملی دنیا میں ایسا ہونا ممکن ہی نہیں، نرم گرم دنیا میں ساتھ چلتے ہیں پھول کے ساتھ کانٹے بھی ہوتے ہیں، یہ اللہ کا احسانِ عظیم ہے کہ فی الجملہ اب تک جیسی گزری، قابل صد رشک اور بہتوں کے لئے باعثِ رشک ہے۔

(ص:۱۸۶)

یہ غلط فہمی ہرگز نہ ہونے پائے کہ ۵۰، ۵۱ سال کی ازدواجی زندگی بس ہنستے کھیلتے بغیر کسی بے لطفی وناگواری کے پیش آئے، گزر گئی. ایسا ہونا اس مدت کے لئے تو کیا، اس کے بیسویں حصے کے لئے بھی تو اس آب وگل کی دنیا میں ممکن نہیں، اس عالم عنصری میں تو قدم قدم پر تصادم وتزاحم رکھا ہوا ہے، نفس کا نفس سے، عقل کا عقل سے، ذوق کا ذوق سے، دُلھن جب بیاہ کر آتی ہے تو اپنے گھر اور اپنے ماحول کی پڑی ہوئی راسخ عادتیں ساتھ لے کر آتی ہے، ایک خاص مزاج، ایک خاص مذاق، ایک متعین شخصیت، کچھ موم کی تو ہوتی نہیں کہ اسے جس سانچے چاہے ڈھال لیجیے، جس رُخ پر چاہیے موڑ دیجیے، عادتیں اور خصلتیں قائم ہو چکی ہوتی ہیں، پسند وناپسند، ردّ وقبول کا ایک معیار بندھ چکا ہوتا ہے، پھر غلط فہمیاں اور مغالطے ایک ہی فریق کو نہیں، فریقین کے ایک دوسرے سے متعلق رہتے ہیں، شدید جذبات نوجوانی اور جوانی کے سلامت رہیں، وہ موقع ہی غور وتأمل، بلکہ صحیح اور پوری واقفیت کا کب دیتا ہیں، آنکھیں کھلی ہوئی ہوتی ہیں، مگر ان سے کام ہی حقائق کے دیکھنے کا کون لیتا ہے. ہر ایک کی کمزوریاں اور مزاج کی ناہمواریاں، تو سابقے اور لمبے سابقے کے بعد ہی کھلتی ہیں، نہ کہ اس کے قبل. غصہ ور، تند خو میں شروع ہی سے تھا، غصہ چہیتی بیوی پر بھی شروع کر دیا شادی کے دو ہی ایک مہینہ کے بعد، وہ بچاری حیران کہ میں تو انھیں اپنا پرستار سمجھتی تھی یہ جلاّد کیسے نکلے، اپنا ہی نادری حکم چلانا چاہتے ہیں، دعوٰی عشق وفرمانبرداری کا تھا، مگر اب تو حاکم بن کر رہنا چاہتے ہیں!۔۔۔ انسان زبانی دعوے عشق ومحبت کے جو کچھ بھی کر ڈالے، حقیقت میں وہ سب سے بڑا عاشق خود اپنے نفس کا

ہوتا ہے، اپنی مرضی کو کسی کے تابع نہیں، سب پر بالا ہی رکھنا چاہتا ہے، جہاں کسی کی طرف سے مزاحمت اپنی خواہش نفس کی پیش آ گئی، سارے دعوے عشق و محبت کے دھرے ہی رہ جاتے ہیں، طوفانِ غیظ، ہیجانِ غضب سے مقابلہ کی قوت اگر کسی چیز میں ہے تو صرف خوفِ خدا میں ہے اور اس وقت کا مُلحد شوہر ظاہر ہے کہ اس دولت سے یکسر تہی مایہ تھا. یہ بات سب کے کام کی اور بڑے تجربے کی لکھ رہا ہوں، اپنے اوپر خوب بیتی ہوئی، اور اسے خوب بھگتے ہوئے.

من نہ کردم شما حذر بکنید

(ص:۱۸۸،۱۸۹)

تجربہ عقدِ ثانی کا اچھا خاصہ تلخ و صبر آزما ہو کر رہا، ضمیر بالکل ہی مردہ ہو جائے اور پرواکسی درجہ میں بھی ادائے حقوق کی نہ رہ جائے، جب تو خیر، ورنہ یوں یہ عقدِ ثانی شوہر کے لئے کوئی دل لگی اور تفریح کی چیز نہیں.

محبوب بیوی کی حالت اس زمانہ میں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی، ہر وقت گویا لڑائی پر تلی ہوئی، اور لڑائی کا بہانہ ڈھونڈتی ہوئی، اور یہ ساری بدمزاجی صرف مجھ سے، اپنی سوکن سے نہیں، سیدھے منہ بات کرنا جیسے بھول ہی گئی تھیں، لیکن طرفہ تماشہ یہ کہ اُدھر انھیں کے عزیزوں میں سے کسی نے ان کی ہمدردی میں میرے اوپر نکتہ چینی کی کہ یہ اِدھر اُلٹ پڑیں اور لگیں میری طرف سے بخشنے اور میرا دفاع کرنے۔۔۔۔ محبت کی نیرنگیاں کیا کسی دیوانگی سے کم ہوتی ہیں!

خو سمجھ میں نہیں آتی تیرے دیوانوں کی

(ص:۱۹۶)

ایک ننھی سی ایمانی کشتی الحاد کے گرداب میں

پیدائش مذہبی گھرانے میں، اور تربیت دینی ماحول میں ہوئی، ماں اور بڑی بہن کو تہجد گزار پایا، اور والد ماجد کو بھی پابند صوم و صلوٰۃ اور اچھا خاصہ دین دار، بڑے بھائی بھی تارکِ نماز یا لامذہب

نہ تھے، دین داری کے ساتھ علم دین کا بھی چرچا گھر میں تھا، دادا صاحب مفتی اور فقیہ صاحبِ فتاوٰی، اور نانا صاحب کے بھی علمی اور دینی کارناموں کے شُہرے شروع ہی سے کان میں پڑتے رہے، چچا صاحب نے وضع قطع بالکل بچپن ہی میں مولویانہ کرادی تھی، جسم پر چھوٹی سی عبا، ہاتھ میں بڑے دانوں کی خوش رنگ تسبیح، سر پر صندلی عمامہ، مطالعہ میں کتابیں بھی زیادہ تر مذہبی ہی قسم کی، گھر پر اتالیق ایک مولوی صاحب، اسکول میں عربی کے استاد ایک حاجی صاحب، دونوں کی صحبتیں سونے پر سہاگا کا کام دیتی رہیں، ساتویں آٹھویں درجہ میں جب پہنچا، ۱۲، ۱۳ سال کی عمر میں تو گویا پورا مُلّا تھا۔

دینی جوش کا یہی عالم تھا، اور اب سن کے سولہویں سال میں تھا کہ سیتاپور ہائی اسکول سے میٹرک پاس کر کے لکھنؤ آ گیا..... یہاں ایک عزیز کے پاس ایک انگریزی کتاب محض اتفاق سے دیکھنے میں آ گئی، اچھی خاصی ضخیم، ہر چیز کے پڑھنے اور پڑھ ڈالنے کا مرض تو شروع ہی سے تھا، کتاب کا کیڑا بنا ہوا تھا، بے تکان اس کتاب کو بھی پڑھنا شروع کر دیا، لیکن اب کیا بتایا جائے، جوں جوں آگے بڑھتا گیا، گویا ایک نیا عالم عقلیات کا کُھلتا گیا اور عقائد و اخلاق کی پوری پُرانی دنیا جیسے زیر و زبر ہوتی چلی گئی! کتاب مذہب پر نہ تھی، نہ بہ ظاہر اس کا کوئی تعلق ابطالِ اسلام یا ابطالِ مذاہب سے تھا..... کتاب کیا تھی، ایک بارود بچھی ہوئی سُرنگ تھی، حملہ کا اصل ہدف وہ اخلاقی بندشیں تھیں، جنھیں مذہب کی دنیا اب تک بہ طور علومِ متعارفہ کے پکڑے ہوئے ہے اور ان پر اپنے احکام کی بنیاد رکھے ہوئے ہے مثلاً عفت و عصمت، کتاب کا اصل حملہ انھیں بنیادی، اخلاقی قدروں پر تھا، اس کا کہنا تھا کہ یہ جنسی خواہش تو جسم کا ایک طبعی مطالبہ ہے، اسے مٹاتے رہنا، اور اس کے لئے باضابطہ عقد کا منتظر رہنا، نہ صرف ایک فعلِ عبث ہے، بلکہ صحت کے لئے اور جنسی قوتوں کی قدرتی بالیدگی کے لئے سخت مضر ہے، اس لئے ایسی قیدوں پابندیوں کو توڑ ڈالو، اور مذہب و اخلاق کے گڑھے ہوئے ضابطۂ زندگی کو اپنے پیروں سے روند ڈالو۔۔۔ صرف یہ ایک مضمون بیان ہوا، اسی طرح کتاب کی زد آ کر ہر ایسی قدر پر پڑتی تھی جو مذہب اور اخلاق کو ہمیشہ عزیز رہے ہیں۔ مالتھس کا مسئلہ ضبطِ تولید

ومنعِ حمل سب سے پہلے اسی کتاب میں پڑھنے میں آیا، اندازِ بیان بلا کا زوردار اور خطیبانہ تھا۔ سولہویں سال کا ایک طفلِ نادان اس سیلاب عظیم میں اپنے ایمان واخلاق کی ننھی منی سی کشتی کو کیسے صحیح وسالم رکھ پاتا! خصوصاً جب کہ کتاب کی دعوت ودعایت عین نفس کے مطابق ہو۔

مذہب کی حمایت ونصرت میں اب تک جو قوت جمع کی تھی، وہ اتنی شدید بمباری کی تاب نہ لاسکی، اور شک وبدگمانی کی تخم ریزی مذہب واخلاقیات کے خلاف خاصی ہوگئی۔۔۔۔ لاحول ولا قوۃ، اب تک کس دھوکے میں پڑے رہے، تقلیداً اب تک جن چیزوں کو جزوِ ایمان بنائے ہوئے تھے، وہ عقل وتنقید کی روشنی میں کیسی بودی، کمزور اور بے حقیقت نکلیں، یہ تھا وہ ردِّ عمل جو کتاب کے ختم ہونے پر دل ودماغ میں پیدا ہوا۔۔۔۔ پر پیگنڈے کا کمال بھی یہی ہے کہ حملہ براہِ راست نہ ہو، بلکہ اطراف وجوانب سے گولہ باری کر کے قلعہ کی حالت کو اتنا مخدوش بنادیا جائے کہ خود دفاع کرنے والوں میں تزلزل پیدا ہوجائے، اور قدم از خود اُکھڑ جانے پر آمادہ ہوجائیں۔

(ص: ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵)

شک وارتیاب کی یہ تخم ریزی ہو ہی چکی تھی، کہ عین اسی زمانہ میں لکھنؤ کی لائبریری میں ایک ضخیم کتاب کئی جلدوں میں International library of famous literature کے نام سے دکھائی دی، یہ کتاب بھی مذہبیات کی نہیں ادب ومحاضرہ کی ہے، ساری دنیا کے ادبیات کے بہترین انتخابات کو اس میں جمع کردیا گیا ہے، اس کی ایک جلد میں ذکر قرآن اور اسلام کا ہے، ذکرِ خیر نہ سہی لیکن بہر حال کوئی ہجو ومنقبت خصوصی بھی نہیں، لیکن اسی جلد میں ایک پورے صفحہ کا فوٹو بھی ''بانیٔ اسلام'' کا درج، قد آدم اور نیچے مستند حوالہ درج کر کے فلاں قلمی تصویر کا یہ عکس ہے گویا ہر طرح صحیح ومعتبر، اور ظالم نے شبیہ مبارک ایک عرب کے جسم پر عبا، سر پر عمامہ، اور چہرہ مہرہ پر بجائے کسی قسم کی نرمی کے، تیوروں پر خشونت کے بل پڑے ہوئے، ہاتھ میں کمان، شانہ پر ترکش، کمر میں تلوار حمائل، نعوذ باللہ گویا تمام تر ایک ہیبت ناک وجلاد قسم کے بدوی سردارِ قبیلہ کی!

۔۔۔۔اب آج اگر خدانخواستہ پھر اسی طرح کا کوئی نقش نظر پڑے، تو طبیعت خود ہی کہہ اٹھے، استغفراللہ، اصلیت سے اس پیکر خیالی کو تو کوئی دُور کا بھی واسطہ نہیں، حدیث میں تو چہرہ بشرہ، وضع لباس کا ایک ایک جزئیہ دیا ہے، اس ہیولے کو کوئی مناسبت ہی نہیں، یہ قطعی کسی شیطان کا گڑھا ہوا ہے، اس وقت اتنے ہوش کہاں تھے، چوٹ اور بڑی سخت چوٹ یک بیک دل و دماغ دونوں پر پڑی، اور اندر سے آواز آئی کہ توبہ، کر لیجئے، کیا دھوکا ہوا ہے، شفقت ولینت، کرم ورحمت کے سارے قصے بے اصل نکلے، حقیقت تو اب جا کر کھلی!۔۔۔۔فرنگیت سے مرعوب ذہنیت اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ خود اس فوٹو میں کوئی جعلسازی ہو سکتی ہے، اور صاحب کی بات بھی کوئی غلط ہو سکتی ہے، تحقیق ہو نہ ہو وہی ہے جو اس فوٹو سے عیاں ہے!

لیجیے، برسوں کی محنت اور تیاری کا قلعہ بات کی بات میں ڈھ گیا، اور بغیر کسی آریہ سماجی، مسیحی یا کسی اور دشمنِ اسلام سے بحث ومناظرہ میں مغلوب ہوئے، ذات رسالتؐ سے اعتقاد، بہ حیثیت رسول کیا معنٰی، بہ حیثیت ایک بزرگ یا اعلیٰ انسان کے بھی دیکھتے دیکھتے دل سے مٹ گیا! اسلام وایمان کی دولت عظیم بات کہتے، ارتداد کے خس وخاشاک میں تبدیل ہو گئی۔

(ص:۲۳۶)

ایک شخص گزرا ہے ڈاکٹر ماڈسلی (Maudesley) اس کی دو موٹی موٹی کتابیں اس زمانہ میں خوب شہرت پائے ہوئے تھیں۔

ایک Mental Physiology (عضویات دماغی)

دوسری Mental Pathalogy (مرضیات دماغی)

اس دوسری کتاب میں اختلال دماغی اور امراضِ نفسیاتی کو بیان کرتے کرتے یک بیک وہ بدبخت مثال میں وحی محمدی کو لے آیا، اور نام مبارک کی صراحت کے ساتھ ظالم لکھ گیا کہ مصروع شخص کے لئے یہ بالکل ممکن ہے کہ وہ اپنا کوئی بڑا کارنامہ دنیا کے لئے چھوڑ جائے!۔۔۔۔ایمان کی بنیادیں کھوکھلی تو پہلے ہی ہو چکی تھیں۔ اب ان کم بخت ''ماہرین فن'' کی زبان سے اس قسم کی تحقیقات عالیہ سن کر

رہا سہا ایمان بھی رخصت ہو گیا، اور الحاد و ارتداد کی منزل تکمیل کو پہنچ گئی۔۔۔۔ ایمان کو عزیز رکھنے والے خدا کے لئے ان تصریحات کو غور سے پڑھیں، اور کچھ لمحے سوچیں کہ جس تعلیم کے آتش کدے میں وہ اپنے جگر کے ٹکڑوں کو بے تحاشا جھونک رہے ہیں، وہ انھیں کدھر لے جانے والی ہیں!

(ص: ۲۴۰)

مَد کے بعد جزر

مولانا شبلیؒ کی سیرۃ النبی کی جلد اول پریس سے باہر آ گئی، کتاب شبلیؒ کے قلم سے تھی، موضوع کچھ بھی سہی، کیسے نہ اس کو شوق کے ہاتھوں سے کھولتا اور اشتیاق کی آنکھوں سے پڑھتا، کھولی اور جب تک اول سے آخر تک نہ پڑھ ڈالی دم نہ لیا، دل کا اصلی چور تو یہیں تھا۔ اور نفسِ شوم کو سب سے بڑی ٹھوکر جو لگی تھی وہ اسی سیرتِ اقدس ہی کے متعلق تھی۔ مستشرقین و محققین فرنگ کے حملوں کا اصل ہدف تو ذات رسالت ہی تھی، خصوصاً بہ سلسلۂ غزوات و محاربات، ظالموں نے بھی تو طرح طرح سے دل میں بٹھا دیا تھا کہ ذات مبارک نعوذ باللہ بالکل ایک ظالم فاتح کی تھی، شبلی نے (اللہ ان کی تربت کو ٹھنڈی رکھے) اصل دوا اسی درد کی کی، مرہم اسی زخم پر رکھا۔ اور کتاب جب بند کی تو چشم تصور کے سامنے رسول عربیؐ کی تصویر ایک بڑے مصلح ملک و قوم اور ایک رحم دل و فیاض حاکم کی تھی، جس کو اگر جدال و قتال سے کام لینا پڑا تھا تو پھر بالکل آخر درجہ میں، ہر طرح پر مجبور ہو کر، یہ مرتبہ یقیناً آج ہر مسلمان کو رسول و نبی کے درجہ سے کہیں فروتر نظر آئے گا اور شبلی کی کوئی قدر و قیمت نظر نہ آئے گی، لیکن اس کا حال ذرا اس کے دل سے پوچھیے جس کے دل میں نعوذ باللہ پورا بغض و عناد اس ذات اقدس کی طرف جما ہوا تھا شبلی کی کتاب کا یہ احسان کبھی بھولنے والا نہیں۔

۱۹۱۹ء کا آخر تھا کہ اپنے ایک عزیز سید ممتاز احمد بانسوی لکھنوی کے پاس مثنوی رومی کے چھ دفتر کان پور کے بہت صاف روشن و خوش نما چھپے ہوئے دکھائی دیئے اور طبیعت للچا اٹھی، ان بچارے نے بڑی خوشی سے ایک ایک دفتر دینا شروع کر دیا۔۔۔۔ کتاب شروع کرنے کی دیر تھی کہ

یہ معلوم ہوا کہ کسی نے جادو کر دیا۔ کتاب اب چھوڑنا چاہوں بھی تو کتاب مجھے نہیں چھوڑ رہی ہے۔ فارسی استعداد اپنی اس وقت تھی ہی کیا۔ سیکڑوں، ہزاروں شعر سمجھ میں خاک نہ آئے، اس پر بھی کشش وجاذبیت کا یہ عالم، بے اختیار پڑھتا چلا جاتا ہوں اور سر نہیں اٹھا پاتا ہوں۔ دیوانوں کی طرح ایک مستی بے سمجھے بوجھے ہی محسوس کر رہا ہوں! کہاں کا کھانا پینا، اور کیسا سونا، بس جی میں یہی کہ کمرہ بند کر کے خلوت میں کتاب پڑھے جایئے۔ کہیں کہیں آنسو بہایئے، بلکہ کہیں کہیں چیخ بھی پڑیئے! کتاب کے حاشیے غضب کے تھے خصوصاً ''مرشدنا قبلہ عالم'' کے قلم سے نکلے ہوئے۔ دیکھنے میں مختصر اور چند لفظی، لیکن سارے شعر کا جوہر ومغز نکال کر رکھ دیا (بعد کو معلوم ہوا کہ یہ ''مرشدنا'' حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ ہیں)۔۔۔۔ یاد نہیں کہ کتاب کتنے عرصے میں ختم کی۔ بہر حال جب بھی ختم کی، تو اتنا یاد ہے کہ شکوک شبہات، بغیر کسی ردوقدح میں پڑے، اب دل سے کافور تھے، اور دل صاحبِ مثنوی پر ایمان لے آنے کے لئے بے قرار تھا! گویا خدا اور رسول (نعوذ باللہ) سب کچھ وہی تھے۔۔۔ مسلمان بے شک اب بھی نہیں ہوا تھا، لیکن دل ملتِ کفر سے بالکل ہٹ چکا تھا اور تشکیک والحاد فرنگ پر لعنت بھیج رہا تھا۔

(ص:۱۵۲)

اسلام کی طرف بازگشت

ان تدریجی اندرونی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ اسلام کی طرف آ رہا تھا۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ ۵۰ فی صدی سے زیادہ مسلمان ہو چکا تھا کہ اکتوبر ۲۰ء میں سفرِ دکن میں ایک عزیز ناظر یار جنگ جج کے ہاں اورنگ آباد میں قیام کا اتفاق ہوا۔ اور ان کے انگریزی کتب خانہ میں نظر محمد علی لاہوری احمدی (عرف عام میں قادیانی) کے انگریزی ترجمہ وتفسیر قرآن مجید پر پڑ گئی۔ بے تاب ہو کر الماری سے نکالا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ جوں جوں پڑھتا گیا۔ جس ''صاحبانہ'' ذہنیت میں اس وقت تک تھا، اس کا عین مقتضاء یہ تھا کہ جو مطالب اُردو میں بے اثر رہتے اور سپاٹ معلوم ہوتے، وہی

انگریزی کے قالب میں جا کر مؤثر و جاندار بن جاتے۔ یہ کوئی مغالطہ نفس ہو یا نہ ہو، بہر حال میرے حق میں تو حقیقت واقعہ بن کر رہا۔۔۔۔ اور اس انگریزی قرآن کو جب ختم کر کے دل کو ٹٹولا تو اپنے کو مسلمان ہی پایا۔ اور اب اپنے ضمیر کو دھوکا دیئے بغیر، کلمہ شہادت بلا تأمل پڑھ چکا تھا۔۔۔۔ اللہ اس محمد علی کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ اس کا عقیدہ مرزا صاحب کے متعلق غلط تھا یا صحیح مجھے اس سے مطلق بحث نہیں، بہر حال اپنے ذاتی تجربہ کو کیا کروں، میرے کفر و ارتداد کے تابوت پر تو آخری کیل اسی نے ٹھونکی۔۔۔۔ جس اسلام سے دبے پاؤں، چپکے چپکے باہر نکل گیا تھا، اللہ کی کریمی کہ اسی اسلام میں اسی طرح آہستہ آہستہ پھر داخل ہو گیا اور جس طرح اخراج و ارتداد بہ قید یوم و تاریخ متعین کرنا دشوار رہا، اسی طرح بازگشت کا بھی دن تاریخ متعین کرنا آسان نہیں، لیکن بہر حال اب اکتوبر ۲۰ء میں مکمل ہو چکی تھی۔

ضلالت مطالعہ کے راستہ سے پائی، ہدایت بھی بحمد اللہ اس کی راہ سے نصیب ہوئی، اکبر کے مصرعہ

دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

کی تصدیق آپ بیتی سے پوری طرح ہو کر رہی، زندہ شخصیتوں کو دخل خاص ان انقلابوں میں کم ہی رہا

(ص:۲۵۴)

تجرباتِ زندگی

جی میں تو بے اختیار یہی آ رہا ہے کہ داستان زندگی (آہ، کہ کتنی لذیذ، اور آہ کہ کتنی تلخ، دونوں ایک ہی وقت میں) کُل کی کل بغیر ایک حرف چھوڑے دہرا دی جائے۔۔۔۔ داستان زندگی کے دہرانے میں لگتا ایسا ہے کہ جیسے زندگی خود کو دہرا رہی ہے! سوچنے بیٹھئے تو اپنی زندگی قابل صد نفریں و مستحق ملامت، اور نہ سوچئے تو جان عزیز سے بڑھ کر عزیز، لذیذ کوئی شے ممکن نہیں!

سب سے پہلی بات تو یہ خیال رکھنے کی ہے کہ طبعی تقاضہ و شوق اور چیز ہے اور ہوس اور چیز،

بہ قول حضرت اکبرالہ آبادیؒ

کہنے کی ایک حد ہے بکنے کی حد نہیں

جو فرق کہنے اور بکنے میں ہے وہی طبعی تقاضے اور ہوس میں ہے ع

وہ را ہبر کی ہدایت، یہ رہ گزر کا فریب

طبعی تقاضوں کی تکمیل کی جاسکتی ہے، لیکن ہوس کی آگ بجھانے کے لئے کوئی حد و نہایت نہیں، ہوس رانی جتنی بھی کیجئے گا، طبیعت بجائے آسودہ ہونے کے حریص سے حریص تر ہوتی جائے گی، آگ بجھنے کے بجائے بھڑکتی ہی جائے گی، ضرر و زیاں صریح واقع ہوتا جائے گا، لیکن طبیعت کو اس کا احساس ہی سرے سے جاتا رہے گا۔۔۔۔ نفس امارہ بڑا منطقی واقع ہوا ہے، ہر نفس پرستی، ہر ہوسنا کی اور اس سے پیدا ہونے والے ہر ضرر و زیاں کی کوئی نہ کوئی خوب صورت سی تاویل و توجیہ ہر بار کرے گا اور ھل من مزید کے نعرے لگاتا ہوا آپ کو برابر مغالطہ میں مبتلا اور دھوکے میں الجھائے رہے گا! لازم ہے کہ ہر خواہش نفس پر حاکم طبیعت کو نہیں، عقل کو رکھیے اور عقل کی حاکمیت کا نفاذ بڑی سختی سے کرتے رہیے، ہیجان نفس کے وقت (عام اس سے کہ وہ ہیجان غصہ کا ہو، حبِ جاہ کا ہو، حرص مال کا ہو، شہوت جنسی کا ہو) عقل تک اندھی اور مغلوب ہو جاتی ہے! ایسے موقع پر دست گیری شریعت سے پایئے، اور پناہ احکام خداوندی میں ڈھونڈیئے، نفس کو بے لگام کسی حال میں بھی نہ ہونے دیجیے، اس شورہ پشت گھوڑے سے آپ ذرا بھی غافل ہوئے اور اس نے آپ کو زمین پر دے پٹکا!

(ص:۳۷۶، ۳۷۷)

آخری سلام

شادی عمر کے ۲۴ ویں سال اپنی پسند و محبت پیدا ہو جانے کے بعد کی، اور وہی عشق بہت سے اتار چڑھاؤ بڑے ہی پیچ و خم کے بعد آج تک قائم ہے۔۔۔۔ عشق کا لفظ غلط استعمال ہوا "فریب آب و گل" کا نام عشق رکھنا، حقیقت اور لغت دونوں پر ظلم کرنا ہے. اور اسی کھوکھلے عشق کا حاصل حصول

بقول اکبرؔ ؎

کارِ جہاں کو دیکھ لیا میں نے غور سے
ایک دل لگی ہے سعی میں حاصل میں کچھ نہیں

دل لذت اٹھانے پاتا بھی نہیں کہ خود لذت چھلاوہ بن کر نظر سے غائب ہو جاتی ہے!

بڑے ہی تلخ تجربوں اور خوب ہی ٹھوکریں کھانے کے بعد یہ پُرزور وصیت سارے ناظرین سے ہے کہ دنیا سے دل ہرگز نہ لگائیں، اور اس کے مکر وفریب میں نہ آئیں جس کے صدہا چہرے اور بے شمار نقابیں سہی لیکن انسان بہرحال جسم وجسد کے ساتھ ہی اس خاکدان میں بھیجا گیا ہے، اس کی حکمت کی بھی رعایت رکھنا لازمی ہے، دنیا کو برتئے مگر دل نہ لگایئے، دل تو آخرت ہی سے لگائے رہیے، اکبر ہی کے لفظوں میں ع

غافل نے ادھر دیکھا، عاقل نے ادھر دیکھا

دیکھئے، ابھی کتنی اور میعاد کاٹنا ہے، دل تو اسی مژدہ جاں بخش کے سننے کو تڑپ رہا ہے کہ **ارجعی الیٰ ربک راضیة مرضیة فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی.**

اپنے حق میں تو بس ایک ہی اور آخری دعا یہ ہے کہ بُلاوا اس وقت آئے جب یہ ناکارہ وآوارہ قلم دین کی خدمت میں مشغول ہو، اور کسی عدو اللہ کے ہفوات کا جواب دے رہا ہو، یا اپنے محبوب کی کسی ادا کی معرفت کی دعوت دے رہا ہو!

پڑھنے والے رخصت! اس عالم ناسوت میں آخری سلام، ملاقات بہ فراغت واطمنان انشاءاللہ بس اب جنت ہی میں ہوگی!

(ص:۳۸۰)

تیسرا باب

سیاحتِ ماجدی

سیر وسیاحت (سیروا فی الارض) قرآنی تحریک کی وجہ سے مسلمانوں میں شروع سے چلی آرہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان سیاحوں کے سفرنامے بکثرت پائے جاتے ہیں اور وقتاً فوقتاً آج بھی منظرِ عام پر آتے رہتے ہیں۔ اور کچھ بعید نہیں جو اس فن کے موجد بھی یہی رہے ہوں!

جب آدمی اپنوں کو چھوڑ کسی دوسرے مقام کا سفر کرتا ہے تو وہاں جو چیزیں اس کے مشاہدہ میں آتی ہیں اور جو تأثرات دل میں ہویدا ہوتے ہیں، خود اس کی دلی تمنا اور اس کے عزیزوں، رفیقوں اور مخلصوں کی اصرار کے ساتھ یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی دیدنی دوسروں کو بھی سنائے۔ یہی چیز آدمی کو سفرنامہ یا رودادِ سفر لکھنے پر مجبور کرتی یا محرک ہوتی ہے۔

مولانا دریابادیؒ کے قرب وجوار کے کئی ایک سفر ہوئے ہیں۔ کوئی کسی تقریب یا اجلاس میں شرکت کی غرض سے اور کوئی کسی رفیقِ خاص کی زیارت کی خاطر، لیکن ان میں مقصد کے اعتبار سے سب سے اعلیٰ ''سفرِ حجاز'' ہے اور مولانا نے اس کی اہمیت کے پیشِ نظر بڑی تفصیل اور بڑے سوز وگداز اور ادبی انداز میں اس کی روداد قلم بند فرمائی ہے۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے دیباچہ کا یہ اقتباس اس کی شہادت کے لئے کافی ہے۔

> ''اس سفرنامہ کی اصلی حقیقت اور حقیقی عزت میری نگاہ میں دو باتوں سے ہے ایک اس کی انشاء پردازی کہ مصنف کے قلم نے اس میں انتہائی سادگی کا کمالِ حسن دکھایا ہے۔ سہل الفاظ، سادہ ترکیبیں اور پھر مشاعرانہ تخیل، اس لئے انشاء کی حیثیت سے اس کی اہمیت بہت کافی ہے۔ دوسری حیثیت کی چیز وہ تأثرات اور وجدانیات ہیں جو اس کتاب کے فقرہ فقرہ سے نمایاں ہیں

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صاحب دل مصنف نے کاغذ کی سطح پر اپنے دل کے ٹکڑے پھیلا دیئے ہیں. میں سفرِ حجاز کی یہ بھی برکت سمجھتا ہوں کہ ان کے قلم نے ان کے دل کی ایسی ترجمانی کی ہے اور روح نے جسم کا ایسا قالب اختیار کیا ہے کہ باطن ظاہر، محجوب منکشف، اور نادیدہ دیدنی ہو گیا ہے، مجھے امید ہے کہ فاضل مصنف کی تصنیفات میں اُن کے قلم کی یہ سرسری تحریریں سب سے زیادہ دیرپا، سب سے زیادہ سودمند اور سب سے زیادہ مقبول ہوں گی ..... انھوں نے یہ صفحات لکھ کر ہماری زبان، ادب، تاریخ، جغرافیہ، فقہ اور تصوف سب پر احسان کیا ہے، اور ظاہر و باطن لفظ و معنٰی اور روح و جسم کے مختلف مناظر کا ایسا دلکش نظارہ گاہ تیار کیا ہے کہ ہر خیال و ذوق کا آدمی اپنے اپنے خیال و ذوق کے مطابق اس سے بہرہ ور ہو سکتا ہے"

یہ رودادِ سفر، سفرِ حجاز کے نام سے بڑی مقبولیت حاصل کر چکی ہے اس کے علاوہ مولانا دریابادیؒ کے دو اور سفرنامے منظر عام پر آ چکے ہیں ایک کا نام "گیارہ سفر یا سیاحتِ ماجدی" ہے اس میں مولانا نے حیدرآباد، مدراس، بہار، بھوپال وغیرہ کے سفر کی تفصیل درج کی ہے اور دوسرا "ڈھائی ہفتہ پاکستان میں" کے نام سے ہے جو سفر گورنر جنرل ملک غلام محمد صاحب کی دعوت پر ہوا تھا. ---ان تینوں سفرناموں کی بالترتیب تین فصلیں قائم کی گئی ہیں۔

فصل اول

سفرِ حجاز

الوداع

حج بیت اللہ چند شرائط کے جمع ہو جانے پر ہر مسلمان پر اسی طرح فرض عین ہے جس طرح ہر روز پانچ وقت کی نماز، یہاں نماز ہی کا فریضہ کب خوش دلی اور اپنے شرائط کے ساتھ ادا ہو پاتا ہے جس میں نہ کچھ خرچ ہے اور نہ کوئی خاص محنت، جو فریضۂ حج کے نہ ادا کرنے کا رونا رویا جائے! عمر کی گھڑیاں خاموشی اور تیزی کے ساتھ گزرتی رہیں. دن ہفتوں میں، ہفتے مہینوں میں، مہینے برسوں میں تبدیل ہوتے رہے اور اس فریضہ کی ادائیگی کا خیال تک نہ آیا. کلام مجید کی آیات میں اور رسولِ برحقؐ کی احادیث میں خدا معلوم کتنی بار ادائے حج کی فرضیت اور تاکید نظر سے گزری، اور عدم ادائے حج کی وعیدیں بار بار پڑھیں. پر قلب کی غفلتوں اور نفس کی شرارتوں اور ہوش و خرد کی ہرزہ کاریوں نے ہمیشہ مشورہ یہ دیا کہ یہ اوامر و احکام دوسروں ہی کے لئے ہیں، اپنے کو ان سے کیا تعلق، اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ عمر کی کتنی بیش بہا فرصتیں اور زندگی کی کتنی جا کر نہ آنے والی مہلتیں، اسی غفلت، اسی بے حسی اور اسی قساوتِ قلب کی نظر ہو گئیں!

ہندوستان کے طول و عرض میں بے شمار سفر، بہ ضرورت اور بلا ضرورت کر ڈالے؟ جو ایک ہی جگہ سفر کرنے اور حاضری دینے کی تھی وہاں سر کے بل چلنا کجا، پیروں کے بل بھی جانا نصیب میں نہ آیا! بنگلوں اور کوٹھیوں حویلیوں اور ڈیوڑھیوں کے گرد چکر لگانے میں ایک عمر گزر گئی، پر وہ آستانِ پاک جو اس قابل تھا کہ اس کے گرد طواف کرنے میں ساری عمر تمام کر دی جاتی اور اس پر پروانہ وار اپنی جان نثار کر دی جاتی، گردشِ تقدیر نے محروم رکھا تو اُسی کی جبیں سائی سے! ملک کے گوشہ گوشہ کی

سیر کر ڈالی، پر نہ توفیق ہوئی تو ایک اُس سرزمین کی زیارت سے مشرف ہونے کی، جس کی سربلندی پر آسمان کو بھی رشک ہے، جہاں کھڑے ہو کر اللہ کے خلیلؑ نے اپنے رب کی توحید کی منادی کی تھی، اور جس کی ریگ کے ذرّوں پر اللہ کے حبیب ﷺ کے نقشِ قدم ممکن ہے کہ آج تک ثبت رہ گئے ہوں!

محرومیوں کی حکایت دراز، اور کوتہ بینیوں کا سلسلہ طویل، لیکن رحمتِ باری بے حساب اور فضلِ خداوندی بیکراں، بڑے بڑے مجرم اپنی سیہ کاریوں کی پوٹ کی پوٹ لے کر آئے اور بحرِ کرم کے ایک قطرے نے سارے دفتروں کی سیاہیاں دم بھر میں سفیدی سے بدل دیں، اور کانپتے آئے اور ہنستے کھلکھلاتے واپس گئے، اقلیمِ سخن کے تاجدار خسروِ نامدار نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے ؎

قطرۂ زآبِ رحمت تو بس است شستنِ نامۂ سیاہ ہمہ!

اور ایک قصباتی کج مج کی زبان نے یوں اپنی بولی میں عرض کیا ؎

سمجھے تھے سیہ کاری اپنی ہے فزوں حد سے
دیکھا تو کرم تیرا اس سے بھی سوا پایا

بالآخر، جس کی رحمت ابرِ کرم بن کر سوکھی کھیتیوں کو آن کی آن میں سرسبز و شاداب کر دیتی ہے، اس کی مشیت اس کی متقاضی ہوئی کہ ایک محرومِ عمل، مردہ قلب کو اپنے حرمِ محترم کی حاضری و طواف اور اپنے حبیب پاک ﷺ کی آرام گاہ کی زیارت سے مشرف فرمائے، چنانچہ ارادہ ہوا، منصوبے بندھے اور زبان پہلی بار کھلی لبیک اللھم لبیک لا شریک لک لبیک کے تلفظ پر کھلی! ملکوتیوں کی سجدہ گاہ، اور ایک سراپا عصیاں کی جبیں! ایازِ قدرِ خود شناس، عقل اس خوش قسمتی پر دنگ، خرد اس بوالعجبی پر حیران!

ہے آرزو کہ ابروِ خم کو دیکھئے
اس حوصلہ کو دیکھئے اور ہم کو دیکھئے

لیکن ربوبیت کے عجائب کاروبار ہیں. اپنا نام رب العلمین ارشاد فرمایا ہے، رب الصالحین نہیں فرمایا. مرتبۂ فلاح پر صرف اتقیاء و صالحین، ابرار و اخیار ہی نہیں پہنچائے جاتے، ربوبیت کا تعلق

اشرار و فجار سے بھی ہے۔ دستگیری صرف نیکوں ہی کی نہیں، بدوں اور بد سے بدتروں کی بھی ہوتی رہتی ہے۔ ہوائے بہار جب چلتی ہے تو چمن کے خوشبو دار پھولوں اور چراگاہ کی گھاس کی پتیوں دونوں کو مہکا دیتی ہے! ؎

اے بدر ماندگی پناہ ہمہ کرم تست عذرخواہِ ہمہ

(ص:۱۳،۱۴،۱۵)

آدابِ سفرِ حج سے ہے کہ اس سفر کو سفرِ آخرت کا نمونہ سمجھے۔ احرام کی چادروں کو کفن کی چادروں کا نمونہ تصور کرے، اور چلتے وقت اپنے تمام ملنے والوں اور اپنے سے تمام تعلق رکھنے والوں سے خطاؤں کی معافی طلب کرے۔ ناظرینِ سچ تک فرداً فرداً پہونچنا ممکن نہیں، ان کے حقوق کی ادائیگی میں مدیرِ سچ کی جانب سے خدا معلوم کتنی غفلتیں اور کتنی کوتاہیاں اب تک ہوئی ہوں گی اور خدا معلوم کتنوں کی دل آزاریاں ان اوراق کے ذریعہ سے ہو چکی ہوں گی سب کی خدمت میں بمنت ولجاجت گزارش ہے کہ اپنے اس خادم کی بڑی اور چھوٹی، دانستہ اور نادانستہ ساری خطاؤں کو اللہ کے واسطے صدقِ دل سے معاف فرمائیں۔ وہ جو حاکموں کا حاکم ہے، ان کی خطاؤں کو بھی معاف فرمائے گا اس دربار کے سچے سفیر کی بشارتیں اور وعدے اس باب میں تصریحاً موجود ہیں۔

التماسِ عفو کے بعد دوسری گزارش سچ کی برادری سے یہ ہے کہ اس خادم کو دعائے خیر سے محروم نہ رکھا جائے اور زاہد و فاسق سب کی سننے والے کی بارگاہ میں بار بار عرض کیا جائے کہ اس گنہگار کو حج مبرور اور زیارتِ قبول نصیب ہو۔ حکم ملا ہے کہ توشۂ سفر کا سامان رکھو اور پھر خود ہی ارشاد ہوا کہ بہترین توشہ سفر تقوٰی ہے۔ (وتزودوا فان خیر الزاد التقوٰی) یہاں تقوٰی کیسا، تقوٰی کا سایہ بھی نہیں پڑنے پایا، سہارا جو کچھ ہے وہ کسی رؤف و رحیم کی رحمتِ بے حساب اور کرم بے انداز کا ہے، اور اس کے بعد اگر کسی توشہ کی طلب و ہوس ہے تو وہ اہل دل کی دعائیں ہیں۔ زہے نصیب اس کے جس کے نصیب میں یہ توشہ آجائے!

(ص:۱۸)

واپسی

وہ جو گھر سے خالی ہاتھ گیا تھا خالی ہاتھ گھر واپس آ گیا۔ آج سے چار ماہ قبل سینے میں خدا معلوم کتنی امیدوں اور ارمانوں کا ہجوم تھا، دل کیا کیا تمنائیں اور آرزوئیں لئے ہوئے تھا، واپسی پر دیکھا تو اپنی تیرہ بختی سب پر غالب اور اپنی زبوں طالعی سب سے بھاری۔ کریم کا دستِ کرم کوتاہ نہیں اور بخشنے والے کی جود و عطا کی حد و نہایت نہیں لیکن لینے والے کا ظرف بھی تو آخر کسی درجہ میں دیکھنے کی چیز ہے! موسم گل میں جب ہوائے بہار چلتی ہے تو ڈالی ڈالی جھومنے اور پتی پتی کھلنے لگتی ہے، لیکن شجرِ بید میں پھل لگتے اور زمین شور میں سبزہ کو لہلہاتے ہوئے بھی کسی نے دیکھا ہے!

نظارے ایک سے بڑھ کر ایک بے نقاب تھے لیکن دیکھا انھیں نے جو آنکھیں رکھتے تھے۔ بٹ سب کچھ رہا تھا لیکن پایا انھیں نے جو دامن پھیلائے اور جیب کھولے ہوئے تھے۔ دوستوں نے کیا کچھ نہیں دیکھا، رفیقوں نے کیا کچھ نہیں پایا! پر ایک بدنصیب ایسا بھی تھا جس نے دیکھا تو صرف یہ دیکھا کہ دوسرے دیکھ رہے تھے اور پایا تو صرف یہ کہ دوسرے پا رہے تھے۔

شاعر نے کسی زمانہ میں بصد حسرت و یاس کہا تھا ؎

ہر کس خمے کشیدہ در مجلس وصالش چوں دورِ خسروآمد جام و سبو نماند

جام و سبو کے دور آج بھی چل رہے تھے، خم کے خم آج بھی لنڈھائے جا رہے تھے ساقی کی محفل بھی ویسی ہی گرم تھی، لطف و التفات کے دریا آج بھی بہہ رہے تھے، پر جس کا دستِ طلب خود ہی شل اور زبان سرے سے گنگ ہو، اس کی حسرت انجامیوں اور ناشادکامیوں کا علاج کیا؟ اور کس کے پاس؟ سکندر آبِ حیوان تک پہونچ کر بھی ناکام واپس آتا ہے، استقساء کا مریض دریا کے کنارے کھڑے ہو کر بھی پیاسا ہی رہتا ہے۔ خرِ عیسیٰ مکہ جاتا ہے اور واپسی کے بعد خر ہی باقی رہتا ہے۔ پھر اگر کوئی ظلوم و جہول آستان پاک تک پہونچ کر بھی دولتِ دیدار سے محروم رہے تو اس میں فطرت کی بخششوں کا کیا قصور؟ اور ساقی کی فیض پاشیوں کا کیا گلہ؟

حسرت پہ اس مسافرِ بے کس کی روئیے
جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

(ص:۲۰،۲۱)

بارِ معاصی وذنوب سے دبا: اانسان! کیا تو گناہوں کے بوجھ کا مقابلہ اللہ کے عفو ورحمت سے کرنا چاہتا ہے؟ تیرے گناہ خواہ کتنے ہی ہوں بہر حال گنے جاسکتے ہیں، پر خدائے رحمٰن ورحیم کے کرم بے حساب کی پیائش ساری دنیا جہاں کے مہندس مل کر بھی کر سکتے ہیں؟ پھر یہ کیسی نادانی ہے کہ محدود کو غیر محدود کے مقابلہ میں لایا جائے؟ کیا وہ جو اپنے بندوں کو محض انھیں کے نوازنے اور سرفراز کرنے کے لئے اپنے در پر حاضری کے لئے بلاتا ہے. وہ صرف نیک کرداروں کو چُن لے گا اور نالائقوں کو اپنے آستانہ سے دھتکار دے گا؟ اپنے خوانِ کرم سے اٹھادے گا؟ یہ خیال کرنا بھی کتنی سخت گستاخی اور کیسی صریح نادانی ہے؟ اسی لئے فرمایا ہے اس بشارت دینے والے نے جس سے بڑھ کر کوئی بشیر اب تک پردۂ زمین پر پیدا نہیں ہوا کہ

اعظم الناس ذنبا من وقف	سب سے بڑا گناہگار وہ انسان ہے جو
بعرفة فظن ان الله لم يغفر	عرفات میں وقوف کرے اور پھر یہ سمجھے

کہ اس کی مغفرت نہیں ہوئی.

اس پروانۂ مغفرت کے بعد کیا کوئی دیوانہ ہے کہ جو اپنے سفرِ حج کو ضائع سمجھے؟ جو جو نعمتیں اس سہ ماہہ سفر میں نازل ہوئی ہیں، جو جو نوازشیں اس درمیان میں سرفراز کرتی رہیں، کس کی زبان میں طاقت ہے کہ ان کا شکریہ ادا کر سکے! بہر حال جو کچھ پیش آیا وہ اپنی اہلیت سے کہیں بڑھ کر اور اپنے ظرف سے کہیں زائد۔

(ص:۲۳)

روانگی۔۔۔بمبئی

عید ہر سال آتی ہے۔اب کی عید ہر سال کی طرح معمولی عید نہ تھی، کسی کے آستانے پر ذوق جبیں سائی کو دل بیتاب کیے ہوئے تھا۔کسی کے دربار میں حاضری کا دن ایک ایک کر کے گنا جارہا تھا۔رمضان ختم ہوا عید آئی، انتظار کی گھڑیاں کٹیں، وعدۂ دیدار پورا ہونے کی ساعت آئی مہجوری کے بعد حضوری، انتظار کے بعد دیدار، پیاس کے بعد سیرابی، جس کارفرمائے فطرت نے ازل سے یہ قانون رکھ دیا ہے۔اسی نے ماہ مبارک کا خاتمہ موسم حج کے آغاز پر رکھا ہے۔

سفر جلجلاتی ہوئی ریگ والی زمین کی طرف تھا۔گرمی کے موسم میں اس آسمان کے چھت کے نیچے تھا جس کا آفتاب تمتماتا ہوا ہوتا ہے، ہوٹلوں اور پارکوں، آبشاروں اور سبزہ زاروں کی طرف نہ تھا، خشک اور چٹیل میدانوں، بے آب وگیاہ ویرانوں اور آگ اور خاک برسانے والے ریگستانوں کی جانب تھا۔ایک گنہ گار امتی، اپنے شفیع وشفیق آقا کے آستانے پر حاضر ہورہا تھا۔بندے کی حاضری اپنے مولیٰ کے دربار میں تھی، بھاگا ہوا غلام تھک ہار کر، پچھتا کر اور شرما کر پھر اپنے مالک کی طرف رُخ کر رہا تھا، ذرّہ آرزومند تھا کہ آفتاب کی تابش سے جگمگا اٹھے، قطرہ کو ہوس ہوئی کہ بحر بیکراں کے وصل کا لطف اٹھائے، مشت خاک کو یہ دماغ ہوا کہ نور پاک کے جاروب کشوں کی فہرست میں اپنا نام لکھائے جو کچھ بھی نہ تھا، اسے یہ ولولہ ہوا کہ جو سب کچھ ہے اس سے تعلق وپیوند کیا جائے۔

ہے آرزو کہ ابروئے پرخم کو دیکھیے
اس حوصلے کو دیکھیے اور ہم کو دیکھیے

حاضری کا حکم دینے والے کا حکم ہے کہ زادِ سفر ساتھ لے کر چلو وتزودا اور خود ہی زادِ راہ کی تشریح بھی فرمادی ہے کہ بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے فان خیر الزاد التقوٰی۔یہاں قحط تھا تو اسی جنس کا محرومی تھی تو اسی سرمایہ سے، تہی دستی تھی تو اسی توشہ راہ سے، دل ہچکچایا، طبیعت رکی، ارادہ کا قدم ڈگمگایا، معاً یاد آیا کہ وہ خدائے قدیر ورحیم، جو ہر روز تاریکی کو نور میں بدلتا رہتا ہے، ہڑے

ہوئے فصلہ اور عفونت پھیلانے والی کھاد سے طرح طرح کے خوشبو دار رنگا رنگ گل بوٹے گلاب اور چنبیلی، جوہی اور موتیا، خوش رنگ و با مزہ پھل پھول، جاں نواز میوے اور غلے وغیرہ اگا تا رہتا ہے۔ بے جانوں میں جان پھونکتا رہتا ہے۔ کیا وہ تباہ کاروں کو اپنے دربار میں حاضری کی نعمت سے سرفراز کرنے پر قادر نہیں؟ کیا درماندوں اور خستہ حالوں کے دامن کو گوہر مراد سے بھر دینا اس کے فضل و کرم سے کچھ بعید ہے؟ کیا وہ صرف نیکوں اور پاکوں، پارساؤں اور پاکبازوں ہی کا والی و وارث رب اور مالک ہے؟ اور مدہوشانِ غفلت، اس کے لطف و رحمت سے خدانخواستہ محروم ہی رہیں گے؟۔۔۔۔ ٹوٹی ہوئی ہمت بندھی، دھڑکتا ہوا دل تھما، ڈگمگاتے ہوئے پیر سنبھلے۔

(ص:۲۵، ۲۶، ۲۷)

جہاز

ٹھیک ۱۱ بجے شب کو جہاز میں حرکت ہوئی اور اس نے آہستہ آہستہ ساحل کو چھوڑنا شروع کیا، لیجئے دیکھتے ہی دیکھتے قرب و جوار کی ساری عمارتیں نظروں سے پوشیدہ ہوگئیں، اور صرف ان کی روشنایاں رہ گئیں، اللہ اللہ! کیا وقت ہے، کیا سماں ہے، جہاز میں حرکت تو خیر جیسی کچھ بھی ہو، اپنے دل کی حرکت کا کیا حال ہے، وطن ہر لحظہ دور ہوتا جاتا ہے، وطن کی دلچسپیاں ساری کی ساری پیچھے چھوٹی جاتی ہیں، بیوی بیشک ساتھ ہیں، لیکن بچیاں وہیں ہیں والدہ ماجدہ وہیں ہیں، بھائی وہیں ہیں، بہن وہیں ہیں، سارے اعزہ اور دوست وہیں ہیں، ساتھ کام کرنے والے وہیں ہیں لیکن الحمدللہ دل میں اس وقت ان میں سے کسی کی فکر نہیں، فکر ان کی نہیں جو پیچھے چھوٹ رہے ہیں، دوستو! عزیزو! خدا حافظ! خاکِ وطن کے ذرو! خدا حافظ! سب کو اسی مالک و مولیٰ کے سپرد کیا، سب کو اسی کریم و رحیم کی حفاظت میں دیا جس کے ایک مادّی در پر جبیں سائی کو یہ ننگ وطن و ننگ خاندان اس وقت روانہ ہو رہا ہے اس کی خطائیں معاف کرو، اس کے قصوروں سے درگزر کرو، اس کی بیہودگیوں پر خاک ڈالو۔ اللہ تمہارے مرتبے بلند کرے گا۔ اللہ تمہاری خطائیں معاف کرے گا۔

لبیک اللھم لبیک ۔ اللھم لبیک الیک توجھت وعلیک توکلت ووجھک

اردت فاجعل ذنبی مغفورا وحجی مبروگرا وارحمنی ولا تخیبنی واقض بعرفات حاجاتی انک علیٰ کل شئ قدیر

خواجہ حافظ نے مدت ہوئی فرمایا تھا ؎

شب تاریک و بیم موج وگرداب چنیں حائل
کجا دانند حال ما سبکسارانِ ساحلہا

لیکن حقیقت یہ ہے کہ شب تاریک ہی نہیں روزِ روشن میں بھی، اور ''بیم موج'' ہی کے وقت نہیں، سمندر کے سکون کے وقت بھی، اور گرداب وتلاطم ہی کی حالت میں نہیں، پوری ہمواری کی حالت میں بھی حاجیوں کے جہاز کی کیفیت کا اندازہ صرف حاجی کرسکتے ہیں بغیر آپ بیتی کے ''سبکسارانِ ساحل'' اس کا صحیح اندازہ کرنے سے بالکل قاصر ہیں۔

(ص:۵۱،۵۲)

میٹھا پانی اول تو ملتا بہت محدود مقدار میں ہے، پھر اس کے ملنے کے اوقات مخصوص معین اور مختصر. یہی حال کھانا پکانے کی لکڑی کا ہے جو جہاز پر بلا قیمت تقسیم ہوتی رہتی ہے. پانی اور لکڑی دونوں کی تقسیم کے وقت جو ہنگامہ ہوتا ہے جس طرح کنستر سے کنستر اور سر سے سر ٹکراتے ہیں، اور بوڑھوں اور کمزوروں کو جس قیامت کا سامنا ہوتا ہے، ان سب کا تعلق دیکھنے سے ہے. سننے سے نہیں، لیکن درحقیقت صبر وشکر کا سبق بھی اللہ کی اسی بے زبان مخلوق سے لینا چاہیے. دیکھنے والوں کو ان پر ترس آرہا ہے لیکن وہ اپنے حال میں مست، دھن میں مگن! انھیں نہ برقی کے قمقموں کی طلب، نہ پنکھوں کی ہوس، نہ برف کی خواہش، نہ لائم جوس کی تمنا، کہیں تلاوت ہورہی ہے، کہیں وعظ کی محفل گرم، کہیں دیگچیاں مانجی جارہی ہیں، کہیں کپڑے اپنے ہاتھ سے دُھل رہے ہیں، کہیں روٹیاں توے پر پڑ رہی ہیں، اور تقریباً سارے کے سارے بے فکر و بے غم! ان کا میلا پن قابل نفریں، لیکن ان کا صبر قابل رشک! ان کا شکر قابلِ داد اور ان کی ہمت قابلِ آفریں!

مغرور و بر خود غلط، متمرد و سرکش، غافل و مدہوش خاک کا پتلا، کس قدر اپنی حیثیت کو بھولا ہوا، اور اپنی حقیقت کو بھلائے ہوئے ہے، حج کا سفر ایثار و فدویت، فروتنی و نفس کشی کا مدرسہ ہوتا ہے. اس پر بھی نفس کی فربہی میں ایک ذرہ کمی نہیں، انانیت ہر ہر قدم پر زندہ، اور نفس پرستی کے مطالبات لحہ لحہ پر! مصائب سفر کا بیشتر حصہ تو خیالی اور اپنے دماغ کا پیدا کردہ ہوتا ہے، باقی تھوڑی بہت تکلیفیں جو واقعی ہیں، سوائے عزیز! اگر بہ علم صحیح معلوم ہو جائے کہ یہ کس کی راہ میں پیش آ رہی ہیں تو تمام تکلیف، آرام اور درد، راحت سے تبدیل ہو جائے. ہر گمراہی کی بنیاد انسان کے اسی جذبہ پر ہے کہ وہ اپنی مرضی کو سب پر حکمراں دیکھنا چاہتا ہے، اسلام اسی باطل پرستی کی تصحیح کے لئے ہے. اسلام کے معنی اپنی مرضی کو اپنے پیدا کرنے والے کی مرضی کے محکوم کر دینے کے ہیں، اور فریضۂ حج اسی مقصد کی تکمیل کا ایک آلہ ہے. پھر اگر راستہ میں کچھ امور ناخوشگوار پیش آئیں تو ان پر بے صبری کا اظہار کتنی بڑی محرومی و بدنصیبی ہے! دنیا میں کسی کے ساتھ ذرا سا دل کا لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے. پھر دیکھئے کہ اس کی گلی کا ہر کانٹا کس طرح پھول بن جاتا ہے. پس وہ جو سب محبوبوں کا محبوب ہے اور سب کی محبتوں کا تاجدار ہے، اگر اس کی راہ میں کوئی بات خلاف مزاج یا خلاف توقع پیش آئے تو وہ بات ہی ایسی کیا ہو سکتی ہے جس کے چرچے زبانوں پر لائے جائیں اور جس کے تذکرے اخبارات کے کالموں اور سفرنامہ کے صفحات میں پھلائے جائیں!

(ص:۵۵،۵۶)

سمندر۔۔۔کامران

۲۹ر مارچ. ساحل بمبئی سے جہاز ۱۱ بجے شب کو چھوٹا تھا. رات تو خیر جوں توں کٹ گئی، صبح اٹھ کر دیکھا تو ہر طرف عالمِ آب، جہاں تک بھی نظر کام کرتی ہے. بجز پانی کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا. اپنی عمر میں یہ منظر کبھی کا ہے کو دیکھا تھا. بڑے سے بڑے دریا جو اب تک دیکھے تھے وہ بھلا سمندر کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتے ہیں، صبح سے دوپہر، اور دوپہر سے شام اور شام سے پھر صبح، نہ کہیں جہاز رکتا ہے، نہ کوئی اسٹیشن آتا ہے، ہر وقت ایک ہی فضا محیط، ہر سمت ایک منظر قائم! دن طلوع ہوتے ہیں

اور ختم ہو جاتے ہیں، راتیں آتی ہیں اور گزر جاتی ہیں، نہ کوئی خط نہ کوئی تار، نہ اخبارات نہ ڈاک کے انبار! نہ کسی عزیز کی خبر نہ دوست کی، نہ اپنوں کا حال معلوم نہ بیگانوں کا، اپنا مٹی کا گھروندا ہے کہ ہر لحظہ پیچھے چھوٹتا جا رہا ہے، پر وہ گھر جسے لامکان کے مکین نے اپنا گھر کہہ کر پکارا ہے ہر آن نزدیک سے نزدیک تر ہوتا جا رہا ہے۔ زمین چھوٹ گئی لیکن آسمان نہیں چھوٹا۔ ادھر جہاز ہوا اور پانی سے ہچکولے کھا رہا ہے۔ ادھر دل کی کشتی ہے کہ یاس و امید کی کشمکش میں ابھی ڈوبی اور ابھی ابھری (خدا نہ کرے کبھی بھی ڈوبے!) دل ابھی اپنی اس خوش نصیبی پر نازاں کہ کشش کس کو کہاں سے کہاں لے جا رہی ہے اور ابھی اس خوف سے لرزاں کہ اپنی محرومیوں اور شور بختیوں سے دیکھیے اب بھی نجات ملتی ہے یا نہیں، ابوجہلؔ اور ابولہبؔ تو آخر عمر بھر اسی بیت اللہ کے جوار میں رہے پھر انھیں تو کچھ بھی حاصل نہیں ہوا، مدینہ کے منافق روزانہ ہی دیدارِ رسولؐ سے مشرف ہوتے رہے پھر ان کے دلوں کے پتھر تو نہ پسیجے!۔۔۔۔ لیکن یہ کیا وہم آرائی اور کیسی پریشان خیالی ہے، وہ کریم جو اپنے گھر مہمان بلا رہا ہے کیا وہ اپنے در کے گداگروں کی جھولی میں بھیک بھی نہ ڈالے گا؟ اس کی رحمت کی فراوانی اور کرم کی ارزانی نہ حق کو دیکھتی ہے اور نہ استحقاق کو، اسے تو محض عطا و بخشش، محض نوازنے اور سرفراز کرنے سے سروکار ہے، اور بس!

گھنٹہ دو گھنٹہ نہیں، دن دو دن نہیں، پورا ایک ہفتہ ہو گیا، اور خشکی کا کہیں نشان نہیں، جنگل اور بیابان کے درندے اور باغ و صحرا کے چرندے کیسے، ہوا کے پرندے تک نہیں! اِدھر پانی اُدھر پانی، آگے پیچھے، داہنے بائیں، ہر سمت پانی ہی پانی! اوپر نیلا آسمان، نیچے نیلا سمندر! زمین کی بے بساطی اب جا کر محسوس ہوئی! خشکی کے بڑے بڑے شہر اور صوبے، آبادیاں اور بستیاں، جنگل اور پہاڑیاں، سڑکیں اور ریل کی پٹریاں، ریگ کے تودے اور پہاڑوں کی چوٹیاں، جن کی وسعت اور کثرت، عظمت و ہیبت، اب تک دماغوں میں رچی اور آنکھوں میں بسی ہوئی تھی، اب معلوم ہوا کہ خالق کے بحرِ قدرت کے سامنے نہیں بلکہ اپنی ہی جیسی، ایک دوسری مخلوق کے سامنے کتنی حقیر اور کیسی

بے حقیقت چیزیں ہیں! جل جلالہ! جس سمندر کو دیکھتے دیکھتے آنکھیں تھکی جاتی ہیں جو معلوم ہوتا ہے کہ اب کبھی ختم نہ ہوگا وہ دنیا کے پانچ بڑے سمندروں میں سے صرف ایک سمندر ہے اور ان پانچوں میں بھی سب سے بڑا نہیں بلکہ دو سے چھوٹا! پھر ظاہر ہے کہ وہ بھی پورے کا پورا بہ یک وقت پیش نظر نہیں بلکہ اس کا ایک مختصر جزو آنکھوں کے سامنے ہے۔ اللہ اکبر! جب ایک جزو اور ادنیٰ جزو میں یہ ہیبت رکھ دی گئی ہے تو کل کے مشاہدہ سے کیا کیفیت طاری ہوگی! آج یہ مہیب اور لق و دق سمندر اور کرۂ ارض کے سارے، معلوم سمندر ''یاجوج'' کے قبضہ میں ہیں۔ وہ جسے چاہے، اس میں جہاز اور کشتی چلانے کی اجازت دے اور جب جس کو چاہے، اللہ کی کاریگری کے اس نادر نمونہ سے فائدہ اٹھانے سے روک دے! خلق خدا کی ہو تو ہو لیکن سمندر اور سمندروں کے بندرگاہ، جہاز اور ان کے پھریرے آج ہانکے اور پکارے کہہ رہے ہیں کہ ''امر'' اور ''حکم'' (نعوذ باللہ) یاجوج کا ہے۔۔۔۔ پھر اگر ایسے حال میں آپ کسی سچے کا قول سنتے ہیں کہ یاجوج و ماجوج سمندر کا پانی پی جائیں گے تو آپ اس پیشگوئی کے پورے ہونے کے لئے کسی زمانہ مستقبل کا کیوں انتظار کرنے لگتے ہیں!

(ص:۶۷،۶۸،۶۹)

کامران۔۔۔احرام

۷/اپریل (۲۶ شوال) یکشنبہ، آج جہاز یلملم کے سامنے سے گزرنے والا ہے۔ جو اہل ہند کا میقات ہے۔ میقات اس مقام کو کہتے ہیں، جہاں سے عازمانِ حج اپنا معمولی لباس اتار کر احرام باندھتے ہیں۔ جب جہاز یلملم کے مقابل آجاتا ہے تو حاجیوں کی اطلاع کے لئے زور سے سیٹی دے دی جاتی ہے۔ آج حاجیوں کی خوشی کا کیا پوچھنا ہے۔ جہاز یلملم کے سامنے تو کوئی پانچ بجے سہ پہر کو پہونچے گا اور جہاز کی سیٹی اسی وقت ہوگی لیکن حاجیوں میں چہل پہل صبح ہی سے شروع ہوگئی۔ حجامتیں بنوائی جارہی ہیں۔ غسل کئے جارہے ہیں۔ خوش خوش احرام کی نئی نئی اجلی اجلی چادریں نکالی جارہی ہیں، نفل نمازیں پڑھی جارہی ہیں۔ جہاز پر بہت سے معلم یا ان کے ایجنٹ بمبئی ہی سے ہمراہ ہولئے ہیں۔ سب اپنے اپنے حاجیوں کی ٹولیاں بنائے ہوئے انھیں احرام باندھنے کی نیت تلقین کرا رہے ہیں۔

احرام بندھوا رہے ہیں. لیجیے دوپہر تک سب کے احرام بندھ گئے، سب کے سب اپنے ہاتھوں ہنسی خوشی گویا کفن پوش ہوگئے. دل مسرت سے باغ باغ ہوئے جاتے ہیں. ایک دوسرے کو مبارکبادیں دی جارہی ہیں. اور ہر طرف سے "لبیک، لبیک" کی صدائیں بلند ہونی شروع ہوگئی ہیں۔

(ص:۸۲،۸۳)

آپ نے دیکھا؟ دیکھتے ہی دیکھتے پوشش ولباس کے سارے امتیازات مٹ گئے! سنتے چلے آئے ہیں کہ "الناس باللباس" انسان اپنی پوشاک سے پہچانا جاتا ہے، اور اس کے مرتبہ کا اندازہ اس کے لباس سے کیا جاتا ہے. اب کس لباس سے خادم کو مخدوم سے پہچانا جائے گا، اور کس پوشاک سے غلام کو آقا سے الگ کیا جائے گا؟ ابھی کل تک جہاز کی اس وسیع آبادی میں بڑے بھی تھے اور چھوٹے بھی، امیر بھی تھے اور فقیر بھی، رئیس بھی اور مزدور بھی، خوش حال بھی اور مفلس بھی، عالم بھی اور جاہل بھی۔ نامور بھی اور گمنام بھی، تعلقدار بھی اور رعایا بھی، مجسٹریٹ بھی اور چپراسی بھی، پر آج کس کو کس سے شناخت کیا جائے؟ سب سے بڑے مہاراجہ اور شہنشاہِ اعظم کی راجدھانی کے حدود شروع ہوگئے. اب نہ کوئی راجہ ہے نہ کوئی ٹھاکر، سب کے سب اسی کی پرجا، کل کے کل اسی کے چاکر، سارے کے سارے اسی کی رعایا ہیں! مالک کے دربار کی سرحدیں شروع ہوگئیں، اب نہ کوئی بڑا ہے نہ کوئی چھوٹا، نہ کوئی امیر ہے نہ کوئی وزیر، نہ کوئی عالم ہے نہ کوئی حاکم، نہ کوئی خان بہادر ہے نہ کوئی لیڈر، سارے کے سارے اسی ملک الملوک کے غلام ہیں، اور سب کے سب اسی کے بیکس اور بے بس بندے ہیں! اب نہ ہیٹ ہے اور نہ پگڑی، نہ عمامہ ہے نہ شملہ، نہ ترکی ٹوپی ہے نہ گاندھی کیپ، نہ قمیص ہے نہ عبا، نہ کوٹ ہے نہ شیروانی، نہ کالر ہے نہ ٹائی، نہ پتلون ہے نہ پاجامہ، سب کی زبان پر لبیک لبیک کے ترانے ہیں. اور سب کے جسموں پر بے سلی ہوئی دو دو چادریں..... یہ اللہ کے دربار کی حاضری ہے..... اس دربار کی وردی سب سے انوکھی، سب سے نرالی، سب سے الگ ہے یہاں طلب صرف کفن پوشوں کی ہے یا ان کی جو انھیں کی وضع اختیار کیے ہوئے ہیں، ان کی جو جیتے جی مُردوں کا لباس پہن چکے ہیں، ان کی جو اس لباس کی یاد تازہ کیے ہوئے ہیں، جس کے زیب تن

کرنے کے بعد پھر قطعاً کوئی دنیاوی لباس جسم کو مَس نہ کر سکے گا! مبارک ہیں وہ جو زندگی میں اپنے نفسوں کو مُردہ کر چکے ہیں! آج ان کا لباس ہی مُردوں کا لباس نہیں، ان کا نفس بھی تو مُردوں کا نفس بن چکا ہے. فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج لڑنا جھگڑنا، شہوتوں اور خواہشوں میں مبتلا ہونا زندوں کا کام ہے مردوں کو بھی کسی نے رفث اور فسوق اور جدال میں مبتلا دیکھا ہے؟

(ص:۸۴،۸۵)

جدہ

۸/اپریل، دوشنبہ، خدا خدا کر کے ۲۳۶۰ میل کی سمندری اور وطن سے بمبئی تک صدہا میل کی زمینی مسافت طے کر کے آج جدہ پہونچنے کا دن ہے، آج دلوں کے شوق واشتیاق کا کیا کہنا؟ اسباب کی بندش رات ہی سے شروع ہوگئی تھی صبح سویرے جہاز کے بالائی عرشوں پر حاجیوں کے پرے جمے ہوئے، سب کی نگاہیں ساحل کی طرف لگی ہوئی. ساحل جوں جوں قریب آتا جاتا ہے پانی کا رنگ بجائے نیلے کے سبز ہوتا جارہا ہے، اور بحری پہاڑیاں کثرت سے نمودار ہوتی جارہی ہیں دن نکلنے کے بعد ساحل سے ایک کشتی جہاز کی طرف آتی ہوئی نظر آئی. اس کشتی پر عرب کپتان سوار ہے. اندرون ساحل جہاز کی رہنمائی یہی عرب کپتان کرے گا لیجیے وہ کشتی جہاز سے آ کر لگی، اور عرب کپتان دم بھر میں کھٹ کھٹ کرتا ہوا جہاز کے سب سے بالائی حصہ میں کپتان کے پاس پہونچ گیا. اب اس وقت سے جہاز کی رہنمائی کا مالک ومختار یہی عرب ہے۔۔۔۔شاید یہ غیبی اشارہ ہے کہ ملک عرب میں داخلہ کے وقت رہنمائی کا فرض عرب ہی رہنما کے ہاتھوں انجام پاتا رہے. آٹھ بجے، ساڑھے آٹھ بجے اب جدہ کی عمارتیں صاف نظر آنے لگیں، مگر شہر اب بھی ڈھائی تین میل دور ہے، نو بجتے بجتے جہاز لنگر انداز تھا، مگر بمبئی کی طرح جدہ میں جہازوں کے لئے کوئی پلیٹ فارم نہیں. اور کیوں ہونے لگا تھا؟ جدہ میں جہاز آخر حاجیوں ہی کے تو ٹھہرتے ہیں، اور حاجی کیوں یہ ہر مرتبہ بھول جاتے ہیں کہ اس دور علم وتمدن میں ان کا وجود جانوروں اور چوپایوں سے کچھ ہی بہتر ہے، ساتویں صدی عیسوی کے "کہنہ وفرسودہ" احکام وشرائع پر عمل کرنے والے آخر اس کی توقع ہی کیوں قائم

کرتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے پر بھی ان کے نصیب میں بیسویں صدی عیسوی کی سہولتیں اور آسائشیں آسکیں گی؟

جہاز کی حرکت رکی اور جہاز پر حرکت شروع ہوئی، چیخ وپکار، غل وشور، دوڑ بھاگ، ظاہر ہے کہ جہاز کہیں بھاگا نہیں جارہا ہے بٹھہرنے ہی کے واسطے رکا ہے اور نہ جدہ کی زمین کہیں پھسلی جارہی ہے لیکن اتنا صبر کس کو اور اتنے انتظار کی توفیق کسے؟ جہاں سے کشتیوں پر اترنے کے لئے زینے صرف دو اور ان دو زینوں پر ڈیڑھ ہزار کے مجمع کا ہجوم! بجائے اس کے کہ ایک باقاعدہ قطار قائم کرکے ہر شخص بغیر دھکے دیے اور بغیر دھکے کھائے بہ سہولت واطمنان اتر سکے ہر شخص بیتاب کہ سب سے پہلے خود ہی اترے گا، اور اپنا اسباب اتارے گا، یہ اسے گھسیٹ رہا ہے وہ اسے ڈھکیل رہا ہے، یہ ایک کو دھکا دے رہا ہے دوسرا اسے کہنیاں مار رہا ہے، طاقتوروں اور چیرہ دستوں کی بن آئی، باقی کمزوروں اور ناتوانوں، بیماروں اور بچوں بوڑھوں اور بوڑھیوں پر جو کچھ گزر رہی ہے اس کی بجز خدائے علیم وخبیر کے اور کسے خبر! ایک نفسی نفسی کا عالم ہے ہر سمت محشرِ اضطراب! یہ ان لوگوں کا حال ہے جو ایثار وبے نفسی کا سبق لینے نکلے ہیں! یہ اس سفر میں پیش آرہا ہے جس کا مقصد ہی صبر وضبطِ نفس کی تعلیم ہے! یہ عین اسی گھڑی پیش آرہا ہے جس وقت دوسروں کی خدمت واعانت ہی سب سے بڑا مقصود ہونا تھا! غیروں کے جو مظالم آپ پر ہوتے چلے آئے ہیں. اور آج بھی بڑے زور وشور سے ہورہے ہیں، ان کا دکھڑا تو آپ بڑے درد کے لہجہ میں روتے رہتے ہیں لیکن ایک مرتبہ ذرا آئینہ ہاتھ میں لے کر ارشاد ہو کہ خود آپ نے اپنے ظلم کرنے میں کون سی کسر اٹھا رکھی ہے؟ **وما اصابکم من مصیبة فبما کسبت ایدیکم ویعفو عن کثیر.**

(ص:۸۸،۸۹،۹۰)

جدہ سرزمین عرب کا پھاٹک ہے، حکومت اسلام کا پہلا شہر، بُرا یا بھلا جیسا بھی ہے، اپنا ہے. اپنوں اور اپنے والوں کی چاہت کسے نہیں ہوتی؟ ۔۔۔ لیکن اے سب عزتوں کے مالک، ایک

گستاخ مشت خاک کو یہ کہنے کی اجازت دے کہ اب تو کسی کو بھی اپنا کہتے دل لرزتا ہے اور زبان ہچکچاتی ہے، خیر قرطبہ، غرناطہ کو تو مدت ہوئی بھول چکے، لیکن ابھی کی بات ہے کہ بصرہ اپنا تھا، بغداد اپنا تھا، حلب اپنا تھا، بیروت اپنا تھا، دمشق اپنا تھا، بیت المقدس اپنا تھا، قاہرہ اپنا تھا، استنبول اپنا تھا اور کچھ ہی قبل شاہجہاں آباد بھی اپنا تھا، اکبر آباد اپنا تھا، حیدر آباد اپنا تھا، لکھنؤ اپنا تھا، مرشد آباد اپنا تھا، عظیم آباد اپنا تھا، سورت اپنا تھا، بیجاپور اپنا تھا، کرناٹک اپنا تھا، آج ان میں سے کوئی اپنا ہے؟ پھر جدہ غریب کی خیر کب تک منائی جاسکتی ہے؟ یاجوج کا پھریرا گو آج ضابطہ ورسم کے ساتھ وہاں نہ لہرا رہا ہو، لیکن جدہ کے کوچہ وبازار، درودیوار سب یاجوج ہی کی عظمت کے نقیب بن چکے ہیں؟ دوکانوں میں مال ہے تو ولایتی، جسموں پر لباس ہے تو ولایتی، بازاروں میں دوا ہے تو ولایتی، مکانوں میں سامان ہے تو ولایتی، عقلیں مرعوب، قلوب مفلوج، کس چیز سے دل کو سمجھایئے اور کیا کہہ کر اپنے کو دھوکا دیجیے! سرزمین اسلام کا اسلامی شہر اور دل ترستا رہ گیا کہ کسی محدث کی زیارت سے آنکھیں روشن ہوں، کسی بزرگ صاحب باطن کی نگاہ کرم دل کو گرمائے، کسی فقیہ کے حلقۂ درس وافتاء کی تازگی وشگفتگی تھکے ماندے مسافر کی خستگی وماندگی کو دور کردے! پر آہ یہ کچھ نہ ہونا تھا! ہر تمنا ناکام، ہر آرزو منفعل ہوکر رہتی تھی سو ہوکر رہی، مسجد میں نماز کئی وقت پڑھی، پر شہر کے عمائد واکابر ایک وقت بھی مسجد کے اندر دکھائی نہ دیئے اور دل نے تأسف کے ساتھ کہا کہ حضرت اکبر مرحوم کا تجربہ ع

کونسل میں بہت سید، مسجد میں فقط جمن!

ہندوستان ہی تک محدود نہ تھا، دریائے جمنا کا کنارہ ہو یا بحرِ احمر کا ساحل، آج مسجد کی آبادی جہاں کہیں بھی قائم ہے، میاں جمن ہی کے دم سے!

(ص:۹۸)

موٹریں روانہ ہوئیں اور شب کی تاریکیوں میں سفر شروع ہوا، کس کا سفر کہاں کا شروع ہوا؟ ---کون بتائے؟ کس کی زبان جواب دے؟ حاضری کی اجازت اسے مرحمت ہورہی ہے، جس کے نامۂ اعمال کی سیاہیاں شاید شبِ تار کی تاریکیوں سے بھی سیاہ تر ہیں. حضوری اس کے آستانہ پر

ہو رہی ہے جو خود الطارق بن کر رات کی تاریکیوں کو منور کرنے آیا جس کا ظہور اس گھڑی ہوا جب دنیا پر تاریکیوں اور سیاہیوں کے ایک سے ایک گہرے پردے پڑے ہوئے تھے، اور جو اپنے ہمراہ نور اور اُجالا لے کر آیا۔۔۔۔ایں! یہ دل کیوں دھڑکتا جاتا ہے؟ یہ آنکھیں کیوں پُرنم ہو رہی ہیں؟ یہ زبان کیوں خشک ہوئی چلی جاتی ہے؟ سامنا اس کا تو نہیں جو محض حاکم و آمر ہے، شارع و داعی ہے، دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ کرنے والا ہے۔ حاضری تو اس کے دربار کی ہے جو ہمہ رحمت و ہمہ مرحمت ہے، جو بدکاروں کی پردہ پوشی کرنے والا ہے، جس کا نام شفیع المذنبین ہے یعنی نیکوں اور پاکوں کا نہیں، گناہگاروں کا نجات دلانے والا، تباہ کاروں کا سہارا! یہ سب کچھ سہی یہ سب صحیح، پر دل اب بھی اپنے قابو میں نہیں، نفس کی شرارتیں، اندر کی خباثتیں قلب کی قساوتیں ایک ایک کر کے بے پردہ بے نقاب سامنے آ رہی ہیں! اور ریا و نفاق کا جامہ چاک ہو رہا ہے اور جب مدینہ طیبہ کی مسافت بقدر ایک ثلث رہ جاتی ہے تو پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور زمین بالکل پتھریلی ملنے لگتی ہے، ان ناہمواریوں کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ لاریاں گویا اچھلتی ہوئی چلتی ہیں اور دھکے دھچکے قدم پر قدم پر لگتے رہتے ہیں، اِدھر دھچکا لگا اور اُدھر زبان اعتراض پر کھلی!۔۔۔۔اے ریاکار! آج تیری اصلیت ظاہر ہو گئی! اے ظاہر دار اس وقت تیری کیچلی اُتر رہی ہے، جب قوالی کی محفلوں میں یا شاعری کی دنیا میں ''دشت یثرب میں ناقہ کے پیچھے دوڑتے رہنے'' کا یا ''تلوؤں میں خارصحرائے مدینہ کے چبھنے'' کا ذکر آتا تھا، تو خوب گردن ہلا ہلا کر جھومتا تھا، جوش و مستی کا اظہار کرتا تھا اور ہمہ تن اشتیاق و تمنا بن جاتا تھا، پھر آج تو یہ منظر سامنے ہے تصور و خیال میں نہیں، مادی آنکھوں کے روبرو ہے۔ اس خاک کا سرمہ آنکھوں میں کیوں نہیں لگاتا؟ یہاں کے کانٹوں کو اپنے پیروں میں کیوں نہیں چبھنے دیتا؟ اس دشت میں جیب و گریباں کی دھجیاں اڑاتے ہوئے کیوں نہیں دوڑ لگاتا؟ محبت رسولؐ کے دعوے زبانی تھے، دوستوں اور معتقدوں کے مجمع میں عشق سرکارِ مدینہ کی خوب خوب لاف زنی ہوتی تھی آج سارے دعووں کی حقیقت کھل گئی۔

(ص: ۱۰۷،۱۰۸)

مدینہ

۱۱/اپریل ۲۹ء پنجشنبہ، یکم ذیقعدہ ۱۳۴۷ھ آج کی صبح کتنی مبارک صبح ہے آج کے دن زندگی کا سب سے بڑا ارمان پورا ہونے کو ہے، آج ذرہ آفتاب بن رہا ہے، آج بھاگا ہوا غلام اپنے آقا و مولا کے دربار میں حاضر ہو رہا ہے، آج گناہگار امتی کو شفیع و شفیق رسول اللہ ﷺ کے آستانہ پر سلام کی عزت حاصل ہو رہی ہے..... ۹ بجے کھڑے کھڑے چند منٹ کے لئے ایک اور منزل پر رُکے اس کا نام اس وقت یاد نہیں آتا، یہ آخری منزل ہے۔ اس کے بعد کوئی درمیانی منزل نہیں، صرف منزلِ مقصود ہے۔ اب گویا نواحِ مدینہ شروع ہو گیا، کھجور نہایت شاداب و شیریں سامنے لگے ہوئے، ہوا لطیف و خوش گوار، فضا خوش منظر، سبزہ جو راستہ بھر کہیں نظر نہیں آیا تھا، اب ہر طرف دکھائی دے رہا ہے۔ ریت کے میدان اور ریگستان کے بجائے اب ہر طرف پہاڑیوں کا سلسلہ، سڑک اتنی ہموار و نفیس کہ معلوم ہوتا ہے کہ عرب نہیں ہندوستان[1] میں سفر کر رہے ہیں، دس بجے، سوا دس بجے، ساڑھے دس بجے، ادھر وقت کی گھڑیاں گزر رہی ہیں، اور ادھر دلوں کا شوق و اشتیاق ہے کہ ہر منٹ، ہر سکنڈ بڑھتا جا رہا ہے، کسی کے ہاتھ میں مناسک و آداب زیارت کے رسالے ہیں وہ انھیں دیکھ دیکھ کر دعائیں یاد کر رہا ہے، اور کوئی خالی درود شریف کا ورد کیے جا رہا ہے۔ ہر قلب اپنے اپنے حال میں گرفتار، ہر دل اپنی اپنی جگہ مضطر و بیقرار، کسی کی آنکھیں اشک بار اور کسی کا دماغ نشۂ لذت و فرحت سے سرشار! اپنی اپنی نسبتیں اور اپنا اپنا اعتبار!

سارا قافلہ ذوق و شوق کی تصویر، اور تو اور نجدی شوفر تک چند لمحوں کے لئے بجائے ''نجدی'' کے ''وجدی'' بنا ہوا، مولانا مناظر فرط گریہ سے بیتاب ضبط احتیاط کے باوجود بھی چیخ نکل جانے پر مجبور، ایک سرگشتہ و دیوانہ، عقل سے دور علم سے بیگانہ، نہ گریاں نہ شاداں، نہ اپنی حضوری کی

[1] حال کی قلب حالت کی وجہ سے نہ پھڑکیے، بلکہ عرب کی آج سے ۷۰ سال قبل کی مالی بدحالی و معاشی پریشان خیالی کا خاکہ ذہن میں لے آیئے۔ یہ کلمات مصنف کے قلم سے انہیں حالات کے تناظر میں نکلے ہیں (مرتب)

خوش بختی پر خوش اور نہ تباہ کاریوں کی یاد پر مغموم، محض اس الجھن میں گرفتار کہ یا الٰہی یہ بیداری ہے یا خواب، کہاں یہ ارضِ پاک اور کہاں یہ بے مایہ مشتِ خاک! کہاں مدینہ کی سرزمین اور کہاں اس تنگِ خلائق کی جبیں! کہاں سید الانبیاء کا آستانہ اور کہاں اس روسیاہ کا سروشانہ! کہاں وہ پاک سرزمین کہ اگر اس پر قدسیوں کو بھی چلنا نصیب ہو تو ان کے فخر و شرف کا نصیبا جاگ جائے اور کہاں ایک آوارہ و ناکارہ بے تکلف اسے پامال کرنے کی جرأت کر بیٹھے، عراقی نے کہا تھا کہ ناپاک کے سجدہ کرنے سے زمین فرطِ اذیت سے چیخ اٹھتی ہے ؎

بہ زمین چو سجدہ کردم ززمین ندا برآمد
تو مرا خراب کردی بہ ایں سجدۂ ریائی

تو جب ہر معمولی اور عام خطۂ زمین ریاکار کے سجدہ سے یہ ایذا محسوس کرتا ہے تو پھر اس عظمت و تقدس والی سرزمین کے جگر و سینہ پر ایک ریاکار کے بارِ قدم سے کیا گزر گئی ہوگی!

(ص:۱۱۰،۱۱۲)

آستانۂ نبوت

ولو انھم اذ ظلموا انفسھم جاءوک فاستغفروا اللہ واستغفر لھم الرسول لوجدوا اللہ توابا الرحیما، یہ کسی فقیہ کا اجتہاد نہیں جس پر رد و قدح کی گنجائش ہو۔ کسی بزرگ کا کشف نہیں جس میں غلطی اور دھوکے کا احتمال ہو، کوئی روایت حدیث نہیں جس کے اسناد میں گفتگو ہو سکے، خدائے پاک کے کلام کی ایک آیت ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ ''ان لوگوں نے جس وقت اپنے اوپر ظلم کیے تھے اے پیغمبر! اگر تمہارے پاس آ گئے ہوتے اور اللہ سے اپنے قصور کی معافی چاہتے اور رسول بھی ان کے حق میں معافی چاہتے، تو پاتے اللہ کو معاف کرنے والا مہربان'' گویا گناہگاروں اور تباہ کاروں کو یہ حکم ملا ہے کہ اپنے پروردگار سے معافی طلب کریں، لیکن تنہا اپنے گھروں پر بیٹھے ہوئے نہیں، بلکہ رسول کی خدمت میں حاضر ہو کر، اور ان سے بھی اپنے حق میں دعا کرا کر۔ ظاہر ہے کہ حکم براہِ راست کسی ایسے گروہ سے ہے جو حضورِ انورؐ کے زمانہ میں موجود تھا، خوش نصیب تھے وہ افراد جنھیں

اس حکم پر عمل کی توفیق نصیب ہوئی، جو رسول کی خدمت میں حاضر ہوئے، جنھوں نے اللہ سے گڑگڑا کر معافی مانگی، اور رسول نے جن کے حق میں سفارش فرمائی، لیکن آج اس چودھویں صدی میں امت کا کوئی فاسق وفاجر، بدعمل و نامہ سیاہ اگر حکم "جاء وک" کی تعمیل کرنا چاہے، تو کیا اس کے لئے، اس سعادت وہدایت کا دروازہ خدانخواستہ قیامت تک کے لئے بالکل بند ہو چکا ہے؟ اور اس کی قسمت میں بجز مایوسی ومحرومی کے اور کچھ نہیں؟

موسم گل جب چمن سے رخصت ہو چکتا ہے اور کوئی بوئے گل کا متوالا آنکلتا ہے تو عرق گلاب کے شیشیوں اور قرابوں کو غنیمت سمجھتا ہے، پھر اگر آج کوئی بوئے حبیب کا متوالا حکم "جـــاء وک" کی تعمیل میں، اپنے کو ہزاروں میل کے فاصلہ سے دیارِ حبیب تک پہونچاتا ہے اور اپنے مظالم نفس کی تلافی وعذر خواہی کے لئے اپنے ایمان اور اپنی بیعت کی تجدید کے لئے اپنی تباہ کاریوں پر پشیمانی اور اشک افشانی کے لئے حبیب تک نہ سہی آستانِ حبیب تک گرتا پڑتا پہنچتا ہے تو کیا اس پر "بدعت" و "شرک" کا فتوی لگایا جائے گا؟

(ص:۱۲۱،۱۲۲)

مسجد نبویؐ اور روضۂ مبارک الگ الگ عمارتوں کے نام نہیں، اور ایک دوسرے سے جدا نہیں، مسجد کی عمارت بہت وسیع شاندار اور اس سے بھی کہیں بڑھ کر حسین وجمیل ہے، اس سے بڑی بعض مسجدیں ہندوستان کے اندر موجود ہیں، اور دوسرے ملکوں میں بھی یقیناً ہوں گی، لیکن حسن وجمال کے لحاظ سے، خوبی ومحبوبی کے لحاظ سے، زیبائی ودل کشی کے لحاظ سے پردۂ زمین پر اس مسجد کا جواب نہیں، بس یہ جی چاہتا تھا کہ ہر وقت صحن میں بیٹھے ہوئے عمارت مسجد کی طرف برابر ٹکٹکی لگی رہے اللہ اللہ! کس محبوب کی مسجد ہے، کیسے کیسے محبوبوں نے یہاں ماتھے ٹیکے ہیں، اینٹ اور پتھر، مٹی اور چونے تک پر محبوبیت چھا رہی ہے! مسجد کی پیائش کا دماغ کس کو اور طول وعرض کے جائزہ لینے کا ہوش کسے، لیکن بعض کتابوں میں پڑھا ہے کہ موجودہ مسجد کا طول ۶۰۰ فٹ اور عرض ۴۸۰ فٹ ہے، قبلہ جنوب کے رخ پر ہے، آگے پیچھے دس گیارہ دالان بنے ہوئے ہیں، بہترین نقش ونگار سے آراستہ،

حسن وزیبائش میں ایک سے ایک بڑھے ہوئے۔اس کے بعد وسیع صحن، صحن کے داہنے بائیں دونوں جانب صحن ہی کے برابر لانبے لانبے دالان، بائیں جانب والے دالان میں عورتوں کے لئے جگہ مخصوص، کلام پاک کی آیات، بعض احادیث کے ٹکڑے، اسمائے الٰہی، اسماءِ رسول، اسمائے صحابہ کبار، سب موقع موقع سے درودیوار پر کندہ، بڑی محراب محرابِ عثمانی کے نام سے موسوم حضرت خلیفۂ ثالثؓ کی تعمیر کرائی ہوئی، منبر ٹھیک اسی جگہ پر رکھا ہوا ہے جہاں عہدِ نبوت میں تھا، اسی منبر اور روضۂ مبارک (حجرۂ عائشہؓ) کا درمیانی حصہ ''روضۂ جنت'' کے نام سے حدیث صحیح کی بنا پر موسوم۔اتنے رقبہ میں کوئی ڈھائی تین سو نمازیوں کی جگہ ہوگی، اسی حصہ میں محراب النبیؐ اور مصلٰی نبی یعنی وہ مقام جہاں سرکار خود کھڑے ہوکر امامت فرمایا کرتے تھے۔اصلی مصلٰی ایک دیوار سے چھپادیا گیا ہے، صرف اتنا حصہ کھلا ہے جہاں حضورؐ کے قدم مبارک ہوتے تھے۔اس طرح اب جو قسمت کا دھنی وہاں کھڑے ہوکر نماز پڑھتا ہے اس کا سر قدرتاً واضطراراً حضور ﷺ کے آثارِ قدم پر جا کر پڑتا ہے، خواجہ حافظ کا یہ مشہور شعر یہاں گویا لفظاً چسپاں ؎

بر زمینے کہ نشاں کف پائے تو بُود
سالہا سجدہ صاحب نظراں خواہد بُود

اللہ اکبر! کیا شانِ جمال، کیا وسعت کرم ہے! خدا جانے کتنوں کی نجات اسی بہانہ سے ہوجاتی ہے!

(ص:۱۲۶)

گنبدِ خضراء

طور کی چوٹیاں جس وقت کسی کی تجلیات جمالی کی جلوہ گاہ بننے لگیں، تو پاکوں کے پاک اور دلیروں کے دلیر، موسٰی کلیمؑ تک تاب نہ لاسکے اور اللہ کی کتاب گواہ ہے کہ کچھ دیر کے لئے ہوش وحواس رخصت ہوگئے، معراج کی شب، جب کسی کا جمال بے نقاب ہونے لگا تو روایات میں آتا

ہے کہ اس وقت وہ عبدِ کامل جو فرشتوں سے بڑھ کر مضبوط دل اور قوی ارادہ کا پیدا کیا گیا تھا، اپنی تنہائی کو محسوس کرنے لگا اور ضرورت ہوئی کہ ''رفیقِ غار'' رضی اللہ عنہ، کا تمثل سامنے لاکر آب وگل کے بنے ہوئے پیکر نور کی تسلی کا سامان کیا جائے۔۔۔۔ یہ سرگزشت ان کی تھی جو قدوسیوں سے بڑھ کر پاک اور نورانیوں سے بڑھ کر لطیف تھے۔ پھر وہ مشتِ خاک جو ہمہ کثافت اور ہمہ غلاظت ہو، جس کا ظاہر بھی گندہ اور باطن بھی گندہ، اگر رسول ﷺ کی مسجد اقدس میں قدم رکھتے ہچکچا رہا ہو، اگر اس کا قدم رسول کے روضۂ انور کی طرف بڑھتے ہوئے لڑکھڑا رہا ہو، اگر اس کی ہمت رحمت و جمال کی سب سے بڑی تجلی گاہ میں قدم رکھنے سے جواب دے رہی ہو، اگر اس کا دل اس وقت اپنی بیچارگی و درماندگی کے احساس سے پانی پانی ہوا جارہا ہو تو اس پر حیرت کیوں کیجیے؟ خلاف توقع کیوں سمجھیے؟ اور خدا کے لئے اس ناکارہ و آوارہ، بیچارہ و درماندہ کے اس حال زار کی ہنسی کیوں اڑایئے؟

مغرب کی اذان میں چند منٹ باقی تھے کہ قسمت کی یاوری نے باب النساء کے متصل ایک ہندی بزرگ مولانا سید احمد صاحب فیض آبادی مدظلہ کی خدمت میں پہونچایا۔ موصوف ہمارے مولانا سید حسین احمد صاحب کے حقیقی بھائی اور سن میں ان سے بڑے ہیں ..... جلدی جلدی تعارف ہوا، اور فوراً اذان کی آواز فضا میں گونجنے لگی! ایک پرانا مصرع ذہن میں پڑا ہوا تھا ع

مؤمن چلا ہے کعبہ کو ایک پارسا کے ساتھ

حکیم مؤمن خان تو شاعری کی دنیا میں چلے تھے۔ یہاں چلنا خیالی دنیا میں نہیں عملی دنیا میں تھا اور حاضری ''بیت خلیل'' میں نہیں ''بیت حبیب'' میں دینی تھی۔ اس گھڑی ''ایک پارسا'' کی دستگیری و رہنمائی غنیمت نہیں نعمت تھی، دھڑکتا ہوا دل کچھ تھما، اور ڈگمگاتے ہوئے پیر سنبھلے! ادھر اذان کی آواز ختم ہوئی ادھر قدم دروازے سے باہر نکالے، مکان سے حرم کے داخلہ کا دروازہ باب جبریل اگر چند فٹ نہیں تو چند گز پر ہے، اتنا فاصلہ بھی خدا معلوم کتنے منٹ میں طے ہوا۔ اس وقت نہ وقت کا احساس نہ فاصلہ کا ادراک، نہ ''زمان'' کی خبر نہ ''مکان'' کی!

(ص: ۱۳۳، ۱۳۴)

جسے دیکھو موا جہ شریف کی طرف کھنچا چلا آ رہا ہے۔ اس وقت رخ قبلہ کی جانب نہیں، پتھر سے تعمیر کیے ہوئے کعبہ کی جانب نہیں، بلکہ اس کے در اقدس کی جانب ہے جو دلوں کا کعبہ اور روحوں کا قبلہ ہے! کسی کا نالۂ جگر گداز، کسی کے لب پر آہ و فریاد، ہر شخص اپنے اپنے حال میں گرفتار، ہر متنفس اپنے اپنے کیف میں سرشار، گنہگاروں اور خطا کاروں کی آج بن آئی ہے۔ آستان شفیع المذنبین تک رسائی ہے!

سجدوں سے اور بڑھتی ہے رفعت جبیں کی!

یہاں بھی نہ پائیں گے تو کہاں جائیں گے، آج بھی نہ گڑگڑائیں گے تو کدھر سر ٹکرائیں گے **ولو انھم اذ ظلموا انفسھم الخ** کا وعدہ پورا ہونے کے لئے ہے، محض لفظ ہی لفظ نہیں ہیں!

ادھر یہ سب کچھ ہو رہا ہے، رند و پارسا، فاسق و متقی سب ہی اس دُھن میں لگے ہوئے ہیں، ادھر ایک تنگِ امت حیران و ششدر، فرطِ ہیبت و جلال سے گنگ و مضطر، حواس باختہ، چپ چاپ، سب سے الگ کھڑا ہوا ہے، نہ زبان پر کوئی دعا نہ دل میں کوئی آرزو، سر سے پیر تک ایک عالم حیرت طاری! یا الٰہی! یہ خواب ہے یا بیداری! کہاں ایک مشت خاک، کہاں یہ عالم پاک۔۔۔۔ جل جلالہ، جہاں ابوبکرؓ اور علیؓ حاضر ہوتے ہوئے تھراتے ہوں، جہاں عمرؓ آواز سے بولتے ہوئے لرزتے ہوں، جہاں کی حضوری جبریلِ امین کے لئے باعث فخر و شرف کا سبب ہو، آج وہاں عبدالقادر دریابادی کا فرزند عبدالماجد اپنے گندہ دل اور گندہ تر قلب کے ساتھ، بے تکلف اور بلا جھجک کھڑا ہوا ہے! دماغ حیران، عقل دنگ، زبان گنگ، ناطقہ انگشت بدنداں، نہ زبان یاوری کرتی ہے، نہ لب کسی عرض و معروض پر کھلتے ہیں، نہ دعاؤں کے الفاظ یاد پڑتے ہیں۔ نہ کسی نعت گو کی کوئی نعت خیال میں آتی ہے! چلتے وقت تک دل میں کیا کیا ولولے، اور کیسے کیسے حوصلے تھے! لیکن اس وقت سارے منصوبے یک قلم غلط، سارے حوصلے اور ولولے یک لخت غائب! لے دے کے جو کچھ یاد پڑ رہا ہے وہ محض کلام مجید کی بعض سورتیں اور آیتیں ہیں۔ یا پھر وہی عام و معروف درود شریف اور زبان ہے کہ

بے سوچے سمجھے بغیر غور وفکر کیے ہوئے انھیں الفاظ کو رٹے ہوئے سبق کی طرح اضطراراً دہرائے چلی جارہی ہے! ع

نظارہ زجنبیدن مژگان گلہ دارد

(ص:۱۴۰،۱۴۱)

زیارت

ہزاروں کے اس مجمع میں اگر سینکڑوں نہیں تو بیسوں ضرور ایسے ہوتے ہیں جو دل والے بھی ہوتے ہیں اور آنکھوں والے بھی. جو دیکھتے ہیں کہ کس دربار میں حاضر ہیں، جو سمجھتے ہیں کہ ان کا نصیبہ انھیں کہاں لے آیا، انھیں دیکھیے تو کبھی مواجہ شریف کے سامنے، کبھی پائیں میں کبھی بالین کی طرف کبھی مصلی نبیؐ پر، کبھی منبر نبویؐ کے قریب، کبھی ستون عائشہ کے متصل، کبھی ستون ابی لبابہ سے لگے ہوئے، کبھی پاک مسجد کے کسی اور پاک گوشہ میں، دبے اور سمٹے ہوئے روتے اور گڑگڑاتے ہوئے، مناجات میں مشغول ہیں، سجدہ میں پڑے ہوئے ہیں، رکوع میں جھکے ہوئے ہیں، تلاوت میں لگے ہوئے ہیں، درود خوانی میں محو ہیں، تسبیح وتہلیل میں غرق ہیں. اپنی خطائیں ایک ایک کر کے یاد آرہی ہیں، اپنے گناہوں کی فرد کی ہر ہر سطر سامنے ہے کسی کی رحمت بے حساب کا خیال آکر ٹوٹے ہوئے دل کو تسلی دے رہا ہے، اپنے اور اپنے بزرگوں اور عزیزوں دوستوں کے حق میں دعائیں ہیں، امت اسلامیہ کے حق میں آہیں ہیں، فریادیں ہیں، پکاریں ہیں، دردمندیاں ہیں، بیقراریاں ہیں. غرض ہر صورت سے اپنی عبدیت اور اپنی بندگی کا تحفہ، محمدؐ کے رب کے حضور میں محمدؐ کے بتائے ہوئے طریقہ کے موافق پیش کیا جارہا ہے، کون بتلائے کیا کیا مانگا جارہا ہے؟ کیا کیا مل رہا ہے! دینے والے کے کرم کی کوئی انتہا ہے؟ پھر آخر مانگنے والے کیوں اپنی زبانیں روکیں؟ اور کیوں اپنے دل میں کوئی حوصلہ، کوئی ارمان باقی رہنے دیں؟ دینے والا وہی تو ہے جس نے ایک مانگنے والے (صلعم) کے الحاح کو دیکھ کر، غصہ اور خفگی کے لہجہ میں نہیں، پیار کے الفاظ میں اور محبت کی آواز میں ''حریص'' کہہ کر پکارا تھا، اللہ اکبر! حرص تو جب کی جاتی ہے جب ملنے سے پورا اطمنان نہیں ہوتا، بے

حساب دینے والے اور بے اندازہ کرم کرنے والے سے بھی کوئی اپنا سوال جاری رکھے اس کی ''حرص'' شفاعت اس کی ''حرص'' شفقت کا کون اندازہ لگا سکتا ہے .دینے والا غیر محدود اس کی فیاضیوں کا اندازہ قوت بشری سے باہر ہے لیکن مانگنے والا غیر محدود نہیں ،محدود، اور خدا نہیں بندہ ہی تھا، اس محدود اور متناہی بندہ اور بشر ہی کی ''حرص'' شفاعت و''حرص'' شفقت کا کون اندازہ لگا سکتا ہے؟ آج اور یہاں مانگنے والے اسی حریص شفاعت اسی حریص علیکم بالمؤمنین رء وف رحیم کا لقب پانے والے کے امتی ہیں ،اسی کے نام لیوا ہیں ،اسی کا کلمہ پڑھ پڑھ کر جینے والے اور اسی کا نام لے کر مرنے والے ہیں ،ان کی دعائیں اور ان کی آرزوئیں !۔۔۔اللہ اللہ! کس کی زبان میں قوت اور کس کے قلم میں طاقت ہے، جو اس اجمال کی تفصیل اور ان اشارات کی تشریح کر سکے!

(ص:۱۵۳تا۱۵۶)

مسجدِ نبویؐ

مسجد پاک کے کن کن حصوں کی پاکیاں اور کن کن گوشوں کی بڑائیاں گنائی جائیں اور جو ہمہ خوبی ہمہ محبوبی ہے اس کے کس کس جزو کے حسن و جمال کا نقشہ کھینچا جائے ،سوائے اس کے کہ ایک ہی بار

گل چیں بہار تو زدامان گلہ دارد!

پڑھ کر خاموشی اختیار کر لی جائے ،ابھی ''روضۂ جنت'' کا ذکر تھا، روضہ کے اندر ہی محراب النبی ہے. روضہ کے باہر منبر نبوی کے دوسری جانب محراب عثمانی ہے .سال کے بیشتر حصہ میں چونکہ جماعت و مسجد کی وسعت گنجائش کے لحاظ سے بہت مختصر ہوتی ہے .اس لئے امام محراب نبویؐ میں کھڑا ہوتا ہے اور نمازی روضہ میں ہوتے ہیں ،لیکن حج کے آگے پیچھے موسم زیارت میں جب مجمع کئی گنا بڑھ جاتا ہے تو امام محراب النبی کو چھوڑ کر چند صفیں آگے بڑھ کر محراب عثمانی میں کھڑا ہونے لگتا ہے، اور نمازی مسجد کے سارے عرض وطول میں پھیل جاتے ہیں، یہ محراب ذوالنورین خلیفہ ثالثؓ کی تعمیر کرائی ہوئی ہے .اس کی نورانیت کا بیان کس زبان سے ہو!۔۔۔غرض ساری مسجد اللہ ہی کی ہے اور اللہ کے بندوں کے لئے ہے. جہاں چاہے اور جس جگہ دل میں آئے اپنے مولا سے راز و نیاز میں لگ جایئے،

چپہ چپہ انوار سے معمور، ذرہ ذرہ برکتوں سے پُرنور، کس حصہ کو بڑھایئے اور کس حصہ کو گھٹایئے یہ فخر عمر بھر کہیں مٹنے والا، اور یہ شرف زندگی بھر کہیں بھولنے والا ہے کہ جس زمین کے ذرّات کو رسول خدا کے قدموں نے مَس کیا، جہاں صدیقیوں نے نمازیں پڑھیں جہاں شہیدوں نے سجدے کیے جہاں نور کے بنے ہوئے فرشتوں نے بار بار فخر وناز کے ساتھ حاضری دی. ہاں، زمین کے جس ٹکڑے پر آسمان کو رشک آرہا ہو. آج وہاں ایک خاک کا پتلا، حرص وہوا کا بندہ آزادی کے ساتھ بے روک ٹوک چلے پھرے، ہنسے بولے، روئے گڑگڑائے!

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے!

(ص:۱۶۸،۱۶۹)

جنت البقیع

مسجدِ نبویؐ کی زیارت ہوچکی، آستانہ نبوت پر سلام عرض کیا جاچکا، صدیقؓ اور فاروقؓ کے دربار میں حاضری کے آداب بجالائے جاچکے، گھڑیاں اور گھنٹے گزر چکے، راتیں آئیں اور جاچکیں، دن طلوع ہوئے اور ختم ہوچکے لیکن ابھی وہاں حاضر ہونا باقی ہے جہاں آدھی رات کو، خواب اور آرام کو چھوڑ کر تشریف لے جانا اور اپنے مولیٰ سے راز ونیاز میں مصروف ہوجانا، خود محبوب رب العلمین کو محبوب تھا، اس مقام کا نام کون مسلمان ہے جس کو معلوم نہیں؟ اس جگہ کی حاضری کو نسا دل ہے جس کا ارمان نہیں؟ بقیع المرقد، یا عرف عام کے مطابق جنت البقیع وہ خاک پاک ہے جہاں رسول اللہ ﷺ کے چہیتے اور لاڈلے، اللہ کے برگزیدہ اور پیارے ایک دو نہیں، دس بیس نہیں خدا معلوم کتنے اور کس تعداد میں آرام فرمارہے ہیں! حرم نبویؐ سے کچھ زیادہ دور نہیں، مسجد نبوی سے مشرق کی جانب پیدل ٹہلتے ہوئے چلئے تو آٹھ دس منٹ میں بآسانی پہونچ جایئے گا، آبادی سے الگ ایک نہایت وسیع چاردیواری اور اس احاطہ کے اندر جگر گوشۂ رسولؐ صاحبزادہ ابراہیمؓ جو اگر زندہ رہتے تو نبی ہوتے اور نورِ نظر سیدنا حسنؓ، ادھر دیکھیے تو دونوں صاحبزادیاں حضرت رقیہؓ، حضرت ام کلثومؓ اور شہید کربلا کے لختِ جگر سیدنا زین العابدینؒ ایک طرف امت کی شفیق مائیں، مائی عائشہؓ اور مائی حفصہؓ، مائی

زینبؓ، اور مائی ام سلمہؓ اور تقریباً ساری امہات مؤمنین اور دوسری طرف عم رسول عباسؓ اور عمہ رسولؐ صفیہؓ، ایک گوشہ میں خلیفہ ثالث عثمانؓ ذوالنورینؓ اور ایک ٹکڑے میں عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور سعد بن ابی وقاصؓ اور اگر ایسی روایات بھی قبول کرلی جائیں جو اب تک محققین کے ہاں قبول نہیں کی گئی ہیں تو خاتون جنت فاطمہ زہراؓ اور امیر المؤمنین علی مرتضیٰؓ بھی ہیں۔

ایسے ایسے آفتاب اور ماہتاب، جہاں زیر خاک ہوں، اس زمین کی نورانیت پر اگر خود آسمان بھی رشک کرنے لگے تو کس کو حیرت ہوسکتی ہے اور یہ چند نام تو صرف نمونہ کے طور پر لے دیئے گئے، کہ ان سے اس خطۂ صالحین کی عظمت، نورانیت کا کچھ اندازہ ہوسکے، ورنہ جہاں ایک نہیں، چند نہیں ہزاروں صحابی وتابعین سے لے کر اس تیرہ سو برس کے اندر بے شمار اولیاءِ کاملین اور ابرار صالحین کی پوری بستی کی بستی آباد ہوچکی ہو وہاں کے انوار وبرکات کا احاطہ کرنا کس کے بس کی بات ہے! آج ان میں کوئی ایک ہستی بھی علحدہ مدفون ہوتی، تو اس کا مزار مرجع خلائق بن جاتا۔ اور اس کے آستانہ پر ایک میلہ لگا رہتا، لیکن یہاں روضۂ رسول کا جوار ہے، بجلی کے قمقمے بڑے روشن سہی، ستاروں کی روشنی شب تار کی تاریکیوں کو کافور کردینے والی سہی، اور خوش جمال ماہتاب ان سب سے روشن تر سہی لیکن جب آفتاب عالمتاب طلوع ہوتا ہے تو اس کے پہلو میں کون ایسا ہے جس کی روشنی ماند نہیں پڑ جاتی! آستانۂ رسولؐ سے فرصت کس کو، اور فرصت ہو بھی تو دل کس کا، کہ بقیع تک جائے خواہ اس کا فاصلہ چند قدم ہی سہی! اسی حیص بیص میں دن گزرتے گئے اور ٹلتے گئے، لیکن بالآخر ایک روز صبح سویرے بعد نماز فجر کہ وہ وقت بقیع میں بالکل ہجوم کا نہیں ہوتا حاضری کا ارادہ کرلیا اور داغستانی صاحب کی رہبری میں چل کھڑا ہوا۔

(ص:۱۷۸،۱۷۹،۱۸۰)

شہرِ مدینہ کا پیغام

مسجد نبوی کے ہر ہر ستون اور ہر ہر محراب سے ایک ایک در اور ایک ایک دیوار سے قبا کی ایک ایک اینٹ سے بقیع کے ذرہ ذرہ سے شہرِ مدینہ کے چپہ چپہ سے ایک ہی پکار سنائی دی اور وہ پکار

مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللہ کی تھی، ہر جگہ ایک ہی جلوہ دکھائی دیا اور وہ جلوہ دین کی تقاضائے نصرت کا تھا! آج اللہ کے بجائے یاجوج کی الٰہیت والوہیت کا کلمہ ہر جگہ پڑھا جانے لگا ہے، عدالتوں میں حاکم مسلمان بنائے جاتے ہیں، اور ان مسلمان حاکموں سے شریعت کے فیصلوں میں ترمیم کرائی جاتی ہے، کونسلوں میں ممبر مسلمان لئے جاتے ہیں اور مسلمان ممبروں کی تجویزوں اور تقریروں سے شریعت کی دھجیاں اڑائی جاتی ہیں، وزارت وامارت کی کرسی پر مسلمان بٹھائے جاتے ہیں، اور ان مسلمان امیروں اور وزیروں کے احکام سے شریعت کو توڑا جاتا ہے، یونیورسیٹیاں اور درسگاہیں مسلمانوں کی قائم کرائی جاتی ہیں اور مسلمان ماہرین فن کے مقالات ومضامین سے شریعت پر قہقہے لگائے جاتے ہیں، حب وطن اور حب قوم کا جذبہ مسلمانوں میں پیدا کرایا جاتا ہے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ترک ترکیت کی، مصر مصریت کی پرستش شروع کر دیتے ہیں اور ہندی مسلمان بھی اپنے اسلام کو چھوڑ کر اپنی ہندیت پر فخر کرنے لگ جاتا ہے! قوالی کی محفلیں بہت دیکھ لیں، نعتیہ نظمیں بہت سی سن لیں، شعر شاعری بہت ہو چکی، اب اللہ کے ہاں سے پکار ہے تو یہ اور محمدؐ کے دربار سے طلب ہے تو اس کی کہ کچھ اللہ کے بندے اور محمدؐ کے امتی اٹھیں اور دین کی غیرت سے مست ودیوانے ہو کر، دوستوں اور عزیزوں سے بیگانے بن کر یاجوج کے لشکر کے مقابلے میں صف بستہ ہو کر کأنھم بنیان مرصوص باہر نکلیں اور اس ہاری ہوئی لڑائی میں حق کا علم بلند کر کے اپنے سر اور اپنی جانیں نذر کر دیں!

(ص:۲۰۰،۲۰۱)

چل چلاؤ

دن گزرتے دیر نہیں لگتی، دیکھتے دیکھتے روانگی کا زمانہ آن لگا. اور یہ تو خیر چند ہفتوں کا زمانہ تھا، جلد کٹ جانے والا تھا ہی، ساری کی ساری عمریں ایسی ہی تیزی اور روانی کے ساتھ گزر جاتی ہیں، اور پتہ بھی نہیں چلنے پاتا، کہ بچپن کے کھیل کب کھیلے، جوانی کی نیند کب سوئے، اور ضعیفی کے گوشۂ تنہائی میں کب بیٹھنے پر مجبور ہوئے!۔۔۔ایک دن وہ تھا کہ مدینہ آنے کی آرزوئیں تھیں، کیسے کیسے منصوبے باندھے جا رہے تھے. کیا کیا خیالی پلاؤ پک رہے تھے، ذوق وشوق کی کیسی کیسی امنگیں دل

میں اٹھ رہی تھیں لب پر کیا کیا دعائیں تھیں اور ایک دن یہ آ گیا (اور گو آیا اپنے وقت پر ہی لیکن ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یک بیک آ گیا) کہ کوچ کی گھنٹی بج گئی۔ اب چل چلاؤ کی تیاریاں ہو رہی ہیں، بستر لپیٹے جا رہے ہیں۔ سامان باندھا جا رہا ہے سواریوں کی فکر ہے، اور ایک ایک سے مل کر زبان پر الوداع والفراق!..... ذی قعدہ کی پہلی تھی، جب اس نور و برکت والے شہر میں داخل ہوئے تھے۔ ذی الحجہ کی چوتھی کو اس رحمت و مغفرت والے شہر سے باہر نکلے، جہاں ایک دن کا بھی قیام اگر میسر آ جائے تو تقدیر کی یاوری اور ابرار و متقین کی نصیبہ وری ہے۔ وہاں ایک دن نہیں، دو دن نہیں اکھٹے ۳۳ دن کی حاضری ایک تباہ کار نامہ سیاہ کو نصیب ہو گئی! شان کریمی کے بھی عجیب عجیب انداز ہیں، جس مفلس کو چاہیں، دم بھر میں مالا مال کر دیں، جس تہی دامن کو چاہیں آن کی آن میں گلزار بنا دیں۔ جس آتشکدہ میں چاہیں چشم زدن میں پھول کھلا دیں، نہ کریم کا دست کرم کوتاہ ہونے والا ہے، نہ بخششوں کا خزانہ کبھی خالی ہونے والا ہے!

(ص:۲۱۷،۲۲۶)

مدینہ سے رخصتی

مدینہ سے رخصتی کا منظر بھی ایک خاص منظر ہوتا ہے، اگر یہ تشبیہ بالکل ہی سوءِ ادب اور گستاخی میں داخل نہ سمجھی جائے، تو یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ گویا لڑکی ماں کے گھر سے رخصت ہو رہی ہے۔ یہ ذہن سے گڑھ کر نہیں کہا گیا! اپنی رفیقۂ حیات کے الفاظ کو دہرا دیا گیا، دوسروں کے حالات تو سنے سنائے ہیں، مگر اپنے قافلہ والوں کا حال تو دیکھا ہوا ہے کہ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز، لبوں پر آہیں، چہرے اترے ہوئے، منہ پر ہوائیاں اڑتی ہوئی، بدحواس و پریشان، مغموم و منتشر اور دل ہے کہ بھرتا چلا آ رہا ہے، چلتے ہیں، اور پھر پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں، اور دیکھنے سے جی نہیں بھرتا جی یہی چاہتا ہے کہ یہ منظر کبھی بھی نظروں سے اوجھل نہ ہو، بہانے ڈھونڈتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح کچھ دیر اور رکنا ہو جائے! عموماً سب کا یہی حال کم و بیش رہتا ہے بعض کو غش کی نوبت آ جاتی ہے، کانوں سے سنا بھی یہی اور آنکھوں سے دیکھا بھی یہی۔

(ص:۲۳۶)

جدّہ ۔۔۔۔ راہِ مکہ

دکھ کا احساس کسے؟ اور اذیت کی پروا کس کو؟ کیا کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ چل کہاں رہے ہیں؟ نصیبہ بمعنی قسمت، اور بخت کا عروج اور نصیبہ کا اوج کس کو کہاں لے جا رہا ہے، چل اس شہر کو رہے ہیں جس کو کسی نادان انسان نے نہیں، کسی سیاح جہاں گشت نے نہیں، کسی جغرافیہ نویس نے نہیں اور کسی نقشہ ساز نے نہیں، زمینوں اور آسمانوں کے پیدا کرنے والے نے لندن، پیرس کی چمک دمک اور جگمگاہٹ بخشنے والے برلن و نیویارک کو نیست سے ہست کرنے والے نے، اُم القریٰ یا سب بستیوں کی ماں کہہ کر پکارا ہے، ''ماں'' وہ ہے جس کے وجود کے بغیر اولاد کا وجود نہیں ہوتا۔ آج مکہ نہ ہوتا تو نہ کلکتہ ہوتا، نہ بمبئی ہوتا، نہ لکھنؤ نہ دہلی، نہ لاہور نہ مدراس اور نہ چین نہ جاپان، نہ مصر نہ ہندوستان، نہ انگلستان نہ سارا فرنگستان! قدیم مفسرین کہتے ہیں کہ مکہ روئے زمین کا مرکز ہے، نادان فرنگی اپنے جغرافیہ پر نازاں اسے ایک جہالت کی بات سمجھ کر ہنستا ہے اور کہتا ہے کہ زمین تو کرہ کی شکل میں ہے۔ اس میں کسی ایک متعین مقام کو وسط قرار دینے کے کیا معنٰی؟ اس جاہل اور جاہلی کو مرکز کے معنٰی صرف جغرافی مرکز کے معلوم ہیں، اور اس کی عقل صرف اسی کو مرکز جانتی ہے جو مادی آلات پیائش کے حساب سے سب کے وسط میں ہو، سو اول تو اس کے پاس اس حیثیت سے بھی اس مرکزیت کے عقیدے کے خلاف کوئی دلیل نہیں، لیکن اس کے علاوہ ''ام'' کے معنٰی مرکز جغرافی کے ہیں کب؟ ماں کا کام تو اولاد کا وجود میں لانا اور ان کی پرورش و تربیت کرنا ہے، پھر اگر آج بھی سب کی ایمانی پرورش اور روحانی تربیت مکہ سے نہیں تو اور کہاں سے ہو رہی ہے؟ سارے شہروں اور سارے ملکوں کی آبادیوں اور ساری بستیوں کے دین و ایمان کا مرجع اور تربیت و تزکیہ کا مرکز اگر مکہ نہیں تو کیا کوئی اور شہر ہے؟ رحمت کاملہ و قدرت مطلقہ نے اپنے آخری پیام رحمت کی بارش کے لئے کیا بجز اس سرزمین کے کسی اور کو چنا؟ اور اس پیام کا پیامبر، سب سے جامع، سب سے اہم، سب سے اکمل، سب سے آخر پیام لانے والا، کہاں پیدا ہوا؟ کہاں پلا؟ کہاں بڑھا؟ کہاں اس پر اس پیام کا نزول شروع ہوا، اور کہاں

کی گلیوں اور وادیوں میں وہ ایک دن دو دن نہیں، تیرہ برس تک اسی پیام کی منادی کرتا رہا؟

(ص: ۲۴۱، ۲۴۲)

ایک آیت کی تفسیر

أَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنا	کیا ہم نے ان لوگوں کو امن والے حرم میں جگہ نہیں
يُّجْبىٰ اِلَيْهِ ثَمَرَاتُ كُلِّ شَيْءٍ	دی، جس کی طرف ہر طرح کے میوے کھنچے چلے
رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا (قصص، ع ۶)	آتے ہیں، جو رزق ہے ہماری طرف سے۔

تلاوت میں آیہ کریمہ خدا معلوم کتنی بار نظر سے گزر چکی تھی، لیکن اس کا مفہوم پوری طرح، مکہ معظمہ میں حاضری کے بعد ہی واضح ہوتا ہے، ایک بے آب و گیاہ ملک، ہر طرف ریگ و ریگستان، پتھر اور خشک چٹانیں سبزی و شادابی کا کوسوں کیا معنی منزلوں پتہ نہیں، کنوئیں کا وجود عنقاء اور جھیل اور تالاب کا تو نام بھی کسی کے کان میں نہ پڑا ہوگا۔

موسم کی گرمی، لو کی لپٹ کی تیزی اس پر مستزاد، ایک طرف خشکی کے یہ سارے سامان، اور دوسری طرف تازہ پھلوں اور شاداب میووں کی وہ کثرت کہ بمبئی کے کرافرڈ مارکٹ یا دہلی کی فتحپوری کی دوکانوں کا دھوکا ہونے لگے! کھیرا ککڑی، سردہ، کیلا، تربوز، خربوزہ، کدو، لوکی، نارنگی، سنگترہ، انار، انگور، سیب، ناشپاتی، کشمش، لیموں، چیکو، شفتالو، آلو بخارا، خوبانی، موجود ہی نہیں بلکہ تروتازہ، سبز و شاداب شکل میں موجود! یہ اگر محض مکہ کی کرامت اور رب کعبہ کا کرم نہیں تو اور کیا ہے؟ اسبابِ ظاہری کے لحاظ سے اس کا تو خیال بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ رزقا من لدنا (یہ ہماری طرف سے بلا تائید اسباب طبعی و بغیر مساعدت تدابیر ظاہری مکہ والوں کے لئے رزق ہے) جس سچے نے کہا ہے کہ حرف بہ حرف سچ کہا ہے اور وہی ایک سچا اتنے بڑے دعوے کی بے دھڑک ہمت بھی کرسکتا تھا، جس سرزمین میں کچھ بھی نہ پیدا ہوتا ہو، وہاں یہ سب کچھ موجود ہونا، اور دعوے کے ساتھ اس حقیقت کا اعلان کردینا، قرآن مجید کی صداقت کا وہ مستقل معجزہ ہے جس کا مشاہدہ دنیا ساڑھے تیرہ سو برس سے مسلسل کرتی چلی آرہی ہے۔ اور خدا جانے آئندہ کب تک کرتی چلی جائے گی۔

(۲۶۵، ۲۶۶)

حرم شریف

سنتے چلے آئے تھے کہ اور کتابوں میں بھی بار بار پڑھا تھا، کہ کعبہ تجلی گاہِ جلال ہے۔ یہاں تجلیات قہری کا زور ہے، روایتوں کا اثر دل میں بیٹھا ہوا تھا، ہیبت و دہشت کا غلبہ تھا۔ ہمت بار بار جواب دے رہی تھی، اور دل یہ کہہ رہا تھا کہ سامنا کیوں کر کیا جائے گا؟ ''زمین'' کی زبان سے یہ مصرعہ بارہا سنا تھا، کہ

تو مرا خراب کردی بہ ایں سجدۂ ریائی!

دل کھٹک رہا ہے، ذرا کان لگا کر سننا کہیں یہ ندا اس وقت اسی مسجد حرم کی سرزمین سے تو نہیں آرہی ہے؟ شاعری کی دنیا میں بارہا یہ آواز کانوں میں پڑ چکی تھی۔

چو بطوافِ کعبہ رفتم بحرم رہم ندا ند
تو برو ن در چہ کردی کہ درون خانہ آئی!

کیا آج اور اس وقت یہ شاعری حقیقت بن کر رہے گی؟ یا اللہ اس پاک زمین پر اپنی ناپاک پیشانی کو کیوں کر رگڑا جائے گا؟ اس عظمت وجلالت والے مکان کے طواف پر کیسے قدرت ہوگی؟ جن گلیوں میں ہاجرہ صدیقہ دوڑی تھیں، نبی کی ماں اور نبی کی بیوی دوڑی تھیں وہاں اس ننگ امت سے ''سعی'' کیوں کر بن پڑے گی۔

(ص:۲۶۹)

کعبہ پہ پڑی جب پہلی نظر.....

لیجیے مسجد حرام کی چار دیواری شروع ہوگئی، کئی دروازے چھوڑتے ہوئے لوگ باب السلام سے اندر داخل ہوئے (داخلہ کے لئے یہی دروازہ سب سے بہتر مانا گیا ہے) کس کے اندر داخل ہوئے؟ اس ارض پاک کے اندر، اس بقعۂ نور کے اندر، جہاں کی ایک نماز ایک لاکھ، یا کم از کم ایک

ہزار نمازوں کے برابر ہے! اندر داخل ہوتے ہی نگاہ اس سیاہ غلاف والی عمارت پر پڑی، جسے خشکی اور تری میں نہ سما سکنے والے نے زمین و آسمان، عرش و کرسی کی سمائی میں نہ آنے والے نے، وہم وخیال کی وسعت میں نہ گھرنے والے نے ''اپنا گھر'' کہہ کر پکارا ہے، نگہ پڑی اور پڑتے ہی، جہاں پڑی تھی وہیں جم کر رہ گئی! اس گھڑی کی کیفیت کیا اور کن لفظوں میں بیان ہو. کہتے ہیں کہ موسیٰ کلیمؑ کے ہوش وحواس کسی کی ایک تجلی کی تاب نہ لا سکے تھے، جب ''تجلی بیت'' کا یہ حال ہے کہ ہوش وحواس قائم رکھنے دشوار تو ''رب البیت'' کی تجلی نے خدا معلوم کیا غضب ڈھایا ہوگا. جب ''گھر'' کی برق پاشیوں کا یہ عالم ہے؟ تو ''گھر والے'' کے انوار وتجلیات کی تاب کون بشری آنکھ اور انسانی بصارت لاسکتی ہے؟ اللہ اللہ! کیا حسن و جمال، کیا رعنائی وزیبائی ہے! جن لوگوں نے اسے قہر وجلال کی تجلی گاہ بتایا ہے خدا معلوم انہوں نے کیا اور کس عالم میں دیکھا! اپنا تو یہ حال تھا کہ سرتاپا مہر و جمال ہی ٹپکتا نظر آتا تھا اور ہر چہار طرف سے رفق والفت، شفقت ومرحمت کے کھلے ہوئے پھولوں کی خوشبوئیں لپکی اور دوڑی چلی آرہی تھیں، ابراہیم کی خلعت اسمٰعیل کی فداکاری، ہاجرہ کی مسکینیت، اللہ اکبر، جہاں تینوں اکھٹا ہوں گی! اب نہ قلب کو اضطراب ہے، نہ طبیعت میں انتشار، نہ خوف نہ دہشت، نہ رعب نہ ہیبت، سرتاسر سکون ہے اور انبساط سرور ہے اور نشاط! من دخله كان آمنا کی تفسیریں، بہت سی پڑھی تھیں لیکن جو تفسیر اس گھڑی بغیر کسی کتاب وعبارت کے توسط کے لوح قلب پر القاء ہو رہی تھی، وہ سب سے الگ، سب سے نرالی، سب سے عجیب تھی. اور اگر فاش گوئی کی اجازت دی جائے تو اپنے حق میں سب منقول ومکتوب تفسیروں سے بڑھ کر صحیح بھی تھی، آہ

در مصحف روئے او، نظر کن
خسرو، غزل وکتاب تا کے؟

روایات میں آتا ہے کہ خانہ کعبہ پر نظر کرنا ایک مستقل عبادت ہے.....لیکن اجر و عبادت سے قطع نظر کر کے اپنے ذوق وشوق اور ولولہ کے لحاظ سے کون دل ایسا ہے جو اس کی ہوس دیدار سے خالی اور اس کی حرص نظارہ سے کورا ہوگا؟ جی بیتاب کہ دیکھئے اور پھر دیکھئے دس بار دیکھئے،

ہزار بار دیکھئے دیکھتے رہیے، اور دیکھے جایئے اور دیکھنے سے کبھی نہ تھکئے! ع

نظارہ زجنبیدن مژگان گلہ دارد!

(ص: ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۳)

حریم قدس

مطاف، حج کے موسم میں، دن اور رات کے کسی گھنٹہ میں بھی خالی نہیں رہتا، ہر وقت اور ہر آن ایک مسلسل چکر ہے کہ جاری ہے صبح اور شام کے ٹھنڈے وقتوں کو چھوڑیئے، رات کے ایک اور دو بجے آ کر دیکھئے تو اور ٹھیک دوپہر کی تیز گرمی کے وقت آ کر دیکھئے تو، ایک دو نہیں سیکڑوں ہزاروں دیوانے بس برابر چکر کاٹتے ہوئے ہی ملیں گے، اور ان دیوانوں میں کیسے کیسے ہوشیار اور فرزانے بھی ہیں، مرد بھی عورتیں بھی کمزور بھی اور پہلوان بھی، لاٹھی ٹیک کر چلنے والے بھی بوڑھے بھی اور انگلی پکڑ کر چلنے والے بچے بھی، عالم بھی اور عامی بھی، زاہد بھی اور فاسق بھی، گدائے بینوا بھی اور بمبئی کے لکھ پتی کروڑ پتی سیٹھ جی بھی، صحرائے عرب کا بدوی بھی اور مصر کا فیشن مآب شہری بھی، بھوکے بنگالی بھی اور دکن کے سیر چشم امیر کبیر بھی، سب کے سب ایک رب کے پرستار، ایک اللہ کے بندے، ایک رسول کے امتی، ایک ہی آقا کے حلقہ بگوش، ایک دھن میں مست، برابر اس گھر کا چکر کاٹ رہے ہیں! ان میں کتنے صاحبان ولایت ہوں گے، کتنے اللہ کے اولیاءِ کاملین میں سے ہوں گے! انھیں کون پہچانے؟ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی (صاحب فتوحات مکیہ و فصوص الحکم) نے اسی مطاف میں کس کس کی زیارت نہیں کی ہے؟ کیسے کیسے مکاشفات ان کے نصیب میں آئے ہیں، کیا کیا اسرار انہوں نے یہیں حل کئے ہیں؟ لیکن آج کوئی آنکھ بھی محی الدین ابن عربی کی رکھتا ہے؟۔۔۔ طواف بھی وہی ہے، تجلیات اب بھی وہی ہیں، جواب میں لن ترانی کہنے والا اب بھی جوں کا توں ہے۔ لیکن ربِّ اَرِنی پکارنے والا بھی کوئی ہے؟

(ص: ۲۸۵)

کعبۂ مقصود

صرف خرچ ہونا، بہا دکھنا

اللہ اکبر! یہ کون سا گھر سامنے ہے؟ نگاہیں کس گھر کی دیواروں کی بلائیں لے رہی ہیں؟ یہی تو وہ گھر ہے جس کی بابت کہا گیا ہے ''دنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا'' روئے زمین پر سب سے پہلا عبادت خانہ! صدی دوصدی کی تعمیر نہیں، دو ہزار چار ہزار برس کی عمارت نہیں دنیا کا سب سے پہلا عبادت خانہ! کون تاریخ اس وقت کا پتہ بتا سکتی ہے؟ کس نسل انسانی کا حافظہ وہ زمانہ یاد رکھ سکتا ہے؟ جس گھر کی بنیادیں خود آدم نے اپنے ہاتھوں سے رکھی ہوں، بنی آدم میں کون اس وقت کی یاد اپنے حافظہ میں رکھ سکتا ہے؟

اللہ اللہ! اس طویل اور بے حساب مدت میں اس ناقابل پیمائش عرصہ میں کتنے عبادت خانے بنے اور بگڑے، کتنے مندر تعمیر ہوئے اور کھدے، کتنے گرجے آباد ہوئے اور اجڑے، کیسے کیسے انقلابات زمین نے دیکھے اور آسمان نے دکھلائے، بلندیاں پست ہوئیں، اور پستیاں بلند ہوئیں، بابل مٹا، روما مٹا، مصر مٹا، چین مٹا، ہندوستان مٹا، ایران مٹا، یونان مٹا، روما مٹا، خدا معلوم کتنے اُبھرے اور ابھر کر مٹے، کتنے بڑھے اور بڑھ کر گھٹے، پر ایک عرب کے ریگستان میں خاک اور ریت کے سمندر میں چٹانوں اور پہاڑوں کے وسط میں وادیوں اور گھاٹیوں کے درمیان یہ سیاہ چوکور گھر، جسے نہ کسی انجینیر نے بنایا نہ کسی مہندس نے، جوں کا توں کھڑا ہوا ہے! صدہا طوفان ہزار ہا انقلابات بیشمار زلزلے آئے اور گزر گئے اور اس پاک اور پیارے گھر کو نہ کوئی ابرہہ مٹا سکا، نہ کوئی زار نکولس، اور نہ کوئی گلیڈاسٹن، جو اسے مٹانے کو اٹھا وہ خود مٹ گیا، اور اللہ کے گھر میں اللہ کی جو عبادت آدم اور حوا نے کی تھی وہی آج آدم کے فرزند اور حوا کی بیٹیاں کر رہی ہیں! مبارکا کی تفسیر میں بہت سے اقوال لائے گئے ہیں لیکن اس کھلی ہوئی برکت اس مشاہد و محسوس برکت کے بعد کسی اور تفسیر کی ضرورت باقی نہیں رہتی؟

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ ''سب سے پہلا عبادت خانہ'' رومی مؤرخ پیروڈائس نے اعتراف کیا کہ

اس سے قدیم تر کوئی معبد نہیں ملتا۔ ڈوزی نے بھی یہی کہا، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا والوں نے اس کی قدامت تسلیم کی، میور تنقید کے لئے اٹھا، لیکن رومی مؤرخ کی تائید کے سوا اور کچھ نہ کہہ سکا، مارگولیس اسلام کی عداوت کے نشہ سے سرشار، لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا، لیکن اس کی ہذیان سرائی خود اسی کے پیشہ والوں اور قبیلہ والوں سے داد نہ حاصل کر سکی اور حق کا کلمہ جہاں تھا وہیں قائم رہا۔

(۲۸۸،۲۸۷)

مکانات لکھوکھا کے خرچ سے دنیا میں کتنے بن چکے، بادشاہوں کے محل بھی اور وزیروں کی کوٹھیاں بھی، رئیسوں کی حویلیاں اور نوابوں کے دیوان خانے بھی، سب مٹ گئے، خاک سے بلند ہوئے تھے اور خاک میں مل گئے۔ ساسانیوں کی عشرت گاہیں اور رومیوں کے حمام کہیں باقی ہیں؟ پرتھی راج کے محل اور تیمور کے قصر و ایوان آج کیوں نظروں سے غائب ہو گئے؟ آپ کہیں گے کہ آخر آگرہ میں تاج محل اور فرانس میں آئیفل ٹاور تو بہر حال موجود ہے، لیکن اول تو دو چار صدی کی مدت بھی کوئی مدت ہے؟ اور پھر بڑی بات یہ کہ موجود محض اس حیثیت سے ہیں، جیسے کہ لڑکوں کے کھلونے اور لڑکیوں کے گھروندے موجود رہتے ہیں، بجز ایک سیر و تماشہ اور دل بہلاوے کے ان کی کوئی اور حیثیت ہے؟ تاج محل اور آئیفل ٹاور کی عزت و احترام تقدیس، کسی کے دل میں ہے؟ ایک طرف وہ لاکھوں روپیہ کا اینٹ اور چونہ کھائے ہوئے لق و دق کھنڈر ہیں، اور دوسری طرف یہ ہر تکلف و تصنع سے معرّی، سادہ اللہ کا گھر ہے مثابۃ للناس و امنا، بے اندازہ مدت سے قائم! اور بیشمار عقیدتوں اور تعظیموں کا مرکز! لاکھوں ہر سال آتے ہیں، چومتے ہیں اور آنکھوں سے لگاتے اور طواف کرتے اور سجدہ کرتے، روتے اور گڑگڑاتے جھکتے اور گرتے، لاکھوں آتے ہیں اور ہر سال آتے رہتے ہیں۔

کچھ یاد ہے کہ آدمؑ کے زمانے کے بعد، اس کی تعمیر کی تجدید اولاد آدم میں سے کس نے کی ہے؟ اپنے ہاتھوں میں پتھر اور گارا لے کر کس نے اس کی دیواریں بلند کی ہیں؟ اللہ کے اس گھر کے

معمار کون تھے! بادشاہوں کے محل تعمیر ہوتے ہیں تو بڑے بڑے کاریگر اور مہندس بلائے جاتے ہیں. گورنمنٹ ہاؤس تیار ہونے لگتے ہیں تو نامور انجینیروں کی قسمت جاگ جاتی ہے پر اللہ کے گھر کی تیاری کے لئے اپنے سر پر بھاری بھاری پتھر کس نے لادے؟ اپنے ہاتھ چونے اور مٹی کے گارے میں کس نے سانے؟ عرب کی جلجلاتی دوپہروں میں ریگستانوں کی لُو کی لپیٹوں میں بغیر روپیہ پیسوں کی مزدوری کے لالچ کے کس مزدور نے اپنے گوشت و پوست کو جلایا، تپایا جھلسایا؟ کون بندہ جواب دے، بندوں کا خالق، اس گھر کا مالک خود اپنی زبان سے اپنے گھر کے مزدور اور اس مزدور کے نورِ نظر کا نام چاؤ اور پیار سے لیتا ہے وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرَاھِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ جب ابراہیم اس گھر کی بنیاد اٹھا رہے تھے اور اسمٰعیل بھی!

مزدور جب کام کرتے ہیں اکثر گنگناتے جاتے ہیں، اللہ کے مزدور بھی جس وقت کام کر رہے تھے تو اپنی زبانوں پر مہریں نہیں لگائی تھیں جس کا گھر بنا رہے تھے اسی سے کچھ مانگتے بھی جاتے تھے، ہاتھ اگر تعمیر بیت میں مشغول تھے تو دل یاد رب البیت میں، دل میں کسی کی یاد تھی تو زبان پر کسی کا نام! عاجزی تھی اور بندگی، مسکنت تھی اور تذلل. پتھر پر پتھر جوڑتے جاتے تھے اور دل کے سوز و گداز کے ساتھ چشم اشکبار کے ساتھ زبانیں اس ذکر میں مشغول تھیں

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ — اے ہمارے رب! ہماری یہ خدمت قبول فرما، بیشک تو تو سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے! تجھ پر تو ہماری زبان کا قال بھی روشن اور دل کا حال بھی عیاں ہے۔

العظمۃ للہ! اللہ پر قربان ہونے والوں، اللہ کے خلیل کہلانے والوں کی یہ شان ہوتی ہے! اپنے کو مٹا چکے ہیں، پھر بھی دھڑکا یہی لگا ہوا ہے کہ یہ اپنے کو مٹانا بھی قبول ہوتا ہے یا نہیں!

(ص:۲۹۲،۲۹۳)

چاہِ زمزم

حضرت ابراہیم شام سے آ کر اپنی بیوی حضرت ہاجرہ اور شیر خوار صاحبزادہ حضرت اسمٰعیل کو جب مکہ میں چھوڑ کر واپس جانے لگے تو ایک مشک پانی اور کچھ کھجوریں ان کے پاس رکھ گئے تھے، ایک مشت کب تک کام دیتی، پانی ختم ہوا، اور ماں اور بچہ پر پیاس کا غلبہ، قریب میں صفا و مروہ دو پہاڑیاں تھیں، مائی ہاجرہ اپنی اور اپنے نورِ نظر دونوں کی پیاس سے بے قرار ہو کر ان پہاڑیوں کی طرف پانی کی تلاش میں بار بار دوڑتی تھیں کہ شاید ان کی آڑ میں کوئی قافلہ آتا جاتا نظر آ جائے جس سے پانی کی کچھ مقدار مانگ لائیں، ادھر شیر خوار پیمبر زادہ نے جو تڑپ تڑپ کر زمین پر پیر پٹخے تو ایڑیوں کے نیچے زمین سے پانی کا ایک چشمہ جاری ہو گیا حضرت ہاجرہ جب سات پھیروں کے بعد مایوس واپس آئیں تو دیکھا صاحبزادہ کے قدموں کے نیچے ایک چشمہ جاری ہے!۔۔۔۔ آگے چل کر اور جوان ہو کر جس کے قدموں کے نیچے ایک عالم کی روحانی پیاس کی تسکین کے لئے فیض و ہدایت کا چشمہ جاری ہونے والا ہوا گر بچپن میں مادی سیرابی کے سامان کا ظہور اس کے قدموں کی برکت سے ہو گیا تو کوئی عقل اور قیاس اسے اپنے اوپر بار کیوں محسوس کرے؟۔۔۔۔ بہر حال حضرت ہاجرہ نے جو یہ ماجرا دیکھا تو باغ باغ ہو گئیں، اور مٹی سے گھیر کر پانی کے لئے ایک کنوئیں کی سی شکل قائم کر دی، اسی حالت میں زبان سے نکلا تھا "زم زم" ٹھہر ٹھہر، بس اسی وقت سے اس کا نام زمزم پڑ گیا۔

(ص:۳۰۶)

صفا و مروہ

صفا و مروہ کسی زمانہ میں اونچی پہاڑیاں تھی مائی ہاجرہ پانی کی تلاش میں مضطر و بیقرار ہو کر انھیں پہاڑیوں پر چڑھ چڑھ کر دیکھتی تھیں کہ شاید دور سے کوئی قافلہ نظر پڑ جائے اور اس سے پانی حاصل ہو جائے، اب تو پہاڑیاں باقی نہیں رہیں، معمولی بلندی کے چبوترے سے کچھ رہ گئے ہیں، حضرت ہاجرہ سات ہی پھیرے کرنے پائی تھیں کہ شیر خوار نورِ نظر کی ایڑیوں کے نیچے سے پانی کا چشمہ اُبلنے لگا تھا اور اس صدیقہ کی سعی ختم ہو گئی تھی، بس اس سعی کی یادگار آج تک قائم چلی آ رہی ہے ۔۔۔۔ اللہ والوں اور اللہ والیوں کا مرتبہ ذرا دیکھنا! طالب اس راہ میں خود مطلوب بن جاتے ہیں!

ہاجرہ صدیقہ نے زندگی میں ایک بار سات پھیرے کئے تھے، اس کی یادگار میں اس ساڑھے تیرہ سو برس کی مدت میں، کتنے لاکھ کتنے کروڑ کتنے ارب کتنے پھیرے اس راہ پر اپنے دربار کی حاضری دینے والوں سے کرائے جا چکے ہیں، اور دنیا کا کوئی ریاضی داں حساب لگا سکتا ہے کہ قیامت تک ان پھیروں اور پھیرے کرنے والوں کی تعداد کہاں تک پہونچے گی! سالہا سال نہیں، صدیاں گزر چکی ہیں، اور ہاجرہ کے نقش قدم پر چلنے والوں کا تانتا ہے کہ کسی کے توڑنے نہیں ٹوٹتا!

(ص:۳۱۰)

عرفات

لکھوکھا کے مجمع میں لوگ سب ہی طرح کے ہیں، ہر مزاج، ہر مذاق، ہر مرتبہ کے نمونے موجود ہیں، ہزاروں ایسے ہیں، جو عرفات کی حاضری کو ایک طرح کی تفریحی تقریب سمجھے ہوئے ہیں، اور چائے پینے پلانے کی دعوتوں میں مصروف ہیں، سینکڑوں ہزاروں ایسے ہیں جو سو سو کر اپنا وقت کاٹ رہے ہیں کہیں کہیں دیگیں چڑھی ہوئی ہیں، اور اعلےٰ درجہ کی بریانی پلاؤ کا سامان ہو رہا ہے، پھر بھی ہزاروں بندے اللہ کے ایسے بھی ہیں جو وقت کی قدر و قیمت کو پہچانے ہوئے اور مقام کی اہمیت کو پوری طرح جانے ہوئے، اس دوپہر کی ایک ایک گھڑی اور اس سہ پہر کا ایک ایک لمحہ اپنے رب کے آگے ہاتھ پھیلانے اور پیشانی رگڑنے، رونے اور گڑگڑانے استغفار و مناجات کرنے میں بسر کر رہے ہیں انھیں میں کیسے کیسے مخلص و متقی ہوں گے، قطب ہوں گے ابدال ہوں گے، اولیاء ہوں گے، کاملین ہوں گے، ان کی دعائیں کیا تنہا اپنے نفسوں کے لئے ہوں گی؟ ان کے رب کی رحمتوں کا نزول کیا صرف انھیں کے لئے ہوگا؟ اللہ اور اللہ والوں سے تنگ دلی کی بدگمانی! نعوذ باللہ! آج تو وہ دن ہے کہ کسی کا کرم بے حساب اور رحمت بے پایاں اپنے سایۂ دامن میں لینے کے لئے حیلہ ڈھونڈتی ہے اللہ والوں کی سفارش سے بڑھ کر اور کیا حیلہ ہوگا، ان مقبولوں کے طفیل میں خدا معلوم کتنے غیر مقبول آج مقبول بن جاتے ہیں اور کتنے مفلسوں اور تہی دستوں کا شمار آج سے سرمایہ داروں میں ہونے لگتا ہے کریم جب دینے پر آئے اور کریم کے در کے بھکاری مانگنے میں کمی نہ کریں، تو داد و دہش

کی کیا کمی! اہل و نااہل کس و ناکس حقدار اور بے حقے کھرے اور کھوٹے سب ہی اپنی قسمتوں کے حصہ کے مطابق نعمتوں سے سرفراز اور دولتوں سے مالا مال ہو رہے ہیں!

صوفیہ کے تذکروں میں آتا ہے کہ علی بن موفق ایک بہت قدیم بزرگ گزرے ہیں، حج کے لئے حاضر ہوئے، نویں شب میں منیٰ میں خواب دیکھا کہ اب کی کتنے حاجی آئے جواب ملا کہ ۶ لاکھ! پھر پوچھا کہ حج مقبول کتنوں کا ہے؟ جواب ملا کہ ۶ کا۔ ۶ لاکھ میں کل ۶! ہول و دہشت سے آنکھ کھل گئی اور دل نے کہا کہ اپنا شمار ان چھ خوش نصیبوں میں تو بہر حال نہیں ہو سکتا، معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری محنت و مشقت بیکار ہی گئی، دسویں شب میں عرفات سے واپسی کے بعد پھر اسی طرح خواب میں انھیں دو فرشتوں کو دیکھا، ایک نے پوچھا کہ حج مقبول کل چھ کا ہوا؟ دوسرے نے جواب دیا کہ ان چھ کے طفیل میں پورے چھ لاکھ کے حج قبول ہو گئے! العظمۃ للہ! ان نوازشوں اور سرفرازیوں کا کوئی ٹھکانا ہے! ان رحمتوں اور بخششوں کی کوئی حد و انتہا ہے!۔۔۔۔ ان حکایتوں پر حیرت کیوں کیجئے، کیا روزمرہ آپ نہیں دیکھتے رہتے کہ غلّہ کے انبار میں جو مٹی اور کنکے پڑ جاتے ہیں وہ غلّہ ہی کے حساب سے بکتے ہیں اور سونے میں جو گرد و غبار شامل ہو جاتے ہیں وہ بھی سونے ہی کے ساتھ تلنے لگتے ہیں!

(ص: ۳۵۷، ۳۵۸)

عرفات کی بارش

آفتاب غروب ہونے لگا سب کے خیمے اکھڑ چکے، ہمارے خیمے اکھڑ ہی رہے تھے کہ بے شان و گمان بغیر کسی موسمی توقع و تغیر کے دفعتاً آسمان پر ایک طرف سے ابر کا ٹکڑا آتا نمودار ہوا دو چار بار بجلی چمکی، بوندیں شروع ہوئیں اور چند ہی لمحوں میں اچھی خاصی بارش ہونے لگی! کریم کی کریمی اور مولا کی رحمتوں کی تھاہ کون پا سکتا ہے! احرام پوشوں کے جسم کہاں تو ابھی جلجلاتی ہوئی دھوپ میں تپ رہے تھے اور کہاں ابھی پانی میں لت پت ہونے لگے، بارش ہوئی اور خوب اچھی طرح ہوئی، لوگ بھیگے اور خوب بھیگے "بارانِ رحمت" کا لفظ سنا بارہا تھا، حقیقۃً "بارانِ رحمت" کا مشاہدہ آج ہی ہوا! لوگ کہتے ہیں کہ عرفات کی بارش حج کی مقبولیت کی علامت ہے۔ یہ اگر سچ ہے تو خدا ہی کو علم ہے کہ اب کی حج میں کون اللہ کا شیر تھا، بارش

پانی کی کیوں تھی یوں کہیے کہ عفو و مغفرت کی بارش تھی، اور جو جو بوند جسم پر گرتی تھی بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ معاصی کی سیاہیاں دھل رہی ہیں!

(ص ۳۶۶)

قافلہ چلا! اس وقت کے سفر کی کیا کیفیت بیان ہو، عرب میں اونٹوں اور موٹروں پر سفر بہت سے کیے، دن اور رات کے مختلف حصوں میں بھی کیے، لیکن اتنا پُر لطف، اتنا دل کش، اتنا فرحت انگیز سفر نہ اس کے قبل کوئی ہوا نہ اس کے بعد. چاندنی رات، پانی برس کر آسمان بالکل کھل چکا تھا. کھلے ہوئے آسمان میں شب دہم کا چاند، ہر طرف روشنی پھیلی ہوئی، بارش ہو جانے سے موسم کی حالت بالکل بدلی ہوئی، نہ تپش، نہ لُو، نہ گرمی، نہ اُمس، اس کے بجائے خوشگوار خنکی، لطیف و سبک ہواؤں کے جھونکے چلے آرہے ہیں. یہ معلوم ہو رہا ہے کہ اپنے صوبہ یوپی میں مارچ یا اکتوبر کے مہینہ کی شام ہے! مصری اور بدوی حاجی حج کی خوشی میں طرح طرح کے ترانے گا رہے ہیں، پہاڑوں سے آواز ٹکراتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جیسے پہاڑیاں اور چٹانیں بھی جشن مسرت و طرب میں شریک ہیں! طرح طرح کی بڑی بڑی مشعلیں اور گیس کی روشنیاں نورٌ علیٰ نور. داہنے اور بائیں، آگے اور پیچھے سو پچاس نہیں ہزار ہا اونٹ، اوپر نظر اٹھایئے تو دلکش اور پیارا آسمان، نیچے دیکھیے تو مضبوط اور بوجھ اٹھانے والی زمین، اِدھر اُدھر نظر دوڑایئے تو ہر طرف پہاڑیوں کا سلسلہ سورۃ الغاشیہ کی آیت کریمہ اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ وَاِلَی السَّمَاءِ کَیْفَ رُفِعَتْ وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ کی دلنشیں تفسیر بغیر کسی لفظ و عبارت کی وساطت کے زبان حال سے از خود ہوتی جا رہی ہے! فقہا لکھتے ہیں، کہ مزدلفہ کے راستہ میں تکبیر و تہلیل اور اللہ کی حمد و ثنا کرتا رہے، اور ایک قلب ہی مضغہ گوشت پر کیا موقوف ہے. ہر ہر بن مُو اس وقت شکر نعمت کی صدائیں دے رہا ہے. صبر کے مرحلے اس سفر میں جھیلنے کو بکثرت ملتے ہیں، یہ موقع خالص شکر کے طے کرنے کا ہے! شکر گزاروں کی تو ہر گھڑی میں گزرتی ہے، یہ گھڑی وہ ہے کہ ناشکرے بھی شکر گزار بن جاتے ہیں. اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ.

(ص: ۳۷۱، ۳۷۲)

گرایں سودا.....

بزرگوں نے کہا کہ دل کا سکون اور چین چاہتے ہو تو دل کا تعلق اللہ سے پیدا کرو. یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ اللہ سے دل لگانا تو اللہ والوں کا کام ہے. اللہ تک اگر براق ہمت اور کمند حوصلہ کی رسائی نہیں ہوتی تو بیت اللہ تک کیوں نہ پہونچئے؟ اور دل کے تصور کو چھوڑ کر آنکھوں سے دیدار کی دولت کے حصول میں کیوں قصور کیجئے؟ مکان والے کے جمال کا حال تو قدوسیوں اور ملکوتیوں سے پوچھیے، باقی خود جو زیبائی ومحبوبی ہے، اس سے اگر کوئی خاکی وناسوتی باوصف قدرت محروم رہے تو اس بیچارے کی محرومی پر جی چاہتا ہے دل کھول کر آنسو بہایئے. لوگ کہتے ہیں اور سچ کہتے ہیں کہ حج کے سفر میں بڑی بڑی زحمتیں پیش آتی ہیں. لیکن ادائے فریضہ حج کا احساس تو الگ رہا عرفات کی حاضری، مزدلفہ کی شب باشی، منیٰ کی قربانی یہ ساری چیزیں الگ رہیں، محض کعبہ کا دیدار، سیاہ پتھر والے اور سیاہ غلاف والے بقعہ نور کا پرتو جمال بجائے خود وہ نعمت ہے کہ اس کی قیمت میں اگر صدہا سفر اور ہر سفر کی صدہا زحمتیں اور صعوبتیں پیش کرنی پڑیں تو رب کعبہ کی قسم ہے کہ سودا پھر بھی ارزاں ہے. یہ جو کچھ آج عرض کر رہا ہوں، اپنے جیسے کور بصروں اور ٹھیٹھ دنیاداروں کی زبان سے کہہ رہا ہوں، باقی عارفوں اور بصیرت والوں کے نزدیک تو ہر بار اگر سر بھی نذر کرنا پڑے، جب بھی یہ سودا گراں نہ ہو!

متاع وصل جاناں بس گراں ست

گرایں سودا بہ جان بودے چہ بودے!

''وصل جاناں'' سے شاعر نے جو کچھ مراد لی ہو، ہم کوتاہ بینوں کے لئے تو در جاناں تک رسائی اس گھر کی زیارت ہی سب سے بڑی دولت اور اپنی ہمتوں اور حوصلوں کا آخری منتہیٰ ہے!

(ص:۳۹۸،۳۹۹)

منیٰ بعد حج

آج کی چپقلش ہر روز اور ہر موقع سے بڑھی ہوئی ہے. آج کی کشمکش کا منظر محض دیکھنے

سے تعلق رکھتا ہے کسی کے قلم کے بس کی بات نہیں کہ اس ہجوم کا پورا نقشہ کاغذ پر پیش کر سکے" یک انار وصد بیمار" بارہا سنا تھا "ایک سڑک وصد ہزار سوار" کا منظر آج آنکھوں سے دیکھا۔ بیچارے سو بیمار ایک انار پر کیا اس طرح ٹوٹ کر گریں گے کیا اس طرح چھین جھپٹ کریں گے، کیا اس طرح ایک دوسرے سے گتھ سکیں گے جس طرح سو کے سو گتھے، ایک دوسرے سے ریل پیل دھکم دھکا اور زور آزمائیوں میں مصروف تھے، معاذ اللہ، معاذ اللہ، ان میں بیمار ولاغر بھی تھے اور ہٹے کٹے توانا تندرست بھی بوڑھے بھی اور بچے بھی، شہ زور مرد بھی اور کمزور عورتیں بھی، متین وحلیم بھی اور جاہل واجڈ بھی، بات کو طرح دے جانے والے بھی اور بلابات کے الجھ پڑنے والے بھی، پیدل بھی سوار بھی، اونٹ اور ساٹھیاں بھی اور گھوڑے گدھے بھی، آنے والے بھی اور جانے والے بھی، ایک سڑک اور ایک رہ گزر! زبانیں بھی چل رہی ہیں، اور کہنیاں بھی اور ہاتھ بھی! جو نہیں چل پاتیں وہ صرف ٹانگیں ہیں، اور نہیں اٹھ پاتے وہ صرف قدم ہیں، اونٹ سے اونٹ بھڑ رہے ہیں، شغدف سے شغدف لڑ رہے ہیں، سر سے سر ٹکرا رہے ہیں، وحشت زدہ اونٹوں کی بھیانک بلبلاہٹ اور اس سے کہیں زیادہ بھیانک ان کی وحشت زدہ سواریوں کی چیخ وپکار! محض خدا کی قدرت ہے کہ سیکڑوں حادثے اس وقت واقع نہیں ہو جاتے، مکہ سے منیٰ آتے وقت اور مزدلفہ سے منیٰ واپس ہوتے وقت، اور دوسرے موقعوں پر بھی سخت ہجوم اور اژدھام کا سامنا ہوتا ہے۔ لیکن آج کا ہجوم واژدھام ان سب سے کہیں بڑھا ہوا ہے۔

(ص:۳۱۰)

حج رب البیت

شیخ عثمان بن علی ہجویری لاہوری (داتا گنج بخش) کشف المحجوب میں روایت فرماتے ہیں کہ ایک صاحب حضرت جنید بغدادیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے پوچھا کہ کہاں سے آرہے ہو؟ جواب ملا کہ "حج سے واپس ہو رہا ہوں"۔ پوچھا حج کر چکے۔ عرض کیا کہ "کر چکا" فرمایا جس وقت گھر سے روانہ ہوئے اور عزیزوں سے جدا ہوئے تھے اپنے تمام گناہوں سے بھی

مفارقت کی نیت کر لی تھی؟ کہا ''نہیں یہ تو نہیں کیا تھا'' فرمایا بس تم سفر حج پر روانہ ہی نہیں ہوئے، پھر فرمایا کہ راہ میں جوں جوں تمہارا جسم منزلیں طے کر رہا تھا تمہارا قلب بھی قرب حق کی منازل طے کرنے میں مصروف تھا؟ جواب دیا کہ ''یہ تو نہیں ہوا'' ارشاد ہوا کہ پھر تم نے سفر حج کی منزلیں طے ہی نہیں کیں. پھر پوچھا کہ جس وقت احرام کے لئے اپنے جسم کو کپڑوں سے خالی کیا تھا اس وقت اپنے نفس سے بھی صفات بشریہ کا لباس اتارا تھا؟ کہا ''یہ تو نہیں کیا تھا'' ارشاد ہوا پھر تم نے احرام ہی نہیں باندھا، پھر پوچھا کہ عرفات میں وقوف کیا تو کچھ معرفت بھی حاصل ہوئی؟ کہا ''یہ تو نہیں ہوا'' پھر فرمایا کہ تم نے عرفات میں وقوف ہی نہیں کیا، پھر پوچھا کہ جب مزدلفہ میں اپنی مراد کو پہونچ چکے تو اپنی ہر مراد نفسانی کے ترک کا بھی عہد کیا تھا؟ کہا کہ ''یہ تو نہیں کیا تھا'' ارشاد ہوا کہ پھر مزدلفہ تم حاضر ہی نہیں ہوئے، پھر پوچھا کہ خانہ کعبہ کے طواف کے وقت صاحب خانہ کا بھی جمال نظر آیا تھا؟ کہا کہ ''یہ تو نہیں ہوا تھا'' ارشاد فرمایا کہ پھر طواف ہی نہیں ہوا. پھر جب پوچھا کہ جب صفا و مروہ کے درمیان سعی کی تھی تو مقام صفا اور درجہ مروہ کا بھی کچھ ادراک ہوا تھا؟ کہا ''یہ تو نہیں ہوا تھا'' ارشاد ہوا کہ پھر سعی بھی تم نے نہ کی، پھر پوچھا کہ جب منیٰ آئے تو اپنی ساری آرزوؤں کو تم نے فنا کیا؟ کہا ''یہ تو نہیں کیا تھا'' ارشاد ہوا کہ پھر تمہارا منیٰ جانا لاحاصل رہا. پھر پوچھا کہ قربانی کے وقت اپنے نفس کی گردن پر بھی چھری چلائی تھی؟ کہا ''یہ تو نہیں کیا تھا'' ارشاد ہوا کہ پھر تم نے قربانی ہی نہیں کی، پھر پوچھا کہ جب کنکریاں ماری تھی تو اپنے جہل و نفسانیت پر بھی ماری تھیں؟ کہا ''یہ تو نہیں کیا تھا'' ارشاد ہوا کہ پھر تم نے رمی بھی نہ کی اور اس ساری گفتگو کے بعد آخر میں فرمایا کہ ''تمہارا حج کرنا نہ کرنا برابر رہا اب پھر جاؤ صحیح طریقہ پر حج کرو''۔

(عس: ۴۲۵، ۴۲۶)

دل والوں نے جب حج ادا کئے ہیں، بارہا اس طرح کئے ہیں کہ محض تن والے دنگ رہ گئے ہیں نہ زاد و توشے کی فکر ہے، نہ مرکب و راحلہ کا سامان کیا ہے، نہ کسی رفیق عزیز کو ہمراہ لیا ہے، نہ منزلوں پر پہونچ کر قیام کیا ہے، نہ پانی کی صراحیاں ساتھ لی ہیں، تن تنہا اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، اور

خالی ہاتھ چل دیے ہیں، بادیہ کی جلجلاتی ہوئی ریگ پر ننگے پیر، اور عرب کی انتہائی کڑی دھوپ میں ننگے سر، ایک دو دن کی نہیں، ہفتوں اور مہینوں کی مسافتیں طے کی ہیں، روزوں پر روزے رکھے ہیں، اور فاقوں پر فاقے کئے ہیں، پھر کوئی ایک دو مثالیں ہوں تو درج کی جائیں کس کس کے نام، اور کہاں تک گنائے جائیں۔ طاؤس الفقراء الشیخ ابونصر سراج اپنی کتاب اللمع میں اس طرح کی بہت ساری حکایات روایات درج کر کے لکھتے ہیں کہ ان اللہ والوں کے آداب حج یہ ہیں کہ جب یہ میقات پر پہونچ کر غسل کرتے ہیں تو اپنے جسم کو پانی سے دھونے کے ساتھ ہی اپنے قلب کو توبہ میں غسل دیتے ہیں، جب احرام پہننے کے لئے اپنے جسم سے لباس اتارتے ہیں تو قلب سے بھی لباس محبتِ دنیا اتار ڈالتے ہیں، جب زبان سے لبیک لا شریک لبیک کہنا شروع کر دیتے ہیں تو حق کو پکارنے کے بعد شیطان و نفس کی پکار پر جواب دینا اپنے اوپر حرام قرار دے لیتے ہیں جب خانۂ کعبہ کا طواف کرنے لگتے ہیں تو آیہ کریمہ وَتَرَى الْمَلَائِكَةَ حَافِّينَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ کو یاد کر کے عرش الٰہی کے گرد طواف کرنے والوں فرشتوں کا تصور جماتے ہیں، جب حجر اسود کو بوسہ دیتے ہیں گویا اس وقت حق تعالیٰ کے ہاتھ پر اپنی بیعت کی تجدید کرتے ہیں، اور اس کے بعد اپنے ہاتھ کا کسی خواہش کی طرف بڑھانا گناہ سمجھنے لگتے ہیں، جب صفا پر چڑھتے ہیں تو اپنے قلب کی کدورت کو بھی صفائی سے بدل لیتے ہیں، جب سعی کرنے میں تیز دوڑتے ہیں تو گویا شیطان سے بھاگتے ہوتے ہیں، جب عرفات میں حاضر ہوتے ہیں تو تصور کے سامنے میدانِ حشر کا نقشہ جماتے ہیں، جب مزدلفہ میں آتے ہیں تو ان کے قلب ہیبت و عظمت حق تعالیٰ سے لبریز ہوتے ہیں، جب کنکریاں پھینکتے ہیں تو اپنے اعمال و افعال یاد کرتے جاتے ہیں، جب سر منڈاتے ہیں تو ساتھ ہی اپنے نفسوں پر بھی چھری چلاتے رہتے ہیں۔۔۔۔ جنہوں نے یہ آداب حج اپنی کتابوں میں لکھے، اور جو انھیں عمل میں لائے، وہ نور کے بنے ہوئے اور آسمانوں پر اڑنے والے فرشتے نہ تھے، ہماری آپ کی طرح مٹی کے پتلے اور اسی مادّی زمین پر چلنے پھرنے والے انسان ہی تھے۔

(ص:۴۲۹، ۴۳۰)

جہاز، بمبئی، وطن

جاتے وقت اکبر پر گئے تھے۔۔۔۔''اللہ اکبر'' کی بڑائی اور کبریائی پکارنے والوں کی سواری کے لئے ''اکبر'' سے زیادہ موزوں جہاز اور کون ہوسکتا ہے؟۔۔۔۔واپسی کے وقت رحمانی پر سوار ہونا نصیب میں آیا، حج ذرّہ کو آفتاب بنادیتا ہے، پھر اگر واپس ہونے والوں کے ساتھ رحم و رحیمیت کے معاملات شروع ہوگئے ہوں اور تمام تر رحمت ورحمانیت کے کاروبار ہونے لگے ہوں تو دل ''رحمانی'' کے نام سے کیوں نہ تفاول کرے! اور رحمٰن ورحیم کے مرحمت وغفران کے بیشمار حیلوں اور بے حساب بہانوں میں ایک تازہ عنوان کا اضافہ کرتے کیوں ہچکچائے؟ ''رحمانی'' صرف جہاز ہی کا نام کیوں سمجھئے؟ سواری پر جتنے سوار تھے اگر وہ سب کے سب رحمانی ہوں، اگر ان سب کا شمار رحمانیوں میں ہوگیا تو خدائے رحمٰن ورحیم کے رحم وکرم سے کچھ بھی بعید ہے؟ کسی کی بڑائی پکارنے والے دل ہوں یا نہ ہوں بڑائی پکارنے والی زبانیں تو سب ہی کی تھیں، اور خود اس بڑے کا دیدار روحانی نہ سہی، اس بڑے گھر کی زیارت کرنے والی ماڈی آنکھیں تو ہر ایک کی تھیں، پس اگر واپسی کے وقت بحرِ قدرت کے عبور کے لئے سفینہ رحمت ورحمانیت عطا کردیا گیا ہو تو اس پر حیرت کیوں کیجئے؟

(ص:۴۶۳)

اب پھر وہی ڈیڑھ ہفتہ کے لئے لق ودق اور اتھاہ سمندر سے سابقہ خشکی، خشکی کی ہر شے سے دوری اور بے تعلقی، نہ پہاڑ نہ جنگل، نہ شہر نہ دیہات، نہ چرند نہ پرند، نہ باغ نہ مکان، نہ شجر نہ حجر، نہ سڑک نہ دوکان، بس ہر وقت اور ہر سمت عالم آب، اوپر نیلا آسمان اور نیچے نیلا سمندر، نہ کہیں اسٹیشن نہ قیام، دن رات مسلسل روانی ہی روانی۔ کامرانی میں بھی ٹھہرنا نہیں بس بمبئی تک برابر چلتے ہی رہنا ہے۔ کچھ تو حج کی برکت اور کچھ اس لئے کہ طبیعت مانوس ہوچکی ہے، واپسی میں سمندر کی دہشت اور سمندر سے وحشت، کسی قدر کم ضرور ہوجاتی ہے، لیکن جاتی نہیں رہتی، وطن کا شوق دل پر غالب کہ کل

کے پہنچتے آج ہی پہونچ جائیں، اور انتظار کی ایک ایک گھڑی طبیعت پر گراں، لیکن دن اور رات گھنٹے اور منٹ تو بہر حال اپنے وقت مقررہ ہی پر پورے ہوں گے. ہر روز خوش خوش حساب لگا رہے ہیں اور اندازے ہو رہے ہیں کہ فلاں تاریخ فلاں وقت بمبئی پہونچیں گے، فلاں فلاں سے ملیں گے فلاں ٹرین سے روانہ ہوں گے، یوں وطن کو تار دیں گے، یوں وطن پہونچیں گے. کپتان سے سوالات کی بھر مار ہو رہی ہے اور جن بیچاروں کی رسائی کپتان تک نہیں. وہ خلاصیوں ہی سے پوچھ پاچھ کر دل کو تسکین دے رہے ہیں سب اپنے اپنے حال میں مست اور اپنے اپنے منصوبے میں مگن، لیکن سمندر کا تلاطم ہر منصوبے پر غالب اور ہوا کے ہول انگیز تھپیڑے ہر تخمینہ کے غارت گر!

اطمنان تھا کہ خطرہ کے وقت سے قبل ہی انشاء اللہ بمبئی پہونچ جائیں گے، لیکن کیا انسان اور کیا انسان کا ارادہ اور اندازہ، تین چار دن تو سمندر کی حالت غنیمت رہی، اس کے بعد تیز و تند ہوائیں چلنی شروع ہو گئیں اور موجوں نے بلند ہو ہو کر جہاز سے ٹکریں کھانی شروع کیں، اس کیفیت کا پورا اندازہ بغیر بحری سفر کا ذاتی تجربہ کئے ہو نہیں سکتا. یہ معلوم ہوتا تھا کہ سطح سمندر سے دس دس بارہ بارہ بلکہ پندرہ پندرہ بیس بیس فٹ اونچیں موجیں، ہر سمت سے اُمنڈ امنڈ کر اور بلند ہو ہو کر جہاز پر حملہ آور ہو رہی ہیں! اور ساتھ ہی جہاز ڈانوں ڈول ہونا شروع ہوا، اوپر کے عرشہ پر بیٹھ کر دیکھئے تو ابھی یہ نظر آ رہا ہے کہ داہنا پہلو نیچا ہوتے ہوتے بالکل زیر آب ہو جانے کو ہے اور ابھی یہ نظر آ رہا ہے کہ داہنا پہلو تو نکل آیا اور اب بایاں پہلو جھکتے جھکتے غرق ہونے پر ہے! دل کی گھبراہٹ کو چھوڑیئے، زبانوں پر واویلا کا بھی ذکر نہیں، ستم یہ ہوا کہ سروں میں بھی چکر آنے شروع ہو گئے، اور متلی کی بیماری پھیل گئی جسے دیکھئے بستر پر پڑا ہوا، جو اٹھ کر چلا وہ لڑکھڑا کر گرا، کوئی دوران سر میں گرفتار، کوئی استفراغ میں مبتلا، الا ماشاء اللہ کچھ اللہ کے بندے محفوظ بھی رہے.

دن جاتے اور راستہ طے کرتے دیر کیا لگتی ہے، ابھی نواحِ جدہ میں تھے ابھی کامران کے

سامنے سے گزرنے لگے، بحرِ احمر ختم ہوا، بحرِ عرب شروع ہوا، سقوطرہ سے گزرے، باب المندب سے نکلے، عدن کو پیچھے چھوڑا، ساحل عمان بھی نظر سے غائب ہوا، بحرِ ہند کی گہرائیوں کے اوپر آ گئے لیکن وطن جوں جوں قریب آتا جارہا ہے سمندر کا تلاطم بڑھتا ہی جارہا ہے، گرمی کی شدت، برسات کی اُمس اس پر مستزاد، جسم پسینہ میں شرابور، غسل سے بھی تسکین نہیں۔

۲۷ رمئی (۱۸ رذی الحجہ) کو دوشنبہ کا دن تھا، جب سہ پہر کے وقت جدہ سے روانہ ہوئے تھے، ۳ رجون کو ایک ہفتہ پورا ہوکر دوشنبہ آ گیا، اور وطن کی آتش شوق اب تیز سے تیز تر ہوگئی، دن کے گھنٹے اور رات کی گھڑیاں اب کاٹے نہیں کٹتی ہیں، ایک ایک دن پہاڑ ہورہا ہے، بھوک اور پیاس سے حال ابتر، اس پر بھی سہ شنبہ کا دن سامان کے رکھ رکھاؤ، ٹھیک ٹھاک میں بسر ہوا، بستر بندھتے تھے اور کھلتے تھے اور پھر بندھتے تھے، بکس صندوق، سوٹ کیس بیگ، ہینڈ بیگ، بار بار بند ہوتے تھے کھلتے تھے، چہار شنبہ کو طوفانی حالت تیز ہوگئی، سمندر میں تلاطم تو تھا ہی، بارش بھی اچھی خاصی ہوگئی. جہاز پر بارش کا منظر خاصا مہیب و دہشت انگیز ہوتا ہے، کنزوردل والے بادل کی گرج، بجلی کی کڑک، ہوا کے زور، بارش کے شور، اور فضا کے اندھیرے گھپ کو دیکھ دیکھ کر سہمے جارہے تھے، اور جہاز اس فضائے تیرو تار میں دوسرے جہازوں کو اپنے وجود سے مطلع کرنے کے لئے بار بار بھیانک سیٹیاں دے رہا تھا، کسی کا دل ناخدا سے اور کسی کا خدا سے اٹکا ہوا، دلوں میں ہول واضطراب اور زبانوں پر دعا واستغفار، پورا طوفان تو نہ تھا، البتہ طوفان کا ایک ہلکا سا نمونہ ضرور دیکھنے میں آ گیا.

بیت اللہ کے زائروں کے صبر وانتظار کا آخری لطیف مجاہدہ خدا خدا کر کے ختم ہوا.....

سب کی نگاہیں شوق واشتیاق کی تصویر بنی ہوئی ساحل کی طرف جمی ہوئیں. لیجئے، اب پلیٹ فارم صاف نظر آنے لگا، اور استقبال کرنے والوں کے چہرے دکھائی دینے لگے، ہلکا ترشح ہورہا ہے، بہت سے سروں پر چھتریاں لگی ہوئی ہیں، اس وقت کی خوشی کا کیا ٹھکانا! کوئی اپنے کسی عزیز کو ڈھونڈ رہا ہے، کوئی اپنے کسی دوست کو اور جس کے کوئی دوست یا عزیز موجود نہیں، اس کے لئے اس وقت وطن کے

غیر اور بیگانے بھی کسی دوست یا عزیز سے کم نہیں! بابائے خلافت جناب شوکت علی صاحب ماشاء اللہ اپنے اس تن وتوش کے ساتھ بھلا کسی مجمع میں، کسی کے چھپائے چھپ سکتے ہیں، اپنی رنگین چمکدار عبا اور مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ رومال ہلاتے ہوئے سب سے پہلے نظر پڑے، باہم اشارے ہورہے ہیں، صاحب سلامت مبارکباد، مزاج پرسی، سارے کام ہاتھوں کی حرکت سے انجام پارہے ہیں، اور ظالم جہاز ہے کہ ایک ایک انچ کی رفتار سے سرک رہا ہے!

۷ر جون کو شب کے وقت اپنے مختصر قافلہ کے ساتھ پشاور اکسپریس سے لکھنؤ کے لئے روانگی ہوئی ..... ۹ر جون کی صبح ۶ بجے لکھنؤ اسٹیشن پہونچا، اور احباب ومخلصین کی ایک پوری جماعت کو موجود پایا تھا اور ۱۶ر جون کو پورے تین مہینے تین دن کے بعد پھر وہیں واپس پہونچا۔

(متفرقات ص: ۴۶۵، ۴۷۵)

فصل دوم

گیارہ سفر

چار دن بمبئی میں

سفر اور پھر لمبے سفر کی عادت اب ایسی چھوٹ گئی ہے کہ جب کبھی ایسا اتفاق پیش آ ہی جاتا ہے تو سب سے بڑھ کر حیرت تو اپنے ہی کو ہوتی ہے۔

غیر کیا خود مجھے حیرت مرے اسفار پہ ہے

اخیر ہفتہ اپریل میں اس طرح کا اتفاق پیش آ کر رہا۔ ادارۂ دارالمصنفین (اعظم گڈھ) کے نام نامی سے اب مسلمان پڑھے لکھوں میں کون ناواقف ہوگا؟ مولانا شبلی نعمانیؒ کے دماغ کی پیداوار مولانا سید سلیمان ندویؒ کی ساری عمر کی علمی کاوشوں کی یادگار، مسلم ثقافت کے چمن کی بہار، ظاہری و باطنی دونوں حیثیتوں سے مسلّم و شاندار۔ ۱۹۱۵ء (بلکہ شاید ۱۹۱۴ء) میں بنیادی ممبروں کی جو کمیٹی بنی تھی اس میں زندہ و باقی اب صرف یہی بدنام کنندہ نکونامے چندرہ گیا ہے اور پھر اس کے ارکان عاملہ کی جو ننھی منی مجلس ہے، اس کی صدارت کی تہمت بھی اس بے علم کے سر سالہا سال سے چلی آ رہی ہے۔ اس ادارہ کی حالت برسوں سے جوزبوں و سقیم چلی آ رہی ہے اس کی داستان خود مستقل دردناک ہے۔

بمبئی کو باب الکعبہ کہا گیا ہے، حاجیوں کی آمد و رفت کا یہ سلسلہ سال کے چھ مہینوں میں تو ضرور جاری رہتا ہے۔ تاجر عموماً اہل خیر و مہمان نواز ہیں نمازی بھی کثرت سے ہیں جیسا کہ مسجدوں کی سرسری سیاحت سے بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ محرم اور ربیع الاول میں اپنی خوش عقیدگی کا مظاہرہ بھی خوب کر لیتے ہیں۔ باہر سے واعظوں اور خطیبوں کو بلا کر انھیں خوب نذرانے دے دے کر اور مذہبی رنگ کے جلوس نکال نکال کر اور ان میں نعرے لگا لگا کر۔۔۔۔ لیکن صحیح دینداری، خدا ترسی اور احساس

عبدیت کا قحط جیسا سب کہیں ہے یہاں بھی ہے بلکہ یہ دیکھ کر بڑی ہی عبرت ہوئی جہاں ہزار ہا ہزار مکان عالیشان کئی کئی منزلے موجود ہیں۔انھیں کے پائیں میں ہزار ہا بندگان خدا ایسے بھی ہیں جنھیں سونے کے لئے ایک گوشہ اور ایک چارپائی تک نصیب نہیں عمر کی ساری راتیں سڑکوں ہی پر گزارتے رہتے ہیں اور بیچاروں کو مکان کے نام سے کوئی تنگ و تاریک کوٹھری تک نصیب نہیں۔۔۔۔خیر یہ تو بمبئی غریب کا قصور نہیں، امارت کے پہلو بہ پہلو شدید افلاس تو شاید ترقی و تمدن کا خاصہ ہے۔

دعوتیں دن کو بھی رہیں اور رات میں بھی اور کیسے کیسے پر تکلف رئیسانہ کھانے، کھانے میں آئے، لیکن الحمدللہ کہ ایک معاملہ میں میزبانوں نے اس بدمذاق مہمان کی بڑی رعایت ملحوظ رکھی یعنی دسترخوان کو بہت سے کھانوں سے باردار نہیں کر دیا۔کھانے لذیذ جتنے بھی ہوں ان میں مضائقہ نہیں لیکن یہ کیا کہ ایک ہی وقت میں ان کی پوری دکان لگا دی! دو ایک بالکل کافی ہو سکتے ہیں، زیادہ ڈھیر لگا دینے سے حرص و ہوس کو بھی تسکین نہیں ہو پاتی خواہ مخواہ طبیعت کو انتشار پیدا ہو جاتا ہے جو کھانے بھی تھے سیر ہو کر کھائے گئے اور دل سے شکر گزاری کے جذبات بھی اسی مناسبت سے پیدا ہوتے رہے۔

''مسافر خانہ'' میرے لئے مقاماتِ مقدسہ سے کم محترم نہیں، دیکھ کر دل پوری طرح بھر آیا جس جس حصہ سے میرے والدین گزرے تھے، جی میں آتا رہا کہ ان کو آنکھوں سے لگائیے اور ہو سکے تو پلکوں سے جھاڑو دے دے کر خوب دل کھول کر رو لیجئے۔اس ناشدنی نے اس وقت نہ ان کی کوئی خدمت کی نہ قدر، اب کفارہ و تلافی کی صورت ہی کیا ہو!

ایک دن ایسا ہوا کہ بمبئی کے ایک انتہائی فیشن ایبل حلقہ مالابار ہل سے گزرتے ہوئے جگمگاتی ہوئی کوٹھیوں کے درمیان ایک ویرانہ پر گزر ہوا۔ایک چھوٹا سا ٹکڑا زمین کا ایسا نظر پڑا جس پر کبھی کوئی عمارت رہی ہوگی۔رہبر نے بتایا کہ یہ جیجیبھائی ہاؤس تھا یعنی وہ محل جس میں بیگم صاحبہ مع اپنی دو بہنوں زہرا فیضی اور عطیہ فیضی کے ساتھ رہتی تھیں اب کیا تھا کہ شبلی کے اس پرستار کے سامنے نفاستِ مجسم عطیہ فیضی اور ان کی ساری لطافتوں، نفاستوں اور نزاکتوں کا کیسا نقشہ پھر گیا۔مکان کیسا پُر

رونق، دلکش اور سجا سجایا ہوگا اور اپنے اس انجام سے بالکل بے خبر. ابھی تصور کو اس تذکر و تفکر سے فراغت نہیں ہوئی تھی کہ ایک دوسرا پلاٹ بہت بڑا نظر کے سامنے آ گیا، سرتا سر کھنڈر، ملبہ پر ملبہ اور رہبر نے جو بتایا اسے سننے کے کے لئے دل کسی طرح تیار نہ تھا، ہاتف غیب کے بجائے رہبر کی زبان سے نکلا ''نظام حیدر آباد کا محل'' یقین آئے یا نہ آئے بہر حال یقین کرنا ہی تھا، نظام عالی مقام جو رئیسوں کے رئیس اور امیر الامراء تھے محض ہز ہائی نس (اعلی حضرت) نہیں ہز اگز لینڈ ہائی نس (اعلی ترین حضرت) تھے جن کا شمار ہندوستان اور ایشیا ہی کے نہیں بلکہ دنیا کے متمول ترین انسانوں میں تھا! پھر سو برس بھی تو نہیں ہوئے سقوط مملکت ۱۹۴۸ میں ہوا. پورے ۲۴ برس کی مدت ہوئی. انقلاب حال اور اس درجہ تیزی کے ساتھ عبرت کے ذخیرہ میں اپنی مثال آپ ہے.

عبرت بولی کہ ہوش میں آؤ اے حریصان مال و شوکت وجاہ
مٹ گیا نقش حامد ومحمود رہ گیا لا ا لٰہ ا لا ا للہ

(۲۸.۱۸.۱۶.۸)

بہار کی بہار

فاضل گرامی مولانا مناظر احسن گیلانی کے وطن کو دیکھنے اور وہیں جا کر ان سے ملنے کی تمنا سالہا سال سے تھی. نوبت خدا خدا کر کے اب ۴ر جولائی کو آئی اور ساڑھے تین دن کا وقت کسی طرح اس آمد و رفت کے لئے نکل سکا. گیلانی ایک چھوٹا سا موضع ضلع پٹنہ میں ہے شہر سے کوئی ۶۰ میل دور ضلع مونگیر کی سرحد ریلوے لائن سے بہت دور. رفیق سفر مولانا عبدالباری ندوی (صاحب جامع المجددین) تھے گویا

مؤمن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

نیز عزیزی محمد ہاشم قدوائی ایم اے (لکچرر، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) سلمہ۔۔۔۔اذا رسلنا الیھم اثنین .....فعززنا بثالث .

مختصر سے قافلہ کی پہلی منزل خاص پٹنہ تھی گھنٹہ پون گھنٹہ کا وقت بعض مریضوں کی عیادت

کے سلسلہ میں اسپتال میں گزرا،لق ودق اسپتال کی خوش منظری کا کیا کہنا۔نیچے دریا گنگا برسات کے موسم میں خوب چڑھا ہوا،اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ موجزن،حدنظر تک وہی نظارہ،اسپتال کی چھت پر سے دیکھئے تو دریا پر سمندر کا گمان گزرنے لگے،اور پٹنہ بمبئی نظر آنے لگے۔۔۔کسی طبیب کی خوش جمالی سے متأثر ہوکر سنا ہے کبھی کسی شاعر نے کہا تھا

خوش طبیب ست بیا تا ہمہ بیمار شوند

اس اسپتال کی خوش سوادی سے متأثر ہوکر عجب نہیں جو بہت سے تندرستوں کے دل یہ تمنا پیدا کرنے لگیں کاش بیمار ہی ہوکر ہمیں اس چھت سے یہ نظارہ کرنے کو ملے۔

گیلانی خاص کا کیا کہنا،سکون خاطر کی جنت،باغ،مکان،مسجد سب ہی مثالی جگہیں اور مکین کی جاذبیت نورٌعلیٰ نور،اس کی قوت اسی سے ظاہر ہے کہ وہی تو اتنے طویل سفر کی محرک ہوئی۔ کھلانے پلانے مہمانی کے ہر جزو میں سلیقہ واعتدال ملحوظ۔۔۔لیکن گیلانی تک رسائی آسان نہیں وہ بھی اس برسات کے موسم میں،لاریاں عموماً کھچا کھچ بھری ہوئی اور میلوں تک چند فٹ چوڑی سڑک کے اِدھر اُدھر دونوں طرف برساتی پانی،گویا مسلسل جھیل،لاری والے سے ذرا بھی لغزش ہو تو پوری لاری کھڈ کے اندر تشریف لے جائے۔واپسی کا سفر انھیں لاریوں کی بدولت کچھ خوش گوار نہ گزرا ۔۔۔بہار میں خزاں کے کچھ جھونکے!اور راستہ میں گیلانی سے قریب دور سے مولانا سید سلیمان ندوی کے وطن موضع دیسنہ کا نظارہ بھی کچھ کم دلخراش ودردانگیز نہ تھا۔

(س:۳۳،۳۴،۳۱)

ڈھائی دن بہار میں

نمونۂ سفرِ آخرت

ریل کے بڑے جنکشن ایک چھوٹے سے پیمانہ پر کارنامہ قدرت کا نمونہ ہوتے ہیں وہ ان کی ہمہ وقتی چہل پہل،قلیوں کی دوڑ دھوپ،مسافروں کی بھیڑ بھاڑ،سودے والوں کی چیخ وپکار،

صاحبان کی ڈانٹ ڈپٹ اِدھر یہ گاڑی آئی، اُدھر اس انجن نے سیٹی دی، ادھر اس کرانچی میں مال لدرہا ہے، ادھر وہ ڈبہ دم کے دم میں مسافروں سے خالی ہوگیا، ابھی یہ پلیٹ فارم کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، کان پڑے آواز نہیں سنائی دیتی تھی اور ابھی ایک دم سے سناٹا چھا گیا، کتنے بچھڑے ہوئے آناً فاناً مل گئے اور کتنے ساتھ آن کی آن میں چھوٹ گئے! ایک شان جامع المتضادین کی ایک شان فارق المجتمعین کی! انسان اگر دل رکھتا ہو تو کتنی بصیرتیں ہر بڑے جنکشن سے حاصل کرسکتا ہے، کتنی تجلیات سے اپنے دیدہ ودل کو منور کرسکتا ہے! اور مغلسرائے سے بڑا جنکشن ملک میں کون ہوگا. زندگی کی نیرنگیوں کائنات کی بوقلمونیوں عمر کے اتار چڑھاؤ جوانی کی بے وفائیوں کا سارا نقشہ بہ یک وقت اس آئینہ میں موجود!

مزار گیلانی پر حاضری

راستہ میں بے پناہ وناگہاں بارش کے مزے اٹھاتا ہوا ۴ بجے سڑک پر پہونچ گیا جہاں موٹر چار گھنٹہ قبل چھوڑ گیا تھا حضرت گیلانی کے چھوٹے بھائی سید مکارم احسن خوب مستعدی کے ساتھ یہیں مل گئے اور ان کی رہنمائی میں صبا رفتار موٹر نے بات کہتے گیلانی کے لب سڑک پر قبرستان پہونچادیا.

''قبرستان'' جی ہاں! نہ کوئی گنبد! نہ کوئی مقبرہ نہ کوئی حجرہ نہ کوئی چبوترہ، نہ اونچی پکی قبروں کی قطار، نہ کوئی در ودیوار، ایک بڑے طویل وعریض باغ میں خاندان والوں کی دو ایک کچی تربتیں بس یہ کل کائنات اس گورستان کی! سڑک سے چند منٹ کے فاصلہ پر کھلے ہوئے آسمان کے نیچے مولانا کا مزارِ پُر انوار.....یعنی مٹی کا ایک ڈھیر، جس کے نیچے جسد خاکی اس مردِ مؤمن کا دائمی آرام گاہ ہے جو وقت کا زبردست فاضل معقول ومنقول کا جامع، شریعت وطریقت دونوں کا رازداں، ایک بہترین خطیب اہل قلم بیدار دل روشن دماغ، مؤرخ، محقق، شاعر، عارف سب ہی کچھ تھا اور ابھی کل تک جیتا جاگتا اور دوسروں کے دلوں کو زندہ رکھے ہوئے تھا!۔۔۔۔دن گزرتے کیا دیر لگتی ہے ابھی پانچ سال ادھر کی بات ہے یہی برسات کا موسم تھا کہ جولائی ۱۹۵۲ء میں مولانا اسی باغ میں اپنے

اس نیازمند کو سیر کرانے لائے تھے. اس کے دریافت کرنے پر اپنے والد مرحوم کی قبر بتائی تھی، آج اسی کے مزار پر ایک گرفتار قید عنصری کی حاضری تھی، بارش مسلسل جاری تھی. اس پر ہٹنے کو جی نہیں چاہتا تھا، جو کشش جو جاذبیت جو محویت زندگی میں تھی اس کا ظہور اس وقت بھی ہو رہا تھا. زیر لب نیم مضطر حالت میں جو دعائیں التجائیں مخاطبے ہوئے وہ سب اب کہاں یاد! اتنا یاد ہے کہ آنسوؤں کے تار کے ساتھ ساتھ کچھ اس قسم کی صدائیں زیر لب وزبان ٹکراتی رہیں

''دلوں کے دیکھنے والے اور سینوں کے اندر کی خبر رکھنے والے! اپنے دین کے اس دیوانے کو اپنی بہترین نعمتوں اور بخششوں سے سرفراز فرما. اس نے اٹھتے بیٹھتے اپنے کو تیرے دین اور ترے پیمبر کی عزت وناموس کے لئے وقف کر رکھا تو اسے وہ صلہ دے جو اس کے خیال میں بھی نہ آیا ہو. بال بال اسے اپنی رحمتوں اور سرفرازیوں سے نواز دے! اور اس نیک اور پاک روح کے طفیل میں ہم لوگوں کا بھی بیڑا پار کر دے جو جو اس کی محبت کا دم بھرتے تھے. بداں رابہ نیکاں بہ بخشد کریم، بڑے بڑے عارفوں کا مقولہ ہے کرم میں کون تیرا مقابلہ کر سکتا ہے اور تو اپنے عارفوں کی بات سچ ہی کر دکھاتا ہے''

مزار سے اٹھ کر مکان پر آئے چند ہی قدم کا تو فاصلہ تھا. وہ کمرہ دیکھا جہاں مولانا کا پلنگ بچھا رہتا تھا سید مکارم سلمہ نے ہر چیز حتی الامکان اسی طرح رہنے دی ہے جیسے مولانا کے حیات میں تھی، چائے پلوائی، پانی میں شرابور کپڑے آگ میں جلد جلد خشک کرا دیئے، باتیں زیادہ مولانا ہی کرتے رہے. اس سب کے باوجود کچھ زیادہ جی نہ لگا، طبیعت پر وحشت ہی غالب رہی. مکان بغیر مکین کے لطف ہی کیا رکھتا ہے. بلبل خوش نوا اڑ چکا تھا اور خالی پنجرہ میں اب کیا رکھا تھا! جی لگنے کی جگہ تو اب تو وہی کچی مٹی کی ڈھیر رہ گئی تھی اس پختہ مکان میں اب کیا تھا؟

(ص:۴۱، ۵۵، ۵۶، ۵۷)

حیدرآباد

غریب خانہ

۲۷ر کو عشاء کا وقت ہو چکا تھا کہ بمبئی میل بھوپال اسٹیشن میں داخل ہوا پلیٹ فارم پر خان صاحب مع اپنے خدم وحشم کے نظر پڑ گئے۔ ہاتھوں ہاتھ سامان اترا وایک بڑی سی جیب گاڑی پر بٹھا، بات کی بات میں اپنے غریب خانہ پہنچادیا غریب خانہ کے نام سے تخیل کیا ذہن میں آتا ہے؟ یہی نہ کہ تنگ سا ایک آدھ حجرہ، پست سا برآمدہ، دروازے نیچے، انگنائی چھوٹی، زمین میں سیلن، بشری ضرورتوں کی جگہیں تاریک اور غلیظ اور عجب نہیں کہ جائے وقوع ایسی گلی درگلی ہو کہ وہاں تک سواری پہنچنا دشوار۔ غرض یہ کہ وہاں کا قیام درویشوں اور زاہدوں کے لئے کیسی ہی ایک نعمت ہو، لیکن ہم تن پروروں کے لئے خود ایک مجاہدہ، تخیلات کچھ اسی قسم کے تھے، کہ جیب کار کھٹ سے عین دروازے کے سامنے آرُکی اور اب جو اتر کر دیکھا تو ''غریب خانہ'' کے در و دیوار تک بجلی کی روشنی سے جھلا جھل، خاصہ صحن، خاصہ برآمدہ، خاصہ کمرہ، پُر تکلف اُجلا برف فرش، بستر مکلف گدّے دار، تخت وسیع جانماز وسوزنی سے لیس، حمام اور فلش والے بیت الخلا تک جگ مگ کرتے ہوئے چپل چٹی، پانی، تولیا، صابن ضرورت کی چھوٹی بڑی ہر چیز سے آراستہ پورا مکان، صفائی کے لحاظ سے آئینہ اور سلیقہ مندی کے لحاظ سے مکین کے حسن انتظام کا آئینہ دار!

گویا جہاں تک مہمان کی راحت رسانی کی جزئیات کا تعلق ہے، یہ ندوی و مصری فاضل اگر سمت علوی کی طرف جایئے تو حکیم الامت تھانویؒ کے مدرسہ میں پڑھے ہوئے، اگر نظر سمت سفلی تک محدود رکھئے، تو یوں کہیے کہ کسی اعلیٰ ہوٹل والے کے یہاں تربیت پائے ہوئے، تخیل اور واقعہ میں یہ زمین آسمان کی نسبت دیکھ زبان سے اور کچھ تو نہ نکلا، سوائے حیرت کے لہجہ میں دہرائے ہوئے اس فقرہ کے کہ ''یہی غریب خانہ'' ہے! اور دل یہ کہہ کر رہ گیا کہ تواضع وانکسار کے سیاق میں کیسے کیسے ثقہ حضرات تک بھی شاعری سے نہیں چوکتے!

(ص:۷۷،۷۸)

بہادر سَر دار

دکن پہنچتے ہی پہلا پروگرام ان مرحوم مخلصوں، محسنوں، بزرگوں، عزیزوں رفیقوں کی خاکی آرام گاہوں پر حاضری کا تھا، اور سب سے پہلا قدم جو اس سلسلے میں اٹھا وہ بہادر یار جنگؒ کے مزار کی طرف! کیا شخصیت تھی، اور کیا شخص تھا۔ اب ناواقفوں کو کیا بتایا جائے۔ اور جو واقف ہیں انھیں کسی تعارف کی ضرورت نہیں۔ دین وملت کے لئے ساری زندگی وقف کیے ہوئے اور پھر جوش کے ساتھ ہوش کا غیر معمولی وعدیم النظیر اجتماع! حیدرآباد کی مسلم اور نیم اسلامی سلطنت کا وجود ہی مشیت ربانی کو منظور نہ تھا کہ ایسے کلّے ٹھلے کے توانا وتندرست کو یک بیک ایسے سن میں اٹھالیا، جب کہ کہنا چاہیے کہ وہ جوان ہی تھے ورنہ اس افراتفری اور اس ہولناک بربادی کی نوبت ہی کیوں آنے پاتی! بہرحال ایک نیم رہنما کی رہبری میں بڑی مسافت طے کر، اس حظیرہ تک رسائی ہوئی جس کے اندر اس شہید حق پرستی کا جسد خاکی آسودہ ہے۔ دروازہ مقفل تھا، اس لئے صرف جالیوں سے اندر کا کچھ نظارہ ہوسکا۔ قلب نے لطافت وحلاوت کے ساتھ ساتھ شاہانہ وقار وہیبت کی بھی کیفیت محسوس کی۔ فاتحہ پڑھا اور فاتحہ کیا پڑھا، یہ کہیے کہ درد دل کی کچھ تھوڑی سی داستان دہرادی، عرض ومعروض عالم تخیل میں کچھ اس قسم کی رہی۔

''بہادر سَر دار! عین ایسے نازک وقت اپنی خستہ قوم وملت کو بے سہارا چھوڑ کر کہاں چلے گئے یہی تو خاص وقت مخلصانہ، حکیمانہ، دلیرانہ رہنمائی کا تھا۔ ہمارا حقیقی رہنما تو وہ تھا جو ہمیں سبق جنگ بدر اور صلح حدیبیہ دونوں کے دے گیا۔ تم اس ہادیٔ بے خطا کے نقش قدم پر چلنا، اپنے لئے مایۂ افتخار سمجھے ہوئے تھے۔ تم ہوتے تو اپنی مؤمنانہ فراست سے ادھر حیدرآباد کو سنبھالے رہتے، اور اُدھر مسلم لیگ کے بھی بہترین مشیر ہونے کی حیثیت سے پاکستان کو بھی ابتری کی راہ پر نہ پڑنے دیتے، لیکن خدائے بے نیاز سے کس کو مجالِ گلہ وشکوہ کہ عین وقت پر تمہیں کو اٹھالیا! اپنی ملت کی پستی وذلت کو یقیناً وہاں بھی نہ بھولے

ہوگے، خون کے آنسو اس کے حال زار پر بہار ہے ہوگے. اور جنت برزخ
کی ساری نعمتوں، راحتوں، لذتوں کے باوجود یہ کانٹا دل میں برابر کھٹک ہی
رہا ہوگا"

مرحوم کی خوش روئی اور خوش خوئی کی تصویر دیر تک نظر کے سامنے رہی۔

(ص:۸۳،۸۴)

ہزاروں اٹھ گئے، رونق.....

فاضل گیلانی مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کا مزار یہاں نہیں. ان کے وطن موضع گیلانی (بہار) میں ہے.....ان کے بغیر شہر کچھ ویران سا نظر آیا. حالانکہ یہ بھی نفس کا دھوکہ ہے اللہ کی آبادی کہیں کسی کے اُٹھ جانے سے ویران ہوتی ہے! ع

ہزاروں اٹھ گئے، رونق وہی باقی ہے محفل کی

ایک جاتا تو دو اس کی جگہ آجاتے ہیں. نظام تکوینی یوں ہی بھرا پُرا چلا آرہا ہے. اور دنیا اپنے رب جلیل وقدیر کے امر عظیم کی تعمیل میں خاموشی کے ساتھ یوں ہی چلاتی، مارتی، پیدا کرتی، فنا کرتی، اٹھاتی، گراتی، پست کو بلند، بلند کو پست کرتی، ہنساتی، رُلاتی، بڑھاتی، گھٹاتی، مٹاتی، دفناتی، بناتی، بگاڑتی، اچھالتی، چلی آرہی ہے بہ قول حکیم عارف اکبرالہ آبادیؒ ۔

دنیا یوں ہی ناشادیوں میں شاد رہے گی
برباد کئے جائے گی آباد رہے گی

(ص:۸۷)

مولانا دریابادیؒ کا ایک معقول تبصرہ

اسلام کے سپاہیوں کو تو داخلی اور خارجی دونوں محاذوں پر اپنی زندگی کا ثبوت دینا ہے، قلب میں جلا پیدا کر کے اندر کی روحانیت ونورانیت کو بیدار کرنا، کام جماعت تبلیغی کا ہے. دماغ کو مغربی اور غیر اسلامی فتنہ وفسوں کے حملہ سے محفوظ کر دینا اور تاریخ وجغرافیہ، معاشیات، فلسفہ، نفسیات،

طبعیات وغیرہ پڑھ چکنے کے بعد بھی شہادتِ توحید ورسالت پر قدم جمائے رکھنا، یہ دائرہ عمل جماعت اسلامی ہند کا ہے، جس پر شاہد عادل اس کی لکھائی ہوئی درسی کتابیں ہیں۔

(ص:۱۰۴)

جدائی کا منظر

جدائی اور رخصتی کا منظر بھی کتنا مؤثر ہوتا ہے غم انگیز مگر لذیذ، تلخ مگر مٹھاس لئے ہوئے! گاڑی چلی تو عالم ناسوت سے آخری رخصت کا منظر سامنے آ گیا۔ اور کسی فارسی گو شاعر کے یہ دو شعر بھی لوح حافظہ پر چمک اٹھے۔

یاد داری کہ وقت زادن تو ہمہ خنداں بدند تو گریاں

آں چناں زی کہ وقت مُردن تو ہمہ گریاں بدند تو خنداں

(اے بندے! کچھ یاد ہے کہ جب تو پیدا ہوا تو سب کے چہروں پر خوشی کی ہنسی تھی اور ایک تو رو رہا تھا۔ اب زندگی یوں گزار اور دنیا میں یوں بسر کر کہ جب دنیا سے اٹھنے کا وقت آئے تو سب رو رہے ہوں اور ایک تو خوش ہو، مگن ہو کہ واپسی اپنے اصلی وطن کو اور حاضری اپنے مولا کے دربار میں ہو رہی ہے!)

(ص:۱۴۰۰)

دہلی

صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین

گورنری سے ترقی پا کر اس منصب عالی پر آنے کے بعد انھیں حق تھا کہ اپنے لئے کوٹھی بھی ویسی طلب کریں جو اپنی آرائشوں کے لحاظ سے ایوان صدارت سے کچھ ہی کم ہوتی لیکن ان کی سادہ مزاجی اور قناعت پسندی نے صدر کیا معنیٰ وزیر اعظم کی ٹکر کی بھی طلب نہ کی اور جو جگہ بھی رہنے کو مل گئی، بس اسی پر ہنسی خوشی گزر شروع کر دیا۔۔۔ شرافت اور وضع داری ان کا امتیازی جوہر ہے اور اسلام

دوستوں کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ ان کی مذہبیت کا سکہ اونچے حلقوں میں دلوں پر بیٹھا ہوا ہے. چنانچہ یہ روایت معتبر ذرائع سے سننے میں آئی کہ کسی اونچے سرکاری ڈنر کے موقع پر محض اتفاق سے ایک ایسے افسر کے پاس سے گزرے جو مصروف نائے ونوش تھے تو وہ معاً تعظیم کے لئے کھڑے تو ہو گئے مگر اس ہاتھ میں گلاس تھا اسے پیچھے کر کے! ایک لطیفہ بھی سن لیجئے اب کی ملاقات میں ڈاکٹر تاراچند نے اپنی بڑی محنت سے ایڈٹ کی ہوئی ایک ضخیم فارسی کتاب دکھائی یہ ہندوؤں کی مشہور کتاب اپنشا دکا فارسی ترجمہ داراشکوہ کا کروایا ہوا ہے کتاب قابل داد ہے اس کی شکل دیکھ کر دل للچا کر رہ گیا. کتاب چھپی ہوئی ایران کی ہے. ہندوستان میں اس کے ملنے کی کوئی صورت ہی نہ تھی میں نے اس کا ذکر میزبان سے محض ضمناً کر دیا اور اپنے اشتیاق کا قصداً مطلق ذکر نہ کیا یہ بات آئی گئی ہوگئی تیسرے دن جب میں چلنے لگا تو عین رخصت کے وقت موصوف یک بیک بولے کہ "ایک کتاب آپ کی نذر کرنا چاہتا ہوں. ڈاکٹر تاراچند کی اُپنشا دمیرے پاس اس کا ایک نسخہ خالی ہے" میں دنگ رہ گیا کہ اپنے اشتیاق کا تو میں نے ان سے کچھ ذکر بھی نہ کیا تھا انھیں اس کا علم کیسے ہو گیا، بس زبان سے صرف اتنا کہہ سکا، کہ "اچھا اب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو کشف صدور بھی ہونے لگا ہے"

(ص:۱۶۵)

کلکتہ

کلکتہ مادی آنکھوں میں شہر کا شہر پورا دلہن کی طرح بناؤ سنگھار سے آراستہ گل وگلزار بنا ہوا ہے. دن تو دن رات کا بھی بڑا حصہ دن ہی بنا ہوا بلوں، مشینوں، انجنوں، کارخانوں کی ہر وقت چیخ وپکار باشندوں کی بھاگ دوڑ کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس شہر کو سکون کبھی بھی نصیب ہوتا ہے. مادی رونق اور چہل پہل کے اعتبار سے کم کس حصہ کو کہئے اور زیادہ کس کو. اور چورنگی کا تو خیر پوچھنا ہی کیا. معلوم ہوتا ہے کہ تمدن جدید کی ساری بہار اور مزہ داری کا عطر کھینچ کر اتنے سے خطۂ زمین میں آ گیا ہے!۔۔۔۔ خیال پھرتے پھراتے بار بار یہ آتا تھا کہ زندگی کے اتنے شدید ہیجان میں کبھی موت کا بھی گزر ہوتا ہے. بیشمار موٹروں، بسوں، ٹرامکاروں کے درمیان کبھی کوئی جنازہ گزرتے نہ دیکھا،

اتفاق سے ایک شام کو بعد مغرب ایسے حصہ سے گزر ہوا، جہاں مسلمانوں کا قبرستان تھا، موٹر کسی اور ضرورت سے رُکا، دل بے اختیار چاہا کہ اُتر کر قبرستان کے اندر چلئے اور فانی زندگی کی جلوہ آرائیوں سے کچھ دیر کے لئے تو صرف نظر کر کے ان مستقل شہر خموشاں والوں کی خدمت میں حاضری دیجئے ۔۔۔۔ ''زندہ'' کو ''مردہ'' ہوتے، چلتے پھرتے جسم کو سطح زمین سے زیر زمین منتقل ہو جاتے، ناسوت سے عالم برزخ میں قدم رکھتے کچھ بھی دیر لگتی ہے؟ اور کسی کو کیا خبر کہ فاتحہ پڑھنے والا کس گھڑی، کس لمحہ، خود ہی فاتحہ کا محتاج ہو جائے ۔۔۔۔ وقت میں اتنی گنجائش تو نہ نکل سکی۔ احاطہ گورستان سے باہر ہی بیٹھے بیٹھے سب کے لئے دعائے مغفرت کر دی۔ اور دیر تک تصور یہ بندھا رہا کہ اس ڈھیر میں کیسے کیسے خاصان خدا کیسے کیسے مقبولین و مجاہدین بھی ہوں گے، دنیا میں کس طرح بسر کی ہوگی، یوں رہے ہوں گے وہاں رہے ہوں گے اور آج پیمبروں کے وعدوں کی تصدیق کان سے نہیں، آنکھ سے کر رہے ہوں گے!

(ص:۲۰۹)

لاہور

سالک صاحب

لاہور آ کر اگر کوئی سالک صاحب سے نہ ملا تو وہ گویا ہندوستان آ کر تاج محل آگرہ کی زیارت سے محروم رہا! بقول شخصے

جسے تو نہ ملا اسے کچھ نہ ملا

اور ان سے اگر مل لیا تو سمجھیے کہ پھر کسی صحافی سے ملنے جلنے کی ضرورت ہی نہ رہی، اپنی ذات واحد سے صحافت لاہور کے مرکز و مرجع بنے ہوئے اور گویا اس میکدہ کے مسلم پیر مغاں!

تیرے ابہام پر ہوتی ہے تصدق توضیح
تیرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

لاہور جو صحافیوں کا ایک مستقل اکھاڑا بھی ہے اس پہلوان نے اسے گرایا اور کل اس کے پٹھے نے اسے پچھاڑا، ایسے غدار شہر میں کسی کی استادی پر سب کا متفق ہو جانا بڑے نصیبے کی بات!

مزاج و خوش طبعی کے ڈانڈے کچھ نہ پوچھیے کہ کیسے دبے پاؤں تفضیح و تضحیک سے مل جاتے ہیں اور اچھا خاصا بھلا آدمی ادھر ذرا چوکا ادھر ظریف سے مسخرہ اور بذلہ سنج سے بھانڈ بن گیا! سالک علم مجلس کے ماہران نزاکتوں کے مزاج شناس، صحیح معنی میں ظریف و بذلہ سنج۔ برجستگی بدیہہ گوئی، ادبیت شوخی ان میں شروع ہی سے رہی تھی، عمر و تجربہ کی پختگی اور بالغ نظری نے ان کی شخصیت میں اب اور چار چاند لگا دیئے ہیں۔۔۔۔ اکبر کی حکیمانہ ظرافت کی جھلک کوئی آج دیکھنا چاہے اور ان کی عارفانہ نکتہ رسی اور بذلہ سنجی کا نچوڑ اگر آج آنکھوں کے سامنے لانا چاہے تو کسی حد تک ضرور سالک صاحب اس کو پورا کر سکتے ہیں۔

سالک صاحب اب صحافی تو برائے نام ہی سے رہ گئے ہیں البتہ ایک رہنمائے صحافت کی حیثیت سے سرگرم ہیں۔۔۔۔ پہلوان جب سن سے اتر جاتا ہے تو خود کشتی کا زور دکھانے کے بجائے بہتوں کو داؤ پیچ سکھاتا رہتا ہے۔۔۔۔ اور اب وہ مصنف، و کتاب ساز بھی ہیں لاہور جا کر اگر کسی کو اسلامی لاہور کے ماضی و حال کے مالہ و ماعلیہ سے واقف ہونے کا شوق ہے اور اسے رہنما صرف ایک ہاتھ آنا ممکن ہو تو بلا تامل چاہیے کہ وہ رُخ سالک ہی صاحب کی طرف کرے۔

کہ سالک بے خبر نہ بود ز راہ و رسم منزلہا

(ص: ۲۷۵، ۲۷۶)

دعوت شیراز کا نمونہ

قال و حال کے درمیان ربط و توافق تو کمتر ہی ہستیوں کے حصہ میں آتا ہے۔ دنیا نام ہی اس کا ہے کہ تعلیم کچھ ہو اور عمل کچھ، شورش صاحب کے دستر خوان، جی نہیں دستر خوان کہاں، کھانے کی میز نے اس باب میں ریکارڈ قائم کر دیا۔ یہ کیسے ممکن نہ تھا کہ اس مسافر کی وہ مسافر نوازی نہ فرماتے، پچھلے تجربہ کی بنا پر عرض کیا گیا کہ خدا کے لئے اب کی ان تکلفات سے کام نہ لیجیے گا ارشاد ہوا کہ نہیں

اب کی بالکل سادگی رہے گی ،صرف ایک قسم کا کھانا پیش کیا جائے گا۔۔۔۔دعوت ہوئی چٹان کے بھولے بھالے ناظرین اس خیال میں ہوں گے کہ بس ماحضر پیش کر دیا ہوگا۔سادگی کے لحاظ سے دعوت شیراز کا نمونہ!

نفس کھانے سے قبل اس کا ایک مستقل ابتدائیہ تھا اور کھانے کے بعد اس کا ایک طویل اختتامیہ! خشک وتر میووں کی شکل میں لذیذ ونفیس پھلوں کی صورت میں، نمکین بھنے ہوئے مغزیات اور لطیف وشیریں لوزیات کے روپ میں!۔۔۔۔دعوت کے یہ تکلفات کھانوں کے یہ تنوعات ہر رئیس کے حصہ میں نہیں آتے کسی رئیس اعظم ہی کے حصہ کی چیز ہیں!

کھانے کی میز پر جب رسائی ہوئی تو رزاق مطلق کی نعمتوں اور بخششوں کا ایک پورا میوزیم (ندرت خانہ) سجا سجایا نظر آیا۔مرغ کا قورمہ اور مرغ کی بریانی، مرغ مسلم اور طرح طرح کے کباب مچھلی اور انڈے کے طرح طرح کے سالن اور اب یاد نہیں کہ اور کیا کیا۔۔۔۔آج کا دن شہر میں بکری کا گوشت نہ ملنے کا تھا اس کا کیا خوب توڑ سوشلزم کے اس ذہین مبلغ نے سوچ لیا اور سادگی اور کفایت کی کیا چوررا ہیں اس سرمایہ شکن وسرمایہ بیزار نے نکال لیں!

تلافی کی بھی تو ظالم نے تو کیا کی!

حکومت نے بکری کے ذبیحہ پر پابندی یقیناً اس لئے عائد کی ہے کہ شاہ خرچ میزبانوں نے بکروں کو اس طرح بے دریغ کاٹنا شروع کر دیا تھا کہ اس سے نسل کے خاتمہ کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے، لیکن کہیں میرے شیر نے دس بیس دعوتیں اور اسی پیمانہ پر کر ڈالیں .....تو ذرا عجب نہ ہوگا کہ حکومت کو مرغ کے نسل کے بھی تحفظ کی فکر ایسی ہی لاحق ہو جائے!

(ص:۲۷۷،۲۷۸)

فصل سوم

ڈھائی ہفتہ پاکستان میں

واقعات وارادات

سفر بالکل تنہا کرنا نہ تھا شریک حیات، شریکِ سفر بھی ہو رہی تھیں اور سیر پاکستان کی مجھ سے بڑھ کر حریص وآرزومند. اپریل کی پہلی اور شعبان کی ساتویں تھی کہ بعد نماز جمعہ سہ پہر ٹرین سے لکھنؤ سے امرتسر کے لئے روانگی ہوئی. وہی ٹرین جو تقسیم ملک سے قبل سیدھی لاہور جاتی تھی اور کلکتہ پنجاب میل کہلاتی تھی ۔۔۔۔ پلیٹ فارم پر عزیزوں، دوستوں، مخلصوں، رخصت کرنے والوں اور والیوں کا وہ ہجوم کہ جیسے پاکستان نہیں حج وزیارت کو روانہ ہو رہا ہوں. اور سفر جیسے دو ڈھائی ہفتہ کے بجائے برسوں کا ہے!۔۔۔۔ رخصتی کا منظر پُر اثر ہوتا ہے اور قلب اگر حساس ہو تو پُر حسرت اور دردناک بھی سفر آخرت کے منظر سے کتنا مشابہ! عزیزوں، دوستوں کا ہجوم ساتھ آتا ہے اور میت کو اسی طرح قبر کے سپرد کر کے چلا جاتا ہے!

گاڑی چلی اور دماغ کے تصور خانے میں پاکستان کے اگلے پچھلے نقشے پھرنے لگے ترجمان حقیقت اقبال نے کس شوق اور چاؤ کے ساتھ اس ''اسلامی'' مملکت کی تحریک دلوں میں قائم کرائی تھی. ہزار ہا مخلص جانبازوں نے کس دردمندی سے اس آواز پر لبیک کہی تھی. کیا کیا آرزوئیں تھیں اور کیسے کیسے منصوبے اور اب اس شیریں وخوشگوار خواب کی تعبیر کیا نکل رہی ہے! اُمت نے اس کے پیچھے کیا کچھ کھودیا، اس کے نام پر کیا کیا لٹایا. اور اب اسے حاصل کر کے کیا کیا پایا! نفع ونقصان کی میزان کیا رہی! سودا مہنگا پڑا یا سستا!۔۔۔۔ شام ہوئی، رات کا اندھیرا چھایا، خیالات کی یہ رو جاری تھی. کچھ سوتے اور کچھ جاگتے کہ پچھلی رات میں گاڑی یوپی کے حدود طے کر کے سرحد پنجاب میں

داخل ہوگئی اور پھر صبح ہونے لگی!

(ص:۱۳تا۱۵)

مسافر نوازیاں

امرت سر اسٹیشن بات کی بات میں آ گیا۔۔۔۔وہی امرتسر مرحوم جو کبھی مسلمانوں کا تھا جو ابھی کل تک اسلامیت کا مرکز تھا۔مسجدوں اور دینی درسگاہوں کا شہر تھا کیسے کیسے عالم دین اور شیخ طریقت یہاں رہتے تھے..... کیسے کیسے اہل حق اسی خاک سے اٹھے اور اسی میں ملے! حافظہ نے بچپن کا ایک ورق کھولا تو اس میں وکیل اور اس کے دوسرے مطبوعات کے نقش کیسے اُبھرے نظر آئے! غرض یہ کہ کتنی خوشگوار اور روح پرور یادیں اس شہر سے وابستہ تھیں، وہ اب صرف اس کے ماضی سے وابستہ ہوکر رہ گئی ہیں! دم بھر میں یہ سارا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔سواد شہر جس وقت بھی ریل سے نظر آنا شروع ہوا، اسی لمحہ حسرتوں کا یہ باب بھی دماغ کے کتب خانہ میں کھل گیا۔

امرتسر سے لاہور کا فاصلہ ہی کیا ہے۔میل ٹرین کے لئے اتنی مسافت گھنٹوں کی نہیں منٹوں کے طے کرنے کی ہے.....گاڑی نے تھوڑی ہی دیر میں اٹاری پہنچا دیا۔یہ ہندوستان کا سرحدی اسٹیشن ہے۔یہاں حکم ہے کہ چھوٹے بڑے مسافر مع اپنے چھوٹے سے چھوٹے سامان کے اُتریں اور کچھ دور چل کر اپنے پاسپورٹ دکھائیں۔اپنے سامان کا جائزہ کرائیں اور پھر سے گاڑی میں سوار ہو جائیں!۔۔۔۔حاجیوں کو ایک زمانہ میں جزیرہ کامران میں قرنطیوں کی شدید تکلیف دہ منزل سے گزرنا ہوتا تھا۔بس اسی کا نمونہ!

یہاں پہلا پہل تجربہ آپ کو قلی راج کا ہوگا۔پنجاب کے ہیکڑ اور اکھڑ قلی جو کچھ چاہیں گے آپ سے مطالبہ کریں گے اور وہی لے کر رہیں گے۔آپ ان کے سامنے اپنے کو بے بس پائیں گے۔ داد و فریاد کی کوئی شنوائی نہ ہوگی۔پولیس دیکھنے میں بہت سی کھڑی ملے گی لیکن مدد آپ کو نہ پولیس سے ملے گی نہ اسٹیشن اسٹاف سے!.....کوئی چارہ اس کے نہیں کہ یا تو ہجوم میں گھس کر دھکے کھائیے اور یا پھر صبر کے ساتھ اپنے سامان ہی پر بیٹھے ہوئے اپنی باری کا انتظار کیجئے۔جنھیں اپنی خودداری عزیز ہے

وہ اس چپقلش اور ذلت کے تجربہ کے بعد اپنے کو کوستے اور اپنے ہی اوپر جھنجھلاتے ہیں کہ سفر ناحق ہی اختیار کیا۔ وہ تو کہیے کہ بس نہیں چلتا اور واپسی کی کوئی گاڑی سامنے موجود ہوتی نہیں، ورنہ عجب نہیں کہ کچھ لوگ تو اسی منزل پر سفر تمام کر کے ہندوستان واپس ہی چلے آئیں!۔۔۔۔شدید انتظار و انقباض کے عالم میں گھنٹہ سوا گھنٹہ کی مدت بھی چار پانچ گھنٹہ کی مدت سے کم معلوم نہیں ہوئی۔

خدا خدا کر کے گاڑی پھر سے چلی اور منٹوں کے اندر پاکستان کا پہلا سرحدی اسٹیشن جلّو آ گیا اور پتا ہی نہ چلنے پایا کہ ٹھیک کس وقت اور کہاں ہندوستان کے حدود ختم ہوئے اور پاکستان کی سرزمین شروع ہوگئی!۔۔۔۔اور یہ جلو بھی اپنی ہولناکی اور حشر انگیزی میں اٹاری سے کچھ کم نہ تھا اور پاکستان آخر کس چیز میں ہندوستان سے پیچھے کیوں رہنے لگا! بقول شخصے

دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی

کتاب ایک ہی، اس کا ایک ہندوستانی ایڈیشن اور دوسرا پاکستانی۔ عام مسافروں بیچاروں پر یہاں بھی سب کچھ وہی گزر کر رہا جو کچھ دیر پہلے اٹاری میں گزر چکا تھا۔ البتہ میں اپنی ذات خاص سے یہاں محفوظ اور مستثنیٰ رہا۔ یہاں کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اتفاق سے میری کتابوں سے واقف نکلے اور ایک عزیز نے خط لکھ کر انھیں واقف تر کر دیا تھا۔

دم کے دم میں لاہور شہر کے دیباچے شروع ہو گئے۔ دور دور کی عمارتیں، کارخانے اور مسجدیں، ریلوے ورکشاپ اور ریل والوں کے کوارٹر، مغلپورہ میں انجنوں اور ڈبوں کی ریل پیل، خاص لاہور جنکشن کا لق و دق یارڈ، پہلی بار ریل کے ڈبوں پر اردو حروف میں ''پاکستان ریلوے'' کا نظارہ!۔۔۔۔اور پھر خیال کی نظروں کے سامنے لاہور کی تاریخی اہمیت، قدیم اسلامیت، ملی مرکزیت، ہر قدیم و جدید تحریک میں اس کا پیش پیش ہونا تحریک علی گڈھ ہو یا تحریک خلافت سب میں بڑی حد تک اس کی امامت یہاں کی شہرہ آفاق صحافت، اردو زبان کی خدمات میں اس کی سبقت، یہاں کے اہل علم و اہل قلم.....اور خدا معلوم کتنے اور قدیم نقش حافظہ کی لوح پر ابھر آئے۔

پلیٹ فارم آ گیا۔ اور متعدد جانے پہچانے ہوئے مانوس و مالوف چہرے محبت کے تبسم کے

ساتھ پیشوائی کو آگے بڑھے، یہ عشرت رحمانی ہیں، وہ شوکت تھانوی ہیں، اور یہ وہی عبدالوحید خان ہیں اور متعدد اور علاوہ میرے میزبان اور ان کے عزیزوں کے، اور پھر دو صاحب اور بڑھے۔ ایک معلوم ہوا کہ حکومت پنجاب کے پبلک ریلیشنز آفیسر ہیں اور دوسرے ان کے اسسٹنٹ۔ اس وقت سے میں سرکاری مہمان تھا۔ ان حضرات نے کہا کہ ''آپ جس ہوٹل کو پسند فرمائیں وہاں آپ کے قیام کا انتظام کر دیا جائے اور ایک موٹر آپ کی سواری کے لئے ہر وقت موجود رہے گی۔ شکریہ کے ساتھ جواب میں کہا گیا کہ ''اپنے کو راحت سب سے زیادہ اپنے عزیز میجر ڈاکٹر حاجی خلیل الرحمٰن کے ہاں ملے گی۔ اس لئے ہوٹل وغیرہ سے تو معافی چاہتا ہوں''۔

(ص: ۲۱۷ تا ۲۲۳)

خاطر داریاں

دعوتوں اور پارٹیوں کا سلسلہ بھی تھا اور طویل بھی۔ اب سب یاد بھی کسے! دو چار تو ایسی ہیں جو کسی حال میں بھی بھولنے والی نہیں۔ ان میں سے ایک شورش صاحب ''چٹان'' والوں کے ہاں تھی۔ نام مدت سے کان میں پڑا ہوا تھا۔ چٹان کی زیارت بھی ہر ہفتہ ہوتی رہتی تھی۔ ملے تو سراپا باغ نکلے۔ چٹان کی خشکی کرختگی اور صلابت کے بجائے مہر و وفا کے پُتلے۔ تقریر و خطابت کا رنگ تحریر تک میں غالب ہوتا ہے تو پھر گفتگو تو اس رنگ کی ہونا ہی تھی۔ پرچہ اور گفتگو دونوں سے سوشلسٹ قسم کے مسلمان نظر آتے ہیں، لیکن کھانے کی میز پر پورے نواب یا سرمایہ دار جاگیردار۔

دوسرا امیرانہ بلکہ کہنا چاہیے کہ شاہانہ ڈنر صاحب زمیندار اختر علی خان صاحب کے ہاں ہوا۔ آخر یہ بلند اختر صاحب زادہ کس باپ کے ہیں۔ وہی ہمّا ہمی اور اولوالعزمی، پُر تکلف مہمان نوازی میں اپنے والد ماجد کے صحیح جانشین اور خلف الصدق۔ دفتر زمیندار کی بھی پر شکوہ عمارت کو گھوم پھر کر اب ہی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ کھانے کے تعدد کے ساتھ ساتھ مہمان بھی کثرت سے تھے۔ اور میزبان فرطِ اخلاق سے بچھے جاتے تھے۔

دعوتوں اور ضیافتوں کا ذکر نا تمام رہ جائے گا اگر اس واحد دعوت کا تذکرہ دلی شکر گزاری

کے اضافہ کے ساتھ نہ کیا جائے جو عین میرے مذاق کی تھی، یہ دعوت کرنے والے شوکت تھانوی تھے۔ اس میں یہی نہیں کہ کھانوں کے اسراف بیجا سے پرہیز کیا گیا تھا یعنی کھانوں میں گو تعدد تھا لیکن تعدد اس بلا کا نہ تھا کہ میز کی میز بھر جائے اور دل کو حسرت ہی رہے کہ کوئی ایک کھانا بھی تو سیر ہو کر نہ کھایا جاسکا اور پھر مہمانوں کی تعداد محدود در محدود صرف دو صاحب باہر کے جن سے گفتگو ہر قسم کی بہ اطمینان کی جاسکی۔۔۔۔شوکت تھانوی لاکھ زندہ دل، بذلہ سنج اور ہنسوڑ سہی پھر آخر تھانوی ہیں

میخانے کا محروم بھی محروم نہیں ہے

مہمان کے مذاق کی یہ رعایت خاص فیض حضرت تھانویؒ کا ہے۔ کاش ان کی مثال دوسروں کے لئے باعث تقلید ہو۔

(ص:۳۲،۳۳)

مخلصوں کے جُھرمٹ میں

اسٹیشن آ گیا اور یہ کراچی کا پہلا یعنی کنٹونمنٹ اسٹیشن ہے۔ گاڑی رُک ہی رہی تھی کہ مجمع پر نظر پڑ گئی۔ اور ہجوم سے اندازہ ہو گیا کہ یہیں اترنا ہے، اپنے عزیزوں اور قدیم مخلص شناساؤں ہی کی تعداد ماشاء اللہ اس شہر میں کیا کم تھی کہ اخباری اطلاع کی بنا پر نئے نئے مخلصوں اور کرم فرماؤں کا اضافہ، فلاں بھائی اور فلاں بھتیجے، اس مجمع میں ملے جلے نئے نئے چہرے یہ فلاں پارٹی کے سکریٹری ہیں اور وہ فلاں انجمن کے نمائندہ ہیں اور اکثر سے تعارف خواجہ عبدالوحید کرا رہے ہیں۔ اور ذرا آگے بڑھے تو کیا دیکھا کہ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق بہ نفیس نفیس چلے آ رہے ہیں! اس سن وسال میں یہ جوان ہمتی اور اپنے ایک خورد کی عزت افزائی، ان کا کرم ہی کرم ہے۔ مصافحہ اور معانقہ کا شوق ہے کہ اُبلا پڑتا ہے۔۔۔۔دل ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کہاں جانا ہوگا اور اتنے عزیزوں، مخلصوں میں سے کس کے ہاں ٹھہرنا ہوگا کہ یک بیک گورنر جنرل بہادر کے اے ڈی سی کی سفید براق وردی نمودار ہوئی۔ اور لفٹنٹ امام کی خوشگوار آمد نے اس تذبذب سے نجات دلا دی، مہمان کی منزل وہی ٹھہری جو معزز

میزبان کا قصر عالی تھا. دوسرکاری موٹر ہوا سے باتیں کرتے ہوئے روانہ ہوئے اور منٹوں کے اندر اس انوکھے مسافر کی پوری پارٹی گورنر جنرل ہاؤس میں داخل تھی!۔۔۔۔غالب کا مشہور مصرعہ

کبھی ہم ان کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

یوں بھی تو پڑھا جاسکتا ہے ع

کبھی ہم اپنے کو، اور ان کے گھر کو دیکھتے ہیں!

باریابی پہلے دن آٹھ بجے شب کو ہوئی. وقت چند منٹ کا مقرر ہوا. اور اس سے قبل اے ڈی سی آ کر اپنے ہمراہ لے گئے، کھانے کی میز پر بیٹھے ہی تھے، گفتگو عام مزاج پرسی کے بعد نجی قسم کی ہوتی رہی. ادھر سے سوالاتِ صحت وطریق علاج وغیرہ سے متعلق رہے. اُدھر سے ایک سوال یہ ہوا کہ کہیے دورانِ قیام میں ارادہ کیا کرنے کا ہے؟ جواب میں عرض کیا گیا کہ ''اور کوئی ارادہ نہیں بجز دوستوں، عزیزوں سے ملنے ملانے کے. اور کسی پبلک مشغولیت کا تو بہر حال خیال ہی نہیں''. اس پر بڑی مسرت کا اظہار فرمایا کہ ''بس یہ ٹھیک ہے ملئے، ملایئے، کھایئے، پیجئے، سیر کیجئے'' دل نے اس پر بڑا ہی شکر ادا کیا کہ بڑی ذمہ داریوں سے نجات مل گئی. اگر کوئی سیاسی موضوع چھڑ جاتا یا چھیڑنے کی بنیاد ہی پڑ جاتی تو خدا معلوم گفتگو کیا صورت اختیار کرتی اور فریقین میں کس کو کتنا دل مارنا پڑتا. یا دوسرے کا دل رکھنے کے لئے خود کتنی مدارت کرنا پڑتی. اللہ ٹھنڈی رکھے اس شاعر کی تربت کو جو ہم پست ہمتوں اور ناتوانوں کی کیا خوب ترجمانی کر گیا ہے ؎

ماقصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

(ص:۵۰،۵۱،۵۲)

مرقدِ سلیمانی پر حاضری

مرحومین میں سب سے مقدم حاضری مرقد سلیمانی پر تھی. پہلے اُن مرحوم کے گھر گیا. اس

مقام کو حسرت کی آنکھوں سے دیکھا جہاں اس مؤرخ اسلام اور فاضل جلیل نے ناسوتی زندگی کے آخری لمحہ گزارے تھے۔ جہاں بیمار پڑے تھے، جہاں جان کا تحفہ جان آفریں کو واپس کیا تھا۔۔۔۔ گھر کے بعد مزار پر حاضری ہوئی گھر سے چند ہی فرلانگ پر ہے۔ کچی تربت کا دل پر بڑا ہی اثر ہوا، ہٹنے کو جی نہ چاہا۔ دھوپ کا وقت نہ ہوتا اور ساتھیوں کے سبب سے عجلت نہ ہوتی تو جی میں تھا کہ لحد کے کنارے بیٹھ جایئے اور زبان بے زبانی میں کچھ اپنی سُنایئے اور کچھ اُدھر سے سنیے۔ نورانیت اس سیرت نگار نبوت کے مرقد پر نہ ہوتی تو اور کہاں ہوتی! ایک معمولی کچی تربت، بغیر کسی قسم کی بھی آرائش وتکلف کے عبدیت کی پوری طرح مظہر بیسیوں پختہ وشاندار اور پر تکلف مزارات پر بھاری، غالب نے ایک دوسری لیکن اسی مقام ومرتبہ سے ملتی ہوئی کیفیت کی عکاسی کیا خوب کی ہے

اک خونچکاں کفن میں ہزاروں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

سید مرحوم آج زندہ ہوتے تو ملاقات کا کیا رنگ ہوتا! کتنے سوال وجواب ہوتے کیسے کیسے عقدے حل ہوتے۔ کیا کیا لطیفے سننے میں آتے، عرض ومعروض، گلے شکوے، راز ونیاز سب ہی کچھ رہتے اور شاید کچھ نوک جھونک بھی چلی جاتی! اب سب کیا جنت ہی کے لئے اٹھ رہا؟ بشرطیکہ وہاں اس بڑے کے ساتھ اس چھوٹے کو بھی جگہ مل گئی!۔۔۔۔ مرحوم کا ارادہ آخر وقت تک ہندوستان چھوڑنے کا نہ تھا صرف عارضی پرمٹ پر چند روز کے لئے پاکستان آئے تھے۔ واقعات وحوادث تکوینی کس کے بس کے ہیں۔ پے در پے ایسے پیش آئے چلے گئے کہ بات روز بروز بگڑتی چلی گئی اور مرحوم کو گویا اضطراراً ہندوستانی سے پاکستانی بن جانا پڑا۔

(ص:۵۸)

زہر اور اس کا تریاق

بڑا دکھ یہ دیکھ کر ہوا کہ قدیم وجدید گروہوں میں بیگانگی اچھی خاصی پیدا ہوگئی ہے۔ گویا

دینداروں اور روشن خیالوں کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہے اور جب باہمی بدگمانیاں جڑ پکڑ چکی ہیں تو یہ نتیجہ بھی بالکل قدرتی ہے کہ ایک فریق کی سیدھی سی بات بھی دوسرے کو تیر ونشتر ہو کر لگتی ہے۔ اور علماء اور تعلیم یافتہ طبقہ کے درمیان بے اعتباری کا یہ زور ہے کہ دو اور دو کو چار کہیں، تو وہ ان کی ضد میں آ کر اس بدیہی حقیقت کو بھی جھٹلا دیں! اور اقبال کی یہ شاعری کچھ حقیقت سی بن گئی ہے ؎

واعظ دلیل لائے جوئے کے جواز میں
اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے!

زخم کے اندمال اور چوٹ کے التیام کا کام ندوی ہی کی قسم کی کوئی جماعت انجام دے سکتی ہے، جو روح اور مغز کے لحاظ سے قدیم ہو اور شکل وقالب کے لحاظ سے جدید۔ صراحی اور گلاس نئے ہوں اور ان کا مشروب وہی جانا پہچانا ہوا پرانا۔۔۔۔ جب تک کوئی ندوۂ جدید میدان میں نہ آئے۔ اس قسم کے ادارے اس کی جانشینی خاصی حد تک کر سکتے ہیں۔

(ص:۶۶)

شاہی ضیافت

آئے دو ہی تین دن ہوئے تھے کہ وزیر اعظم بلکہ والیِ مصر کرنل جمال الدین عبدالناصر کی آمد کا غلغلہ شروع ہوا۔ شاہانہ کروفر، تزک واحتشام سے آئے اور اسی گورنر جنرل ہاؤس کے ایک حصہ میں مقیم ہوئے۔ رات کو روشنی کی وہ جگمگاہٹ ہوئی کہ ہاؤس ایک بقعۂ نور معلوم ہوتا تھا۔

میزبان ومہمان سب کی تعداد ملا کر کوئی سوا سو کے قریب ہوگی۔ ''دونوں سرکاروں'' کے برآمد ہونے میں کچھ وقفہ تھا۔ اور ہم سب بڑے اور چھوٹے ایک دوسرے بڑے ہال میں کھڑے انتظار کرتے رہے۔ اسٹیٹ ڈنر میں شرکت کا زندگی میں پہلا موقع تھا۔ جگمگاہٹ اور ہر قسم کے تکلفات کی آب وتاب الفاظ میں کیا بیان ہو، چیز دیکھنے کی ہے سننے کی نہیں۔ مختلف گوشوں میں نیزہ بردار سپاہی ایک مخصوص قسم کی وردی میں ملبوس در ودیوار سے پیوستہ اس طرح بے حس وحرکت کھڑے ہوئے تھے

کہ انسان سے کہیں زیادہ پتھر کے نصب شدہ بُت نظر آتے تھے۔ مہمان آپس میں مل جل رہے تھے۔ ہنسی چہل ہو رہا تھا۔ سارے مجمع میں سب سے زیادہ بے جوڑ ان سطور کا راقم ہی تھا اور تماشائی سے کہیں بڑھ کر اس وقت تماشہ بنا ہوا تھا۔ کھدر کی خلافتی ٹوپی، رنگین عبا، بے ہنگم داڑھی۔ اس وضع قطع کا شخص، زرق برق، چست لباس والوں، سوٹ پوشوں کے درمیان اگر ہیولا یا انحوکہ بن کر نہ رہ جائے تو آخر کیا ہو۔ مہذب و شائستہ لوگ تھے۔ زبان سے کسی نے کچھ نہ کہا لیکن دل ہی دل میں جتنا بھی ہنس رہے ہوں کم ہے۔۔۔۔ ہاں میرے سوا کچھ مستثنیات اور بھی تھے۔ عربی لباس عقال و عبا میں دو بزرگ غالباً سعودی سفیر اور ان کے نائب ہوں۔ اور ایک شروانی اور پاجامہ میں ملبوس اور چہرہ پر داڑھی لیے ہوئے سر محمد ظفر اللہ خان۔۔۔۔ عورتیں نہیں لیڈیاں بہت بڑی تعداد میں تو نہ تھیں کوئی ۲۵ ہوں گی، لیکن الحمد للہ کہ سب بے حجاب نہ تھیں۔ بعض اچھے خاصے ساتر لباس میں ملبوس اور اسلامی حیا و شرافت کی لاج رکھے ہوئے تھیں۔ بعض بین بین۔ صرف چار پانچ ایسی تھیں جو پوشاک ساتر سے زیادہ عریاں زیب تن کیے ہوئے خاص الخاص فرنگی انداز میں ہنس بول رہی تھیں اور خوش فعلیوں میں مشغول۔

اتنے بجکرا تنے منٹ پر دونوں ''سرکار'' برآمد ہوئے اور کسی افسر نے (غالباً ملٹری سکریٹری) نے پکار کر انگریزی میں وہی کہا جسے شاہی درباروں کے نقیب کسی زمانہ میں ''نگاہ روبرو'' یا ''باادب ہوشیار'' سے ادا کرتے تھے۔

(ص:۷۷،۷۸)

کراچی سے لاہور

گفتگو طول میں کھنچتی ہی چلی گئی۔ اور جو بات شاید چند سطروں میں بھی کہی جا سکتی تھی ورق پر ورق بھی اس کے لئے ناکافی ثابت ہوئے! دراز نفسی کے لئے خصوصیت کچھ واعظ غریب کی نہیں، واقعات کی بجائے خود کثرت و فراوانی اور پھر ان کا گوناگوں تعدد اور اس پر مستزاد تنوع اور سب سے بڑھ کر یہ کہ واقعات کے ساتھ ساتھ واردات خارجی کے نقوش کے قدم سے قدم ملائے قلب کے

تأثرات! شعر بڑھ کر دوغزلہ کی حد تک نہ پہنچ جائے اور مضمون رسالہ کی ضخامت نہ اختیار کرلے، تو اور کیا ہو ؎

یوں ہی افسانۂ شب غم تھا بہت طویل
اور اس پہ بیچ بیچ میں پھر داستان دل!

کہنے کو یوں تو بہت سی باتیں کہنے میں آ گئیں، لیکن خود میزبان سے متعلق بات چیت کچھ یوں سی رہی.

میزبان کی حیثیت سے ملک صاحب ایک اعتبار سے مثالی میزبان ثابت ہوئے. کھانے پینے کی خاطروں اور ہر طرح کے مادی آرام و آسائشوں کا تو خیر کہنا ہی نہیں. اس کا کچھ اندازہ تو پہلے ہی سے تھا. باقی بڑی چیز یہ دیکھنے میں آئی کہ مہمان کے مذاق طبیعت کا خیال خاص طور پر رکھا. یہ بات بہت کم میزبانوں کے حصہ میں آتی ہے. بس رسمی خاطرداریوں اور اندھا دھند فرمائشوں کی بھرمار رکھی جاتی ہے۔

(ص:۱۰۱،۱۰۲)

آٹھ دن کی بساط ہی کیا تھی، بڑی بڑی طویل عمریں، عمر کی بڑی سی بڑی مہلتیں دیکھتے ہی دیکھتے تمام ہوجاتی ہیں. اٹھوار پلک جھپکتے ختم ہوگیا. ۷/اپریل ۱۹۵۵ء کو صبح یہاں داخلہ ہوا تھا. ۱۵/ اپریل کی شام کی بات کہتے آ گئی ؎

کئی رات حرف و حکایات میں
سحر ہوگئی بات کی بات میں

اور محبت کرنے والوں کے اس شہر کو بہر حال چھوڑنا پڑا. اور آٹھ سے قبل کا وقت تھا جب پوری پارٹی اسٹیشن پہنچ گئی. اب کی یہ سٹی اسٹیشن تھا جو کراچی کا آخری اسٹیشن ہے. رخصت کرنے والوں کا ہجوم حسب توقع اچھا خاصہ تھا. نام سب کے نہ اب یاد، نہ دُہرانے کی ضرورت. ناشتہ کے نام سے کھانے کے ذخیرے ایک نہیں متعدد مہربانوں نے ساتھ کردیئے اور رخصتی اس طرح ہوئی کہ جیسے کوئی پردیس

سے اپنے وطن کو نہیں بلکہ وطن سے باہر جارہا ہے۔ وطن شاید مٹی کے ذرات اور مٹی چونے کے در و دیوار سے بڑھ کر نام محبت کرنے والوں کا ہے!

رات گزری اور دن نکلا۔ اور اسٹیشنوں کے سارے وہی منظر اپنے کو دُہراتے رہے جو ادھر سے جاتے ہوئے پیش آئے تھے۔ بھاول پور، ملتان، مانٹیگومری، خدا معلوم کتنے مقامات سے بوئے محبت آئی، لیکن جی کا ہر چاہا ہوا پورا ہونا انسان کے مقدر میں کہاں رکھا گیا ہے؟ زندگی کے سارے سفر میں کتنے مقامات کو بس نگاہ حسرت سے ہی دیکھتے ہوئے گزر جانے پر قناعت کرنا پڑتی ہے، غالبؔ نے تو ناجائز حسرتوں کی بھی داد ملنے کی تمنا کی ہے ؎

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر کردہ گناہوں کی سزا ہے

خیر یہ تو ممکن ہے کہ شاعری ہو، لیکن بہر حال جائز حسرتیں تو ہر مؤمن کے لئے ایک بڑا ذخیرۂ آخرت ہوتی ہی ہیں۔

(ص:۱۰۶،۱۰۷)

لاہور سے رخصتی

بات کی بات میں جلّو اسٹیشن آ گیا۔ وہی جہاں پاکستان کی طرف سے زبردست چیکنگ ہوتی ہے اور عام مسافر اس کے نام سے ہول کھاتے ہیں۔ اپنا تجربہ ایک بالکل خصوصی استثنائی طور یہاں پہلی بار بھی خوشگوار رہا تھا اور اب کی تو اس سے بھی کہیں بڑھ کر خوشگوار رہا۔ دوسروں کو دیکھ رہا تھا کہ بیچاروں کو رتی رتی سامان کے ساتھ اتر کر جانا پڑ رہا تھا اور ہر طرح تکلیف ہی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اپنے کو سرے سے نہ خود اترنا پڑا نہ کوئی سامان اتارنا پڑا، قُلی ولی جو لپک کر آئے مایوس واپس گئے۔ اُلٹی ہم لوگوں کی خاطریں بھی چائے پانی سے ہوتی رہیں۔ میرے سکریٹری ہی جا کر ضابطہ کی شرطیں پوری کر آئے اور پھر جب ٹرین چلنے لگی تو انھیں زیدی صاحب نے گارڈ سے کہہ دیا کہ مولانا کو کوئی زحمت

نہ اٹاری میں ہونے پائے اور نہ امرتسر میں وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا کے ساتھ ساتھ وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا کا نظارہ۔ ناسوت سے رخصتی اور برزخ میں داخلہ کے وقت تو ہوتا ہی ہے اس کا ہلکا سا نمونہ کبھی کبھی اسی حواسوں کی دنیا میں بھی دیکھنے میں آجاتا ہے۔

(ص:۱۱۳)

معروضاتِ خصوصی

رودادِ سفر خدا خدا کر کے ختم ہوئی۔ کسے توقع تھی کہ زندگی میں کبھی بھی اس کا موقع ملے گا۔ اس مختصر سیاحت کا اور اس کی اتنی مفصل روئداد نگاری کا! اب اس کے خاتمہ پر جی میں ہے کہ چند مختصر گزارشیں بہ طور حاصل سفر کے عرض کر دیجئے۔ اور چونکہ ممکن ہے کہ بعض طبائع کو ان معروضات میں شیرینی سے زیادہ تلخی نظر آئے اس لئے بہتر ہوگا کہ شروع میں اقبالؔ کے مشہور مصرعہ کا بھی استحضار کرلیا جائے ؏

خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے!

بڑے دکھ اور دلی کرب کے ساتھ یہ محسوس ہوا کہ جس اتحاد امت، یکدلی، یکجہتی کو وجود میں لانے اور اسے ترقی دینے کے لئے پاکستان بنا تھا خود وہی مفقود ہے۔ قدم قدم پر انتشار، بات بات میں اختلاف اور سب سے مہلک زہر رگ رگ میں سرایت کیا ہوا، صوبائی تعصب کا! اس زہر کا تریاق صرف ایک ہی تھا! ایمانی اخوت۔ یہی سب کو ایک سانچہ میں ڈھال سکتی ہے اور وہی ناپید۔

شکوہ کس کس کا کیا جائے اور کس گروہ یا جماعت کا نام لے کر ذمہ داری اس کے سر ڈال دی جائے، کسی میں اخلاص ہے تو تدبر نہیں اور کہیں اگر جوش ہے تو وہ ہوش سے عاری! یہ تذکرہ ہرگز خوشگوار نہیں لیکن اسے نظر انداز کر جانا بھی کیوں کر ممکن ہے؟

ہندو پاکستان کے باہمی تعلقات یہ دیکھ کر دل بہت ہی کڑھا کہ محض آپس کی ضدم ضدا نے اس درجہ خراب کر رکھے ہیں۔ نفس تقسیم تک ہرگز دشمنی کو لازم نہیں۔ حقیقی بھائیوں کے درمیان

جائداد کی تقسیم ہوتی رہتی ہے اور بارہا اس تقسیم کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مدتوں کے بگڑے ہوئے تعلقات از سرِ نو سدھر جاتے ہیں. بعینہٖ یہی صورت ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بھی ممکن تھی اور آج بھی ناممکن نہیں. لاہور کراچی دونوں جگہ یہ محسوس کر کے دل کو کس درجہ کوفت اور اذیت ہوئی تھی کہ گردوپیش کے سارے محبت کرنے والے ہی جمع ہیں. بہت سے تو عزیز ہیں اور جو عزیز نہیں وہ بھی فرطِ اخلاص کی بنا پر عزیزوں ہی میں شمار کے لائق. لیکن اس ساری یگانگت کے باوجود پھر بھی اجنبی، پھر غیر، پھر بیگانے۔ مورا اپنے پَر پھیلا پھیلا کر خوش ہو رہا تھا، ناچ رہا تھا کہ یک بیک نظر اپنے پیروں پر پڑ گئی اور دل کی کلی معاً مرجھا کر رہ گئی !۔

(ص:۱۱۵،۱۱۶،۱۱۷)

چوتھا باب

تأثرات ماجدی

ہندی مسلمانوں کی بیسوی صدی تاریخ ہند اور تاریخ اسلام میں اپنی گوناگوں حیثیتوں کی وجہ سے خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اس صدی میں اسلامیات میں امت مسلمہ کو مولانا اشرف علی تھانویؒ اور مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ وغیرہ کی صورت میں وہ حکیم و مرتاض مصلح عطا ہوئے کہ ہزاروں، روحانی بیماریوں سے لدے پھندے آئے اور ان کے چشمۂ فیض سے شفایاب ہو کر گئے اور سیاسیات میں حسین احمد مدنیؒ، علی برادرانؒ اور مولانا ابوالکلام آزادؒ کی شکل میں وہ سرگرم و فعال قائدین نصیب ہوئے کہ ان کی سرفروشی کی داستانیں وترانے اپنے تو خیر، غیر بھی دہرانے اور گنگنانے لگے۔ اِدھر شبلیؒ کے جلو میں فاضل و محقق مصنفین و مؤلفین قلم و قرطاس تھامے حق کی حمایت و اشاعت میں مگن و سرگرم عمل۔ اور اُدھر اکبرؒ و اقبالؒ کی مجلسِ ظرافت و قلندری کے درس پڑھ کر بے شمار شاعر و صاحبِ دیوان۔ ابھی کلکتہ کے افق سے آزاد کی ارادت میں الہلال آزادی کا پیام لئے ہوئے نمودار ہو رہا ہے اور اب لکھنؤ کے مطلع سے شبلی کی قیادت میں الندوہ حق و حقانیت کی ضیا گستری کرتا ہوا طلوع ہو رہا ہے۔ غرض کہ ہر شعبۂ زندگی میں ایسی ایسی نامور شخصیتیں کہ جو محض تماشی کی حیثیت سے ان کی بزم میں آئے وہ بھی متأثر ہوئے بغیر نہ رہے اور جو طویل طویل صحبتوں سے مستفید ہو چکے ہوں ان کی اثر انگیزی و دیوانگی کا تو پوچھنا ہی کیا!

مولانا دریابادیؒ نے ہوش کی آنکھیں کھولیں تو بزمِ ہند کو انہیں قائدین کی ہماہمیوں اور جلوہ طرازیوں سے آراستہ پایا قریب آئے تو بہتوں سے متأثر ہوئے اور تعلقات بھی تقریباً ہر ایک سے اچھے رہے اور بعض سے بڑھ چڑھ کر لیکن جن شخصیتوں سے سب سے زیادہ متأثر ہوئے اور انھیں کسی حیثیت سے اپنا قائد و رہنما تسلیم کیا وہ دو حضرات ہیں۔ ایک جنگِ آزادی کے سرفروش مجاہد

مولانا محمد علی جوہرؒ اور دوسرے تھانہ بھون کے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی. پوری تفصیل مولانا دریابادی ہی کے قلم سے ملاحظہ فرمایئے:-

''سب کے احسانات اپنی جگہ پر، لیکن حقیقۃً میری سیرت سازی میں سب سے زیادہ مُعین ومؤثر دو شخصیتیں ثابت ہوئیں، ان دونوں نے کہنا چاہیے کہ زندگی کا رُخ ہی موڑ دیا، ان دونوں کا فیض صحبت نہ نصیب ہو جاتا تو خدا معلوم کہاں کہاں اب تک بھٹکتا پھرتا۔

پہلا نام تو ہندوستان کے مشہور لیڈر مولانا محمد علی جوہر کا ہے، یہ میرے گویا محبوب تھے. ان کا نام بچپن سے سننے میں آ رہا تھا، اور ان کی انگریزی مضمون نگاری اور انشا پردازی کی دھاک شروع سے دل میں بیٹھی ہوئی تھی. عمر میں مجھ سے چودہ سال بڑے تھے، شخصی تعارف اخیر ۱۹۱۲ء میں ہوا، محبت و عقیدت دُور ہی دُور سے بڑھتی رہی. ستمبر ۲۱ء میں جب دوبارہ اسیر فرنگ ہوئے اور کراچی میں سزایاب، تو زبان ودماغ پر ان کی اخلاقی وروحانی عظمت کا کلمہ رواں تھا. اور ان کی ذات سے شیفتگی درجۂ عشق تک پہنچ چکی تھی، ۲۳ء کے آخر ختم ۳۰ء تک قرب واتصال کے موقع کثرت سے حاصل رہے اور عشق میں ترقی بھی ہوتی رہی، ان کی نہ کوئی بات دل کو بُری لگتی نہ ان پر کسی حیثیت سے بھی تنقید کرنے کو جی چاہتا، یہی جی میں رہتا تھا کہ ان کے قلم اور ان کی انگلیوں کو چوم چوم لوں. اسلام اور رسول اسلامؐ سے اس درجہ شیفتگی، اللہ کے وعدوں پر اس شدت سے اعتماد، یہ اخلاص، یہ للّٰہیت، تصنع ومنافقت سے اس درجہ گریز، حق کے معاملے میں عزیزوں، قریبوں، بزرگوں تک سے بے مروتی اور پھر ایسی فہم وذکا، علم وآگہی، غرض میرے لئے تو ایک بے مثال شخصیت تھی. اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

دوسری شخصیت ان سے بھی اہم تر اور مفید تر جو میرے نصیب میں آئی، وہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تھی، مدتوں ان سے شدید بدظنی میں مبتلا رہا، اور اس بدظنی کے بڑھانے میں بڑا حصہ حضرت ہی کے بعض مریدوں، معتقدوں کا تھا، مدتوں یہ سمجھتا رہا کہ ایک متشدد و خشک مولوی ہیں، برطانیہ نواز اور نصرانیوں کے دوست. جب وصل بلگرامی نے ان کے وعظ پڑھنے کو دیے تو پہلی بار آنکھیں کھلیں اور پھر مراسلت کے بعد نوبت دید و زیارت کی آئی، کتنے ہی کمالات ظاہری و باطنی کھل کر رہے، علم و تفقہ، تصوف و شریعت کے جامع، حسن عمل کے ایک زندہ پیکر، اور ارشاد و اصلاح کے فن کے تو بادشاہ. وقت کے دوسرے مشائخ کو ان سے کوئی نسبت ہی نہ تھی تو بہار عالم دیگری، زکجا بہ ایں چمن آمدی!

شیخ سعدیؒ اگر آج ہوتے تو عجب نہیں کہ اپنا نسخہ گلستان بہ غرض اصلاح ان کی خدمت میں پیش کرتے. حضرت غزالیؒ ہوتے تو عجب نہیں کہ احیاء علوم دین کی تصنیف میں استناد و استفادہ ان سے سطر سطر پر کرتے رہتے. جولائی ۲۸ء میں سلسلہ مکالمت و مجالست کا شروع ہوا اور کہنا چاہیے کہ آخر عمر شریف تک جاری رہا اور سلسلۂ مراسلت اس کے علاوہ۔ ۳۰ء سے جو کچھ اس ناکارہ سے دین کی خدمت بن پڑی اور اپنے رذائل نفس سے جس درجہ بھی شفا اپنے ظرف و بساط کے مطابق مل سکی، کہنا چاہیے کہ وہ سارا فیض اسی بارگاہ کا ہے. بزرگ اور عابد، زاہد بزرگ اور متعدد دیکھنے میں آئے لیکن مُصلح، مُزکی، مربّی کوئی ایسا دیکھنے میں نہ آیا۔۔ محمد علی اگر میرے محبوب تھے تو اشرف علی میرے مقتدا و مطاع محبت کے مرکز اگر وہ تھے، تو عقیدت کے مرجع یہ!" (آپ بیتی ص: ۳۵۷، ۳۵۸)

''حضرت تھانوی کی وفات جولائی ۴۳ء میں ہوئی۔اس کے کچھ ہی روز بعد خیال آیا کہ اپنے اور حضرت کے تعلقات پر، حضرت کے خطوط کی روشنی میں کچھ لکھ ڈالوں، خطوط سیکڑوں کی تعداد میں محفوظ مل گئے میرے اصل عریضے بھی اور ان ہی پر حضرت کے جوابات بھی، بڑا وقت ان کے چھانٹنے اور تاریخ وار مرتب کرنے میں لگ گیا، پر کتاب کو بھی قدرۃً ضخیم ہی ہونا تھا، خیر خدا خدا کر کے کتاب ۵۰ء میں پریس سے باہر آ گئی.....اب خیال آیا کہ مولانا محمد علی جوہر کا قرضہ تو اس سے بھی پُرانا اپنے اوپر باقی چلا آ رہا ہے کسی طرح اسے بھی بے باق کیجئے۔مرحوم کی وفات کے بعد ہی سچ میں ان پر لکھنا شروع کر دیا تھا، اور محمد علی! ذاتی ڈائری کے چند ورق کے عنوان سے ۱۶، ۱۷ نمبر لکھ ڈالے تھے، اب انھیں کو بنیاد بنا کر کتاب از سرِ نو لکھنا شروع کی، ۸۸ بابوں میں اور متعدد ضمیموں کے دو جلدوں میں ختم کی''۔

(ایضاً ص:۲۹۰)

دیگر بعض ابواب کی طرح مرتب نے تأثراتِ ماجدی کی بھی دو فصلیں قائم کی ہیں پہلی حکیم الامت نقوش وتأثرت اور دوسری محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق۔

فصل اول

حکیم الامت۔ نقوش وتأثرات

اشرفی سلوک

مرشد کی تلاش ایک عرصہ سے جاری تھی، تصوف اور سلوک کا ذخیرہ جو کچھ بھی فارسی اور اردو اور عربی میں ہاتھ لگ سکا تھا، بہت کچھ پڑھ لیا گیا تھا، اتنی کتابیں پڑھ ڈالنے اور اتنے ملفوظات چاٹ جانے کے بعد، اب آرزو اگر تھی، تو ایک زندہ بزرگ کی. حیدرآباد اور دہلی اور لکھنؤ جیسے مرکزی شہر، اور اجمیر اور کلیر، دیوہ اور بانسہ، رَودَلی اور صفی پور چھوٹے بڑے ''آستانے'' خدا معلوم کتنے دیکھ ڈالے، اور سُن گُن جہاں کسی بزرگ کی بھی پائی، حاضری میں دیر نہ لگائی، حال والے بھی دیکھنے میں آ گئے، اور قال والے بھی، اچھے اچھے عابد زاہد، مرتاض بھی، اور بعض نرے دکاندار قسم کے گیسو دراز بھی، آخر دل نے کہا حق حلقۂ دیوبند میں محصور ہے، انتخاب کے دائرہ کو محدود کر کے، اب تفصیلی جائزہ اسی حلقے کا لیجئے، اور جس نے بہترین متنِ سلوک (مثنوی معنوی) کی بہترین شرح لکھ ڈالی، اور اپنے چھوٹے چھوٹے سہل فقروں میں، حقائق ومعارف کی روح بھر دی ہے، دامن اسی کے کسی تربیت یافتہ کا تھامیے۔

اسی تلاش مرشد کے سلسلہ میں ایک سفر صفی پور ضلع اٹاوہ کا ہوا، رفیقِ سفر اب کی وصل بلگرامی مرحوم تھے. واپسی میں بولے کہ ''بہت دوڑ دھوپ کر چکے، ذرا ہمارے مولانا کا بھی تجربہ کیجئے، سب کو بھول جائیے گا'' تھانہ بھون اگر دور ہے تو قصد السبیل، تربیت السالک وغیرہ تو میرے پاس ہی ہیں، انھیں تو دیکھ ڈالیے''۔۔۔۔ اچھا! تو ان خشک مولوی صاحب نے تصوف پر بھی کچھ لکھا لکھایا ہے، خیر دیکھ ڈالنے میں کیا مضائقہ ہے بشرطیکہ کہیں مل گئیں.

''کہیں مل گئیں'' اس کی سند وصل بلگرامی صاحب کے ہاں نہ تھی، دوسری ہی صبح کتابوں کا ایک پورا پلندہ لیے ہوئے وصل صاحب میرے ہاں لکھنؤ میں موجود! ہائے خوب شخص تھا، یہ وصل صاحب مرحوم بھی، عجیب ہمہ جہتی ہستی تھی. ہر صحبت میں، ہر مذاق کی مجلس میں موجود، موجود ہی نہیں، گھلے ملے ہوئے. میں تو خیران کا گودوں کا کھلایا ہوا تھا، بیگانوں، راہ چلتوں کا کام ہر طرح کا نکالنے کو پیش پیش، دوست دشمن سب کے حق میں ''مشکل کشا''

کتابیں پڑھ کر جب بند کیں تو اب عالم ہی دوسرا تھا ع

اب نہ کہیں نگاہ ہے اب نہ کوئی نگاہ میں

اپنا جہل اپنے سامنے آئینہ دار! معلوم ہوا کہ اب تک جو کچھ اس سلسلہ میں پڑھا تھا، سنا تھا وہ بس جھک ماری تھی تصوف کی حقیقت، طریق کی تعریف آج پہلی بار دماغ کے سامنے آئی. قصد السبیل پڑھتا جاتا تھا، اور سطر سطر پر، پردے نگاہوں سے ہٹتے جاتے تھے، رہ رہ کر طبیعت اپنے ہی اوپر جھنجھلاتی تھی کہ اب تک کیوں نہ پڑھا تھا. ۱۶ برس کی مدت کوئی تھوڑی ہوتی ہے، آج تک اپنے اس جہل کے انکشاف کی یاد تازہ ہے۔

(ص: ۳، ۴)

دیدارِ اشرف

عقیدت اُس وقت سب سے زیادہ، مولانا تھانوی ہی سے تھی، بزرگی سب سے بڑھ کر ان ہی کی مسلم تھی، دل سب سے زیادہ اُن ہی کی طرف کھینچ رہا تھا، لیکن ساتھ ہی اختلافات کی بھی ایک خلیج اپنے اور ان کے درمیان حائل پا رہا تھا، اُن میں سب سے بڑھ کر سیاسی اختلاف تھا! دل اس پر آمادہ نہ ہوا کہ آنکھ بند کر کے اُن کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا جائے. مولانا حسین احمد صاحب سے عقیدت اس درجہ کی نہ تھی، لیکن ساتھ ہی کوئی کسی بھی شدید قسم کا اختلاف نہ تھا اور سیاسیات میں بالکل

ہم رنگی تھی۔۔۔۔رفیق قدیم مولوی عبدالباری صاحب ندوی کے ساتھ مل کر دیوبند چلنے کی ٹھہر گئی۔اور جون ۱۹۲۸ء کی کوئی آخری تاریخ تھی کہ صبح کے وقت ہم دونوں لکھنؤ سے لمبا سفر کر کے دیوبند اسٹیشن پہنچ گئے۔ یہاں کی حاضری کا یہ بالکل پہلا موقع تھا۔۔۔۔تین دن کے قیام کے بعد دیوبند میں روایتیں مشاہدہ بن کر رہیں،اور شنیدہ،دیدہ میں تبدیل ہو کر،تکلفات اور خاطریں اور مہمانداریاں، کھانے پر کھانے،اور چائے پر چائے،بیعت کے سوال پر ارشاد ہوا کہ یہاں کیا رکھا ہے،ذرا تھانہ بھون تو چلیے،یہاں تو نیت ہی یہی تھی،ایک روز سہ پہر کو یہ مختصر سا قافلہ چل کھڑا ہوا،گویا

مؤمن چلا ہے کعبہ کو ایک پارسا کے ساتھ

البتہ یہاں اپنے ساتھ پارسا ایک نہیں دو تھے،اور سفر کعبہ کا نہیں،کعبۂ مقصود کا تھا۔۔۔۔ ایسی منزل کے لئے رہبر بھی،اس سے بہتر اور کون مل سکتا تھا!اللہ اللہ!ایسے سفر کی سعادت ہی کب نصیب میں معلوم ہوتی تھی

ہے آرزو کہ ابروئے پرخم کو دیکھیے
اس حوصلہ کو دیکھئے اور ہم کو دیکھیے

قافلہ مختصر سا تین آدمیوں کا اسٹیشن پر اترا،تین میں سے ایک خود ہی نامور لیڈر اور شیخ الحدیث،باقی دو میں سے ایک عالم دوسرا عامی،اسٹیشن اس وقت تک ٹاؤن کا کھلا نہ تھا،وہی پرانا بڑا اسٹیشن تھا،جو اب عوام کی زبان پر جلال آباد کے نام سے مشہور ہے،یہاں سے قصبہ تھانہ بھون کا فاصلہ کوئی تین میل کے ہوگا،تانگہ کرایہ پر کیا اور سنسان راستوں سے گزرتے کوئی آدھ گھنٹہ میں قصبہ کے اندر پہنچ گئے۔۔۔۔حکیم الامت ولیِ کامل ہیں،ساری رات جاگتے ہوں گے،اولیاء اللہ بھی کہیں سوتے ہیں،اس وقت بھی قطعاً جاگ رہے ہوں گے،صاحبِ کشف بھی یقیناً ہوں گے،اس وقت کے مسافروں کی آمد کا حال،اُن پر بالکل روشن ہو گیا ہوگا،آمد کیا معنی دلوں کے اندر تک کے بھید اُن سے کون چھپا سکتا ہے،ضرور اُن پر سب کچھ روشن ہوگا یہ اللہ والے بھی اللہ ہی کی طرح دانا بینا ہوتے ہیں،اور یہ اینٹ چونے کی دیواریں اور مسافتیں،اُن کی غیب میں،نگاہ کی راہ میں حائل تھوڑے ہی

ہوسکتی ہیں۔۔۔۔خوش عقیدگی کے خیالات اسی طرح کے کچھ صحیح اور زیادہ تر غلط و مہمل، دماغ پر اور دل پر مسلط رہے۔اس وقت عقیدے تھے ہی ایسے، ساتھ ہی جسم بھی خوب تھکا ہوا تھا، کچھ سوتے کچھ جاگتے، باقی رات بھی کٹ گئی اور نماز فجر کا ابھی بالکل اول ہی وقت تھا کہ ہم لوگ دیدارِ اشرف کے لئے تیار ہوگئے، مولانا تو خیر اُن کے بڑے پُرانے ملنے والے اور رفیق ہی تھے، دوسرے ساتھی مولوی عبدالباری ندوی بھی چند سال قبل زیارت سے مشرف ہو چکے تھے۔نادیدہ مشتاق بالکل اکیلا ع

اے اسیرانِ قفس، میں نو گرفتاروں میں ہوں

کی تسبیح پڑھنے والا بس یہی ایک نامہ سیاہ تھا!

جس مکان میں حضرت حکیم الامت اُس وقت قیام فرما تھے، اس سے خانقاہ و مسجد کوئی سو گز کے فاصلہ پر ہوگی اور جہاں ہم لوگ رات کو ٹھہرائے گئے تھے وہ حضرت کے کاشانہ سے کوئی دس ہی گز کے فاصلہ پر تھا۔اور حضرت کا راستہ اُسی طرف سے تھا۔میں اشتیاق کا مارا بہت تڑکے گھر سے نکل، عین راستہ پر ذرا کنارے ہٹ کر کھڑا ہو گیا کہ زیارتِ جمال یہیں ہو جائے۔چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ آرزو پوری ہوئی۔ایک بزرگ اُدھر سے گزرے، مُسن لیکن خوش رو، نظریں نیچی، چال متین، نورانی چہرہ، نورانی داڑھی، زیادہ سفید کچھ سیاہ، اور شاید اُسی مناسبت سے لباس بھی خوب سفید برّاق، سر پر نازک سی گول اکہری ٹوپی، جسم پر لمبا کرتا، نازک و نفیس غالباً تنزیب کا تار یکی ابھی کچھ باقی تھی اور ذرا فاصلہ بھی تھا، نگاہ سے نگاہ ملنے کا کوئی موقع نہ تھا اور کہنا چاہیے کہ صرف جھلک ہی دیکھنے میں آئی تھی، اس پر بھی دلکشی، رعنائی، زیبائی بہ حیثیت مجموعی ایسی محسوس ہوئی کہ زبان نہ سہی، دل تو بے اختیار آواز دے ہی اٹھا ع

قربان یک نگاہ تو عمرِ دراز ما

کم و بیش ۱۵ سال اس منظر پر گزر چکے، اور معلوم ہو رہا ہے کہ بات کل کی ہے، دماغ پر نقش اتنا گہرا اور دل پر تاثر اتنا زبردست کم ہی ہوتا ہے

(متفرقات: ۱۲ تا ۱۵)

ایک سوال

گفتگوئیں کن کن مجثوں پر ہوئیں، مقالات وملفوظات کیسے کیسے سننے میں آئے، اب سولہ برس کے بعد بھلا کسے یاد، لیکن ایک سوال وجواب کا نقش دل میں بیٹھا ہوا، حافظہ میں ایسا تازہ کہ گویا کل ہی کا واقعہ ہے. شب کی تنہائی میں، پوچھنے والے نے اپنی سادہ دلی بلکہ سادہ لوحی سے پوچھ لیا کہ ''حضرت کوئی ایسا بھی طریقہ ہے، جس سے زندگی میں اپنا مقام بعد موت منکشف ہوجائے؟ سنا ہے کہ بعض بزرگ اپنے مریدوں کو اُن کے مقام کا مشاہدہ کرادیتے ہیں'' جواب میں ارشاد ہوا کہ ''ایسا ہی سوال ایک بار میں نے اپنی کم عمری میں اپنے استاذ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے کردیا تھا، مولانا نے فرمایا کہ ''اجی توبہ کرو توبہ، ایمان چھوڑ کر کفر کی طلب کررہے ہو، ایمان کے تو یہی معنٰی ہیں کہ حالتِ امید وبیم کے درمیان قائم رہے، انجام کی طرف سے یکسوئی کیسی؟'' اور پھر دو سکنڈ کے وقفہ کے بعد فرمایا یہ مشاہدہ کا طریقہ بھی محض ظنی وتخمینی ہے اعتماد کے قابل ذرا بھی نہیں''۔۔۔۔ ارشاداتِ عالی سے زبان نے سکوت تو اُسی وقت اختیار کرلیا تھا، دل کو سکون بھی بحمداللہ ایک عرصہ کے بعد ہوگیا۔

(ص: ۴۱)

مشیر با تدبیر

انسان کی زندگی نشیب وفراز کا مجموعہ ہے ابھی ذکر وعبادت میں مشغول دیکھئے تو شاید فرشتے رشک کرنے لگیں. ابھی نفس کو نفس کے پنجہ میں گرفتار ملاحظہ کیجئے تو عجب نہیں کہ شیطان بھی پناہ مانگ جائے. اس نشیب وفراز سے بڑے بڑے زور آوروں کو مفر نہیں اچھے اچھے تندرستوں اور پہلوانوں کو چارہ نہیں. بجز انبیاءِ معصوم کے. تو پھر غریب ومسکین وناتوانوں کا کیا ذکر ہے. پشیمانی روز مرہ کا معمول ہے. اتفاق ہی سے کبھی نصیب میں آجاتی ہے. حکیم الامت کے مطب میں نسخے بڑے

سے بڑے بدحال مریض کو ملتے تھے، یہ نہ تھا کہ اس دربار میں صرف ابرار واتقیاء آئیں اور محض ذکر وشغل کی تعلیم لے کر چلے جائیں یا فقط شب بیدار اور تہجد گزار حاضر ہوں اور اوراد و وظائف کی تسبیحات میں اضافہ کر کرا کے واپس ہو جائیں یہاں گنجائش اسی وسعتِ قلب اسی خلق وتلطف کے ساتھ اشقیاء واشرار کی بھی تھی. دھوبی کا کام محض اُجلے کپڑوں کو استری کر دینا اور دھلے دھلائے کپڑوں کی شکن مٹا دینا نہیں بڑے سے بڑے گندے اور کثیف کپڑوں کی غلاظتوں اور کثافتوں کو دور کرنا اور ناپاک کو ازسرِ نو پاک بنانا ہے۔

حج سے آئے ہوئے ابھی دو ہی ڈھائی مہینے ہوئے تھے کہ مکان میں اپنے کمرے سے کچھ چوریاں ہونی شروع ہوئیں. کبھی میز سے کچھ پیسے اٹھ گئے کبھی دونّی چونّی، گھر کے پروردہ دو چھوٹے لڑکے تھے. شبہ ہر پھر کر ان ہی پر ہوتا رہا، زبانی فہمائشیں اور دھمکیاں دونوں بے سود رہیں آخر ایک روز صبح سویرے..... کی رقم اٹھ گئی. غصہ بہت ہی زائد آیا اور کچھ موقع اور کچھ مہلت دینے کے بعد ان لڑکوں کو مارنا شروع کر دیا۔

کمرہ زنانخانہ کے کوٹھے پر تھا خیال بھی نہیں گزرا کہ کوئی بیرونی شخص اس میں آسکتا ہے. لڑکے بے تحاشہ پیٹنا شروع ہوئے کہ عین اسی حالت میں اصل مجرم مع رقم کے گرفتار ہو کر آ گیا. محلہ کا ایک لڑکا تھا ایک زینہ باہر سے بھی تھا بس اسی راستہ سے سب کی آنکھ بچا کر کمرہ میں داخل ہو جاتا تھا اب سخت ندامت شروع ہوئی کہ گھر کے ان دو بچارے لڑکوں پر ناحق ہی اتنی مار پڑی. مار تو واپس آ سکتا نہیں اب بجز توبہ واستغفار کے اور کیا ہو سکتا ہے ندامت اس لئے اور زیادہ کہ آخر میں وہ دونوں بالکل بے قصور نکلے تھے. سارا کچا چٹھا اسی دن اسی وقت مولانا کی خدمت میں لکھ بھیجا کہ اب تلافی وکفارہ کی کیا صورت ہے؟

جواب آیا اور حکیم الامت کی شایانِ شان ''اگر وہ بالغ ہیں تو ان سے دعا کرانا ضروری ہے اور اگر نابالغ ہیں تو کم از کم ان سے اعترافِ غلطی اور اظہارِ ندامت اور ایک معتد بہ مدت تک ان کی دلجوئی اور ان سے فرمائشیں پوچھ پوچھ کر پورا کرنا مناسب ہے اور ان کا قصوروار ہونا آخر میں معلوم

بھی ہو جاتا تب بھی سیاست کے وقت میں تو یہ فعل بلا دلیل شرعی ہو جاتا"

جواب کا یہ آخری جزو خاص مولانا ہی کا حصہ تھا تو بہ واستغفار کی حد تک تو اور بزرگ بھی جاتے لیکن تدارک کی عملی تدبیر میں اور پھر اُن میں یہ باریک بینی اور زرف نگاہی مولانا پر ختم ہوگئی.

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

(ص: ۵۸، ۵۹)

حکیم الامت کا مذاقِ حکمت

عقیدت دینی مذہبی، روحانی رنگ کی جس زور وقوت، جوش وولولہ سے حضرت حکیم الامت کے ساتھ ہوئی، کسی دوسری زندہ ہستی کے ساتھ نہ تھی، لیکن عقیدت سے ذرا ہٹ کر ایک شے محبت بھی ہے، یہ محبت اسی جوش وقوت کے ساتھ محمد علی سے تھی. گویا ایک مقتدا تھے تو دوسرے محبوب اور ان دونوں کے درمیان آپس میں شدید سیاسی اختلافات کی گہری خلیج حائل!۔۔۔ملاقات کیا معنی، موالات ہر قسم کی ترک! غلط فہمیوں اور ان کے طبعی نتیجہ کے طور پر بدگمانیوں کے انبار دونوں طرف لگے ہوئے۔

اس حلقہ میں "وہ" ایک بدعقیدہ نیچری اور ہندو پرست، اس پارٹی میں "یہ" ایک مُلا محض اور گورنمنٹ کے حمایتی! فرق صرف اتنا تھا کہ حکیم الامت بہر حال حکیم الامت تھے گفتگو میں ہر طرح زبان پر قابو اور مخاطب کی دل شکنی کا لحاظ رکھتے، اُدھر محمد علی کے ہاں زبان ضبط کے لفظ سے ناآشنا! اس نیاز مند غریب وناتواں کی جان عجیب کشمکش میں ع

کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

بہر حال دل مضطرب رہتا تھا کہ وقت کے ان دو بڑے مخلص بندوں اور دین وملت کے ان دو زبردست خدمت گزاروں کے درمیان کوئی صورت مصالحت ومفاہمت کی نکالیے، یا کم از کم اتنا تو ہو ہی جائے کہ آپس میں اتنی بے گانگی اور اجنبیت باقی نہ رہے. اور اس کے لئے پہلا عملی قدم یہ تھا کہ ایک مرتبہ ملاقات تو ہو جائے۔۔۔آخر ایک روز موقع پا اور ہمت کر، خدمت مبارک میں

عرض ہی کر دیا کہ ''حضرت ایک مرتبہ ملاقات تو حضرت کے اور مولانا محمد علی کے ہو ہی جانا چاہیے۔ حضرت تو سفر کرنے سے رہے۔ اجازت ہو تو ان ہی کو کبھی اپنے ہمراہ یہاں لے آؤں۔ جیسا آپ کی خدمت میں گستاخ ہوں ویسے ہی انھوں نے بھی منہ لگا رکھا ہے، امید کیا بلکہ یقین ہے کہ عرض رائگاں نہ جائے گی انشاء اللہ کچھ تو غلط فہمیاں دونوں طرف کی ملاقات ہی سے دور ہو جائیں گی''

تواضع وانکسار تو حکیم الامت کا حصہ تھا، میرے معروضہ کے جواب میں ارشاد ہوا کہ ''ارے نہیں، وہ بڑے آدمی ہیں، یہاں کہاں آئیں گے، یہاں آنے کی انھیں دعوت دینا ہرگز مناسب نہیں، انھیں بڑی زحمت ہوگی'' میں اس جواب کے لئے تیار تھا، اور اس پر کب خاموش رہنے والا تھا، عرض کی کہ ''اس سے حضرت کو کیا بحث، لانے والا اور ملانے والا تو میں ہوں۔ رہی اُن کی زحمت و تکلیف تو اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر تکلیف دہ مقامات اور ٹھیٹھ دیہات میں جانے اور ٹھہرنے کے عادی ہیں، اُن کی زحمت کا تو خیال بھی نہ فرمایئے''

ذرا تامل کے بعد فرمایا کہ ''عرصہ ہوا فلاں صاحب نے بھی اس قسم کی تحریک کی تھی۔ پہلے تو میں نے ان کو بھی یہی جواب دیا تھا کہ بڑے آدمی کو یہاں بلانا مناسب نہیں، لیکن ان صاحب کے اصرار پر میں نے جو کہا تھا، وہی آپ کے سامنے دہرائے دیتا ہوں۔ میری تجویز ہے کہ اگر وہ تشریف لائیں تو اتنا وقت بہر حال دیں کہ درمیان میں ایک رات گزار سکیں، پہلے دن وہ تشریف لائیں گے، میں اٹھ کر ان کی تعظیم کروں گا۔ عزت سے اپنے قریب ہی بٹھاؤں گا، لیکن اتنی عنایت وہ کریں کہ مسائل پر وہ اس روز خود گفتگو نہ فرمائیں، بلکہ میرے معروضات خاموشی کے ساتھ بلا قصدِ جواب سُن لیں، آدمی ذہین ہیں، اگر طبیعت فوراً جواب پر آمادہ ہوگئی، تو میری ہر بات کا کچھ نہ کچھ جواب دیتے ہی جائیں گے۔ اور میری کوئی بات بھی قبول نہ کریں گے۔ بس اس وقت صبر و خاموشی سے سن لیں، شب میں آرام کریں اور طبیعت کو خلوئے ذہن کے ساتھ میرے معروضات پر سوچنے کا موقع دیں، پھر دوسرے روز جو چاہیں، جتنی دیر تک چاہیں ارشاد فرمائیں، میں بھی اُسی خاموشی کے ساتھ سننے کو

تیار رہوں گا "۔

واہ رے حکیم الامت! یہ جواب جس میں اتنی مصلحتوں کی رعایت ہو اُن کے سوا کوئی اور دے سکتا تھا؟ ان ہی تجربوں سے تو بار بار کہنا پڑتا ہے کہ عالم وفاضل، ذاکر وشاغل، عابد وزاہد، بزرگ ودرویش ہونا اور چیز ہے اور حکیم ومصلح ہونا کچھ اور!

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تم سے لاکھ سہی، تم مگر کہاں

(ص: ۱۴۴، ۱۴۶، ۱۴۷)

افاداتِ تھانوی

حکیم الامت ایک طرح کی قلمی تصویر بھی ہے حکیم الامت کی مختلف پہلوؤں اور جہتوں سے، لیکن مصور کی اس بے تمیزی کو کیا کیجئے کہ حضرت کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ وہ خود اپنی سیرت کو بھی جا بجا عریاں کرتا جا رہا ہے۔ وہ بچنا چاہے تو بھی بچنے کی کیا صورت ہے! مولانا تو اس کے لئے "مشیر با تدبیر" بھی تھے اور "پیر روشن ضمیر" بھی۔

اے تو افلاطوں وجالینوس ما

ان کے آگے تو نیک و بد، بُرا بھلا، گفتنی وناگفتنی سب ہی کچھ اگل کر رکھ دیتا تھا۔ اب برسوں کے بعد وہ سب دیکھنے اور پڑھنے کے لئے سب کچھ کیسے چھاپ ڈالئے، قلم رُک رُک جاتا ہے، طبیعت ہچکچاتی ہے ہمت کا قدم جواب دے دے جاتا ہے لیکن نہیں مولانا کے افادات کے کسی جزو سے بھی دنیا کو محروم رکھنا ناظرین پر ظلم کرنا ہے۔ ہنس لیجئے، طنز کے ٹھٹھے لگا لیجئے۔ بہر حال آپ بیتی کی ہر ضروری جھلک ان اوراق پر من وعن ہی نقل ہوگی۔

بیوی محبوب وقدیم بیوی چند ہفتے کے لئے اپنے مائکہ گئی ہوئی ہے اور ادھر ان کا فراق خاصہ ستا رہا ہے۔۔۔۔ کیسے احمق اور فطرتِ بشری سے جاہل وہ ناول نویس اور شاعر ہیں جنہوں نے وصل

وفراق کی ساری کیفیتوں کو صرف نوجوانوں یا نئی دامنوں کے ساتھ مخصوص ومحدود رکھا ہے ۔۔۔۔اس عالم میں نیاز نامہ حضرت کو لکھا خط پر تاریخ ۴ر ستمبر ۳۳ء کی ہے لکھنے والے کی عمر متحضر کر لیجئے ۴۰ سال کی۔

م۔''سن کی زیادتی سے اس کیفیت میں کمی نہیں ،اضافہ ہی ہوا ہے .حد یہ ہے کہ چند روز کی مفارقت بھی سخت گراں گزرتی ہے۔

ا۔محبت میں کمی نہیں ہوا کرتی ،جس چیز میں سن کی زیادتی سے کمی ہو جاتی ہے،وہ ہیجانِ نفسانی ہے اور محبت کی خاصیت شراب جیسی ہے۔

م۔اکثر یہ سوچا کرتا ہوں کہ چند روزہ جدائی میں تو دل پر بن جاتی ہے،تو دائمی جدائی کے وقت کیا گزرے گی!

ا۔اول تو مؤمن کی منجانب اللہ اعانت ہوتی ہے .وقوع کے وقت اللہ تعالی کا تعلق ایسا غالب کر دیا جاتا ہے کہ دوسرے تعلقات مغلوب ہو جاتے ہیں گو حزنِ طبعی کسی درجہ میں رہے۔

م۔حد یہ ہے کہ بارہا جنت بھی اس لئے عزیز معلوم ہوئی کہ وہاں ان کا ساتھ بلا اندیشۂ مفارقت رہے گا۔

ا۔شافعیؒ کی سنت پر عمل نصیب ہوا .وہ فرماتے ہیں جب سے مجھ کو معلوم ہوا جنت میں دوستوں سے ملنا نصیب ہوگا مجھ کو جنت کی تمنا ہوگئی .اور راز اس کا یہ ہے کہ جنت لذات ہی کے لئے مقصود ہے .اور لذات میں اعلی لذت محبوب کا قرب ہے .اگر یہ بات نہ ہوتی تو قرآن مجید میں اسباب ترغیب جنت میں یہ نہ فرماتے کہ ھم وازواجھم فی ظلال الخ بس اتنی ترمیم کی ضرورت ہے کہ بجائے اس عبارت کے کہ ''جنت اس لئے عزیز'' یہ عبارت کر دیجئے کہ ''جنت اس لئے بھی عزیز''۔

(ص : ۲۴۰، ۲۴۲)

حکیم الامت کی دعوت

ہمارے یہاں کی بیویاں (غافلات مؤمنات) کی سادہ دلی بھی بعض وقت قابل رشک ہوتی ہے. گھر میں مدت سے تمنا یہ تھی کہ حضور ورسالت کا زمانہ اگر نصیب ہوتا تو فلاں اور فلاں کھانے میں اپنے ہاتھ سے پکا کر پیش کرتی گویا مثنوی کے اس چرواہے سے ملتی ہوئی کہانی جس نے حضرت موسیٰ کے زمانہ میں یہ آرزو کی تھی کہ اللہ تعالیٰ کہیں مل جائیں تو انھیں اپنے خیمہ میں لاکر رکھوں ان کی خدمت میں اپنے یہاں کے جانوروں کا خالص دودھ پیش کروں ان کے پیر دباؤں ،انھیں موزہ پہناؤں وغیرہ بہر حال انھوں نے ایک بار اپنی اس کیفیتِ قلب کا اظہار حضرت کے سامنے کیا تھا. تو حضرت نے فرمایا تھا کہ آرزو بہت مبارک ہے رسول کی خدمت میں حضوری تو اب ممکن نہیں کسی نائب رسول کی خدمت میں وہ ہدیہ پیش کر کے آرزو پوری کی جاسکتی ہے. یہ بات کان میں پڑی ہوئی مدت سے تھی اب کی جو اُن کا تھانہ بھون آنا ہوا، اور گھر کا کارخانہ جما کر بھی ،تو خیال آیا کہ اس سے بہتر موقع اور کب ملے گا موسم بھی معتدل اور خوشگوار ہے، چنانچہ اکتوبر ۲۸ تھی کہ کئی کھانے قورمہ، مرغ، پلاؤ وغیرہ اور کئی قسم کے لوزیات اپنے ہاتھ سے تیار کر کے حضرت کی خدمت میں روانہ کر دیئے. رسید میں یہ پرچہ حسب ذیل موصول ہوا.

''ماشاء اللہ کُل کھانا اتنا بھیجا کہ نصف کے قریب بڑے گھر بھیج دیا بقیہ چھوٹے گھر کے پورے خرچ کے لئے کافی ہوگیا اور پھر بچا رہا حقیقت تو اس کی تألف تھی مگر صورت اس کی تکلف کی ہوگئی جزاکم اللہ تعالیٰ''.

(ص: ۲۹۵، ۲۹۶)

اختلاف سے متعلق تھانوی نقطۂ نظر

زبان کی اجنبیت اور محاورہ کی مغائرت عجب عجب مغالطے پیدا کر دیتی ہے، جو کبھی افسوس

ناک ہوتے ہیں اور کبھی مضحک۔لیکن بہر حال ترجمہ در ترجمہ سے مغالطے پیدا ہونا ناگزیر ہی ہیں۔میرا اصل ترجمہ ظاہر ہے کہ عربی سے انگریزی میں تھا،اب انگریزی سے جب اُسے اردو میں منتقل کیا تو غلطی ہوئی کہ ترجمہ ہی کیا،عربی کے مطالب کو مستقلاً اردو میں نہ لے لیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ جو حاشیے انگریزی لفظ پر تھے،وہ بھی اردو کے لفظ سے متعلق سمجھ لئے گئے اپنی اس غلطی کا احساس اُس وقت ہوا جب مولانا کی تنقید پڑھ لی۔اگر براہِ راست عربی سے اردو میں مطالب لئے گئے ہوتے،تو متعدد مقامات پر مولانا کے ایرادات اُن عبارتوں پر واقع ہی نہ ہوتے۔۔۔۔مولانا کی اصلاحوں کا بیشتر حصہ تو میں نے قبول کرلیا اور اُن کے مطابق ترمیم بھی کردی۔البتہ چار پانچ مقامات پر مزید گفتگو کی ضرورت محسوس ہوئی۔انھیں پیش کردیا،اور مولانا کے ہاں سے اُن کا جواب بھی آیا۔

حضرت کی زبان سے دو کلمے بڑے ہی کام کے نکلے کہ نفسِ اختلاف مضر نہیں،مضر صرف وہ اختلاف ہے جس کا اثر عقائد پر پڑتا ہے۔۔۔۔قدیم طرز کے علماء جن کے ہاں بالعموم تحقیق کے معنی صرف تقلیدِ سلف کے ہیں اور جو سمجھتے ہیں کہ حق منحصر و محصور ہو کر رہ گیا ہے صرف اقوالِ متقدمین کے اندر،وہ اگر متأخرین کو اتنی بھی آزادی و یدیں،تو بہت ہی غنیمت ہے۔۔۔۔کیا مصیبت ہے! ''وسعتِ نظر'' جب آتی ہے تو بے قیدی کے مترادف ہو کر،اور احتیاط کا عزم جب پیدا ہوتا ہے،تو جمود و تنگ نظری کا جامہ پہن کر!کوئی صاحب کیسے ہی بڑے فاضل،محقق اور امامِ عصر سہی،بہر حال یہ تو نہیں ہوسکتا کہ مطالبِ قرآن سے متعلق آخری حرف صرف اُن ہی کے دماغ سے نکل سکے۔اور اُن کے بعد کے آنے والے محض اس جُرم میں کہ وہ متأخر ہیں،قرآن پر لکھنے لکھانے کے حق سے محروم کردیے جائیں۔

(ص:۳۸۹)

ایک نادر شاہی تحفہ

ایک روز بے خبر بیٹھا ہوا تھا کہ یک بیک حضرت کے ایک خادم ایک بند ڈبیا اور ایک دستی والا نامہ لے کر پہنچے۔ڈبیا کے اندر کیا تھا،یہ اس والا نامہ کے پڑھنے ہی سے ظاہر ہوجائے گا۔

"مکرمی السلام علیکم

میرا جی چاہتا تھا کہ میری کوئی یادگار آپ کے پاس رہے۔ اتفاق سے مجھ کو ایک تسبیح یاد آ گئی جس پر میں نے مدتوں پڑھا ہے۔ مگر وزنی ہونے کے سبب اب دوسری ہلکی تسبیح پر پڑھنے لگا ہوں، جو ہر وقت ہاتھ میں نہیں رہ سکتی تو گویا وہ رکھی ہوئی تسبیح میری حاجت سے زائد ہے۔ وہ پیش کرتا ہوں قبول فرمالیجئے۔ اس تسبیح میں ایک اور برکت بھی ہے۔ یہ امیر عبدالرحمٰن خان نے اپنے کمانڈر انچیف کو دی تھی انھوں نے میرے ایک پیر بھائی کو جو ان کے مہمان تھے دی۔ انھوں نے مجھ کو دی۔ یہ سنگِ مقصور کہلاتا ہے۔ سنا ہے اس وقت نایاب ہے واللہ اعلم۔

اشرف علی ۲۰ر شعبان ۵۵ھ"

۲۰ر شعبان ۱۳۵۵ھ جنتری میں دیکھا، تو ۵ر نومبر ۱۹۳۶ء کے مطابق نکلی ۔۔۔۔ غالب نے "خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال" میں تو ایک شاعرانہ مضمون باندھا ہے۔ یہاں "یہ خدا کی دین" اپنے حق میں شاعری نہیں، حقیقت تھی۔ حضرت کا عطیہ کچھ بھی ہوتا ایک تبرک ہی ہوتا۔ چہ جائیکہ ذکرِ حق کی تسبیح! اور وہ بھی ایسی جس کو حضرت کی متبرک انگلیاں ایک مدت تک مس کر چکی تھیں۔ پھر غازی و مجاہد امیر عبدالرحمٰن خان والیٔ افغانستان (متوفی ۱۹۰۱ء) اور ان کے غازی سپہ سالار کی دہری دہری نسبتیں! نور علی نور نہیں، مجموعۂ انوار!

(ص : ۳۹۴)

حضرت کی لکھنؤ تشریف آوری

حضرت کی تشریف آوری لکھنؤ میں! ۔۔۔۔ دل اس خبر پر کیسے یقین لائے۔ حضرت اور لکھنؤ! کیا صورت اب سفر کی رہ گئی تھی۔ حضرت تو اپنے عذراتِ جسمانی کی بنا پر معمولی اور ہلکا سا سفر دو ایک اسٹیشنوں کا بھی ترک کر چکے تھے، چہ جائیکہ اتنا بڑا سفر! مژدہ وجد میں لانے کے لئے کافی تھا۔

لیکن دل کہاں دل بھر خوش ہو پایا! ذہن سفر کے ساتھ ہی سببِ سفر کی طرف بھی معاً پہونچ گیا. بیماری کی کوئی ایسی ہی مجبور کن نوبت آ گئی ہوگی، جب تو اتنا بڑا سفر اختیار کیا جارہا ہے. تھانہ بھون اور شہر سہارنپور کی طبّی کوششیں ختم و ناکام ہوچکیں، جب تو لکھنؤ کی ضرورت پڑ رہی ہے! لکھنؤ کے مشہور خاندان جھنوائی ٹولہ کے مشہور حاذق طبیب تھانہ بھون جا کر علاج کر چکے ہیں. یہ صورت ناکافی اور کارگر نہ ہوئی، جب تو حضرت کے بہ نفس نفیس لکھنؤ آنے اور طویل قیام کرنے کی ٹھہری!۔۔۔۔ خیالات واوہام کے اس ہجوم نے مسرت کو پوری طرح پھلنے پھولنے کا موقع ہی کب دیا! مور پَر پھیلا کر ناچنے ہی جارہا تھا کہ نظر اپنے پیروں پر پڑ گئی. طبیعت جزبز ہو کر رہ گئی! غالب کا مصرعہ یاد پڑ گیا ع

آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا یوں!

حضرت اپنے پروگرام کے مطابق وارد لکھنؤ ہوئے، زیارت جتنی دیر کی بھی رہی، حسب معمول دل کو پوری تسکین دینے والی رہی. اور اگلے ہفتہ پھر سفر کی ٹھہری. اور دل بے اختیار چاہا کہ اب کی کچھ ہدیہ بھی ضرور پیش کیا جائے لکھنؤ آنا گویا ہمارے جوارِ وطن میں آنا ہوا، خدمتِ مہمان کا حق کسی ادنیٰ درجہ میں تو ادا ہو۔۔۔۔ انتظامات حضرت کی اس علالت کے زمانہ میں بھی قابلِ دید تھے. نشست کے اوقات مقرر، ہر آنے والے کے لئے حصولِ اجازت کی ضرورت. چھوٹی بڑی ہر شے میں ایک قاعدہ اور انتظام۔۔۔۔ ۲۳/اگست کو عریضہ اجازت کے لئے لکھا۔

''م۔ انشاء اللہ نرسوں جمعہ کے روز پھر حاضر خدمت ہونے کی اجازت چاہتا ہوں۔

ا۔ اللہ تعالیٰ بہ خوشی لائے۔

م۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ کے چرواہے کی طرح تمنا تو ہم دونوں (میاں بیوی) کی یہ تھی کہ شرفِ قدوم سے اپنے سیاہ خانہ کو منور کرتے، لیکن یہ تو نصیب ہی میں نہیں۔

ا۔ نصیب تو مشترک ہے. میں بھی یہی حسرت کر سکتا ہوں. مگر اپنے دل کو سمجھاتا ہوں کہ جب تجھ کو تحمل نہیں تو اس نصیب پر راضی رہنا چاہیے۔

م۔اس لئے وہیں اگر کچھ قدرے قلیل ہدایا مثلاً انڈے یا گھی کی شکل میں پیش ہوتے رہیں تو ازراہِ کرم انھیں شرفِ قبول سے محروم نہ رکھا جائے۔

ا۔تبرک ہونے کی حیثیت سے خود ہی مانگ لینا عجب نہ تھا، اب تو بے مانگے ملتا ہے"

(ص : ۳۳۳)

حضرت کا ضعفِ جسمانی

۱۹۳۹ء دیکھتے دیکھتے آ گیا مہینہ غالباً فروری کا ٹھیک یاد نہیں، بہرحال جاڑے ختم ہو رہے ہیں، اور میں تھانہ بھون دو چار روز کے لئے آیا ہوا ہوں۔ قیام اب کی مولوی شبیر علی صاحب کے مکان پر نہیں، بلکہ خانقاہ کے بالائی مہمان خانہ میں ہے۔ ایک روز دوپہر کا وقت ہے۔ صبح کی مجلس برخواست ہو چکی ہے۔ دیکھتا کیا ہوں کہ حضرت صحنِ مسجد و خانقاہ میں حوض کے اوپر پتھر کے فرش پر دھوپ میں لیٹے ہوئے ہیں۔ میں کوٹھے سے ٹکٹکی لگائے اسی طرف دیکھ رہا ہوں۔ جسم مبارک پر صرف کرتا ہے۔ جس سے لاغری پوری طرح نمایاں ہو رہی ہے۔ اور میرا دل اندر سے ابلتا چلا آ رہا ہے! ہا، یہ جسم کتنا گھل چکا ہے، اور اب کب تک ساتھ دے گا! ابھی چند ہی سال اُدھر کی بات ہے کہ گرمیوں کے موسم میں حضرت کرتا اتارے ہوئے کھڑے تھے۔ ناف سے اوپر کا جسم کھلا ہوا، اُس وقت ماشاء اللہ جسم کتنا توانا و تنومند تھا۔ چند ہی برس کی مدت میں کتنا تغیر ہو گیا! پہچاننا مشکل ہو گیا!۔۔۔۔ پہلے بار بار یہ سوچا کرتا تھا کہ حضرت کی وفات کسی مرض سے ہو گی کیونکر؟ اور ایسے صحتِ مجسم و احتیاطِ مجسم کے لئے اُس کی نوبت ہی کبھی کیسے آنے پائے گی؟ اب قدرت یہ منظر دکھا رہی ہے۔ اب یہ سوچنے لگا ہوں کہ اتنا لاغر و نزار جسم زندہ و سلامت کب تک رہ سکے گا؟ کیا قدرت کے کرشمے ہیں، اور کیسی شانِ حکمت کی انقلاب آفرینیاں ہیں۔

دیر تک یہی منظر دیکھتا اور دل میں یہی سوچ سوچ کر اندر ہی اندر روتا رہا۔ ضعفِ پیری کے آثار اب پوری طرح نمایاں تھے۔ دھوپ میں مضمحل ہو کر استراحت فرماتے اور کسی خادم سے جسم کو دبواتے ہوئے پہلی بار دیکھا، اور یہی دیکھنا آخری بار کا بھی تھا! خیال نہیں کہ اب کی تھانہ بھون کتنا

ٹھہرنا ہوا۔ بہر حال اب کی جب لوٹا، تو بہت ہی مغموم و دل شکستہ۔

(ص: ۵۳۷)

۱۹۴۰ء کے شروع مارچ میں پھر تھانہ بھون کا قصد کیا۔ اطلاعی کارڈ کے جواب میں کارڈ پر صرف یہ شعر لکھا ہوا ۲۴ر فروری کو موصول ہوا۔

''رواقِ منظرِ چشمِ من آشیانہ تست
کرم نما فرود آ کہ خانہ خانۂ تست''

اب یہ خیال نہیں آتا کہ کب گیا اور کب واپس آیا! اتنا یاد ہے کہ اب کی حضرت کے ضعف و اضمحلال کو دیکھ کر بہت ہی زیادہ مغموم و دلگیر واپس آیا۔ اور یہ منظر تو قیامت کا تھا کہ نماز بجائے حضرت کے کوئی اور صاحب پڑھا رہے ہیں۔ گھر آ کر شدتِ تأثر میں حضرت کے لئے بہت بہت دعائیں کیں ۔۔۔۔ ۱۱ر مارچ کو یہ عریضہ لکھا، آج تک یاد ہے کہ قلم لکھنے میں مشغول تھا اور آنکھیں آنسو بہانے میں۔

''اللہ تعالیٰ آپ کی عمر میں اور صحت و قوت میں بہت بہت برکت عطا فرمائے۔ اب کی حاضری تھانہ بھون کے وقت بہت ہی متأثر رہا۔ نماز جماعت کے وقت محراب کو جناب والا سے خالی پا کر دل کی عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ مسجد سونی معلوم ہوتی تھی۔ جماعت کا لطف ہی گیا۔ مجلس میں جتنی دیر بیٹھتا، نظر بار بار آپ کی انگلیوں پر جمی رہتی کہ اللہ اکبر! دین کی کیسی کیسی خدمات یہی انگلیاں انجام دے چکی ہیں۔ بہت ضبط سے کام لیا۔ ہر دفعہ بے اختیار یہی جی چاہتا تھا کہ آپ کے ہاتھ کو لے کر خوب آنکھوں سے ملتا اور ہونٹوں سے لگاتا جاؤں اور دل کھول کر روتا جاؤں۔ محض اس تصور سے طبیعت میں ایک کیف پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ان سطور کی تحریر کے وقت بھی شبیہ مبارک چشمِ تصور کے سامنے ہے اور آنکھوں سے آنسو مسلسل رواں ہیں۔

صحت اور درازیٔ عمر کے لئے تو دعا بارہا کی ہے لیکن ایک روز اسی
حالت میں یاد آیا کہ اپنی عمر کا کچھ حصہ پیش کر دینا بھی بعض روایات میں آیا
ہے۔ اسی وقت اپنے دل کو ٹٹولا تو ایک سال کی مدت کے لئے اپنے کو بہ خوشی
آمادہ پایا۔ اور عقلاً تو یہ سمجھتا ہوں کہ ایک سال کیا معنٰی، دس بیس بھی پیش
کر دوں جب بھی کم ہی ہے، اور حقِ اخلاص ادا کرنے کو بالکل ناکافی''

اپنا اپنا ظرف اور اپنی اپنی بساط ہوتی ہے۔ خواجہ صاحب وغیرہ حضرت کے عاشقوں کو دیکھا کرتا تھا کہ چہرۂ مبارک کی طرف برابر نظر جمائے دیکھے جا رہے ہیں، اور اس سے لطف حاصل کر رہے ہیں اپنی اتنی ہمت ہی نہ ہوتی۔ اپنی نظر تو بس حضرت کی انگلیوں ہی تک رہتی، اور ان ہی کو بے اختیار چومنے اور آنکھوں سے لگانے کو جی چاہا کرتا۔۔۔۔ مدینہ منورہ جب حاضری ہوئی تھی، تو مواجہ مبارک کی طرف جانے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ ہمیشہ پائیں ہی کی طرف جاتا اور وہیں دور سے ادب کے ساتھ عرض و معروض کرنے کو جی چاہتا کرتا۔

بہر حال اس عریضہ کا جواب آیا، تو حسبِ دستور توڑ توڑ کر نمبر وار نہیں، بلکہ ایک مسلسل عبارت میں

''سارا خط پڑھا۔ کس کس کلمہ کا کیا جواب دوں۔ بجز اس کے کہ یہ
دعا کروں۔ باقی مجھ میں تو اس کی بھی اہلیت نہیں کہ کسی صالح کا مخاطب بنوں
چہ جائیکہ محبوب بنوں۔ تو ایسی حالت میں میرے ساتھ ایسا برتاؤ اس شعر کا مظہر
ہے ؎

ادائے حق محبت عنایتے ز دوست
وگرنہ عاشقِ مسکین بہ ہیچ خور سندست

باقی بجز دعا و طلبِ دعا کے کیا عرض کروں''

(ص: ۵۴۳، ۵۴۴)

مریض طبیب کی عیادت کو

قدرت کے انتظامات بھی عجیب عجیب ہوتے ہیں۔ نادان انسان کو دنگ وحیران بنادینے کے لئے کافی لکھنؤ محلہ جھنوائی ٹولہ کے ایک نامور اور خاندانی طبیب شفاء الملک حکیم حاجی عبدالحمید تھے۔ سُرخ وسفید، توانا وتندرست، حضرت کے مخلص ومعتقد۔ چند سال ہوئے جب حضرت علیل ہوئے تھے، تو یہ خود زحمتِ سفر اُٹھا کر تھانہ بھون پہنچے تھے۔ اپنے شہر میں موٹر کے عادی، وہاں یہ سواریاں کہاں۔ اسٹیشن شروع آبادی تک کھیتیوں کی پکڈنڈی پر اور پھر حضرت کے مکان تک کئی فرلانگ پیدل گئے۔ اب مشیت کی کارفرمائی دیکھئے کہ ''مسیحائے وقت'' حکیم صاحب خود بیمار پڑے۔ پہلے ذیابطیس ہوا اور پھر دق! اور دق کے جو شدائد ہوتے ہیں، ہر جاننے والے پر روشن ہیں۔ ان ہی شدائد کی ایک ایک منزل سے ہفتوں نہیں مہینوں گزرتے رہے۔ جسم کے اعتبار سے گھلتے رہے اور روح کے لحاظ سے دُھلتے رہے۔ اُن کے عین اشتدادِ مرض کا زمانہ تھا، کہ حضرت کا لکھنؤ آنا ہوا۔ اور خود ان کی عیادت کو تشریف لے گئے ۔۔۔۔ کتنا پُر اثر اور عبرتناک تھا یہ منظر۔ ابھی کل تک جو طبیب بستر مرگ پر تھا حقیر سے حقیر مریض کی طرح بے بس اور بے کس۔ اور حضرت جو کل تک اُسی کے مریض وزیرِ علاج تھے۔ آج اُس کے سرِ بالیں تلقین کررہے ہیں، اُس کی ٹوٹی ہوئی آس بندھا رہے ہیں، جنت کی بشارتیں دے رہے ہیں، تسنیم وکوثر کا مشتاق بنا رہے ہیں! آہ، خوش قسمت حکیم عبدالحمید!

بہ چہ رفتہ باشد زجہاں نیاز مندے
کہ بہ وقتِ جان سپردن بہ سرش رسیدہ باشی

طبیب بے چارے کو کیا خبر تھی کہ سفر تھانہ بھون میں جو تھوڑی بہت مادی زحمتیں اٹھانی پڑی تھیں، اُس کا معاوضہ، اور اتنی جلد اسی عالمِ ناسوت میں برزخ سے قبل ہی مل جائے گا!

حضرت تو شرافت کے بادشاہ تھے۔ تسکین وتسلی ہی کی باتیں نہیں فرمائیں، بلکہ اُسی وقت اپنے حلقۂ بیعت میں لے لیا۔۔۔۔ اللہ اللہ! دوسروں کے لئے کتنی شرطیں، کتنی قیدیں لگی ہوئی تھیں، یہ حکیم صاحب طالب ہونے کی جگہ، اس وقت عین مطلوب ہو گئے۔ لفظاً مرید، معناً مراد!

(ص: ۵۵۸)

سفرِ آخرت

آغاز کا انجام شروع ہو گیا۔۔۔۔ ہر آغاز کے لئے ایک انجام، ہر پیدائش کے لئے موت، ہر بچپن کے لئے بڑھاپا، اس دارِ ناپائیدار کا دستور ہی یہ رکھ دیا گیا ہے۔ سورج اب ڈوبنے کو تھا۔ شفق پھیل چلی تھی۔ عین اسی زمانہ میں، اردو کے مشہور شاعر جگر مراد آبادی نے ایک فارسی غزل پانچ شعروں کی ''زتشنہ لبی خوشم'' ''بوالعجبی خوشم'' کی زمین میں لکھ کر، اور پانچوں شعر رنگین و پُر بہار حضرت کی خدمت میں بھیجی۔ حضرت باضابطہ شاعر تو پہلے بھی نہ تھے، اور اب اس وقت تو ضعف و انحطاط نے جسم و دماغ پر بالکل ہی قابو پالیا تھا، اس پر بھی جو شعر جواب میں لکھ کر بھیجا، وہ اپنی نظیر آپ تھا

نہ بہ نثرِ ناثرے بدل، نہ بہ نظمِ شاعرِ خوش غزل
بہ غلامیٔ شہ عزوجل و بہ عاشقیٔ نبی خوشم!

مئی اور جون کے مہینے تو خیر جوں توں کٹ گئے، جولائی سے پھر بڑی تشویشناک خبریں آنے لگیں لیکن مسلسل نہیں، بلکہ افاقہ کے درمیانی وقفوں کے ساتھ۔ اور آہ، انسان کی فریب خوردگی کہ طبیعت ان ہی عارضی اور وقتی افاقوں کا سہارا ڈھونڈتی رہی! علاج بجز وہ دوسرے معالجوں کے لکھنؤ کے نامور اور حاذق طبیب حکیم عبدالمعید شفاء الملک کا تھا، جن کے علاج سے پہلے صحت ہو چکی تھی لیکن آہ، کہ طبیب کے بس میں موت کا علاج ہے کب؟ مقابلہ وہ مرض کا کر سکتا ہے، وہ بھی اذنِ الٰہی سے، نہ کہ خود قضائے الٰہی کا۔۔۔ خُدام نے آخر آخر مشورہ ایک بار پھر لکھنؤ لانے کا کیا، لیکن اس مشورہ پر عمل کا وقت گذر چکا تھا۔ شدید ضعف و نقاہت سے نقل و حرکت ناممکن تھی چہ جائیکہ اتنا طویل سفر۔۔۔۔ تقدیر کے مقابلہ میں تدبیر کبھی بھی پیش پا سکی ہے؟ خدام خاص ایک آدھ نہیں، کئی ایک پہلے ہی رخصت ہو چکے تھے۔ وصل صاحب کا وصال تو اسی پچھلے اکتوبر میں ہوا تھا۔ اور حکیم محمد مصطفیٰ صاحب بجنوری میرٹھی کی وفات دو چار سال قبل۔۔۔۔ بڑے حاکم صاحب کہیں کوچ کرنے والے ہوتے ہیں، تو خدام ادب کی لین ڈوری پیشوائی کے انتظامات کے لئے پہلے ہی روانہ ہو چکی ہوتی ہے۔

(ص: ۶۰۱)

فصل دوم

محمد علی ۔ ذاتی ڈائری کے چند ورق

کامریڈ کا شہرہ آفاق ایڈیٹر

محمد علی وسیع ڈرائنگ روم کے صدر میں تشریف فرما، سامنے ایک لمبی میز، دو رویہ کرسیوں کی قطار، میز کے ایک سمت میں ایک جوان، رعنا، تندرست و تنومند، کوئی ۳۳، ۳۴، ۳۴ سال کی عمر کا، اعلیٰ درجہ کے انگریزی سوٹ میں ملبوس بیٹھا ہوا. داڑھی تاڑی منڈھی ہوئی بھونچھے ذرا گھنی اور نوکیلی، ذہانت بشرہ سے ٹپکتی ہوئی، شوخی و ذکاوت چہرہ سے برستی ہوئی ممبروں میں ایک سے ایک قابل و فاضل، اس کے بڑے اور مخدوم بھی، لیکن نظریں بار بار اُسی کی طرف اٹھ رہی ہیں اور کان اُسی کی آواز پر لگے ہوئے، وہ بولا تو سب سننے لگے. وہ اٹھا تو کوئی ہنسا اور کوئی بگڑا، مگر متوجہ سب ہی ہو گئے ۔۔۔۔ یہ تھا کامریڈ کا شہرہ آفاق ایڈیٹر محمد علی، رامپور کا باشندہ اور علی گڈھ اور آکسفورڈ کا گریجویٹ. جس کی جادو نگاری اور انگریزی انشاء پردازی کا سکہ اس وقت بھی دلوں پر بیٹھ چکا تھا، حالانکہ کامریڈ کو نکلے ہوئے، ابھی سال ہی ڈیڑھ سال کا عرصہ ہوا تھا. اور اردو روزنامہ ہمدرد کا ابھی وجود بھی نہ تھا۔

میں نے لکھنؤ کیننگ کالج سے بی، اے کی ڈگری ابھی ابھی لی تھی. سن ۲۰ سال کا لکھنؤ میں رہتے کئی سال گذر چکے تھے، پھر بھی قصباتی خُو بُو باقی تھی. اور فطری شرمیلا پن اس پر مستزاد. لوگوں سے ملنے بات چیت کرنے میں شرم اور جھیپ غالب. اپنے بعض بڑے بھائیوں کے ساتھ بڑی ہمت کر کے راجہ صاحب کے ہاں پہنچا تھا، اور تماشائیوں کی مختصر سی صف میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا کہ میں سب کو دیکھوں اور کوئی مجھے نہ دیکھے. محمد علی کا نام ۸۔۱۰ سال سے کان میں پڑ رہا تھا. اور کامریڈ کا

مطالعہ ہر ہفتہ انگریزی ادب کی چاٹ میں تو گویا فرض ہی ہو گیا تھا شوقِ دیدار آج پہلی بار پورا ہوا۔

دن کی میٹنگ اگر خواص کی مجلس تھی، تو شام کی یہ تقریب ایک دربارِ عام. اسلامی ہند کے چنے ہوئے لیڈر اور مشاہیر عوام کے درمیان ایک جگہ مجتمع، آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ ہنس بول رہے ہیں. لیکن بارات کا دولہا اس وقت بھی کامریڈ کا ایڈیٹر ہی. سج دھج صبح سے اُس وقت بالکل مختلف. بجائے ہیٹ اور انگریزی سوٹ کے، سر پر ترچھی رامپوری پگڑی جسم پر باریک ونفیس انگرکھا، چوڑی دار تنگ موری کا پاجامہ، دلی کا جوتا۔۔۔۔ محمد علی اپنی زندگی کے اس دور میں بھی صاحبیت میں یکسر غرق نہیں ہوئے تھے. معاشرت میں فی الجملہ مشرقیت واسلامیت اُس وقت بھی ملحوظ رکھتے تھے ۔۔۔۔ ملنے اور بات چیت کرنے کی ہمت تو کیا ہوتی، دل اسی سے نہال ہوا جارہا تھا کہ اتنے قریب سے دیکھنے اور گفتگو سننے کا موقع تو مل گیا. کامریڈ کی سحر نگاری سے مسلمان تو مسلمان، کالج کے ہندو لڑکے بھی متأثر تھے. اُن کے سامنے محمد علی کا نام لے کر فخر کرنے کے لیے یہ کچھ کم تھا! ع

اُن کے اِک جاں نثار ہم بھی ہیں !

(حصہ اول ص:۲)

محمد علی سے پہلی ملاقات

۱۹۱۴ء میں برسات کا موسم تھا، اور رمضان کا مہینہ، جب اپنی خالص ذاتی غرض لے کر دہلی پہنچا. اسٹیشن سے سیدھا دفتر ہمدرد، کوچۂ چیلان کے لیے تانگہ کیا. باقاعدہ ملاقات کا یہ پہلا موقع تھا. وقت کی ایک مشہور شخصیت کے سامنے جاتے ہوئے، وہ بھی تمامتر اپنی ایک غرض لے کر، حجاب اور خوف دامنگیر ہونا ایک حد تک طبعی تھا، اور پھر مجھ جیسے شرمیلے اور ملاقات چور نوجوان کے لیے۔

صبح سویرے کا وقت تھا، اور رمضان کا مہینہ. میں فرنگی الحاد میں غرق، مجھے اُس زمانہ میں رمضان سے کیا واسطہ ہوسکتا تھا. ہمدرد کامریڈ کے دفتر کوچۂ چیلان میں ایک خاصی عالیشان عمارت میں تھے. ٹھیک اس کے مقابل، سڑک کے اس پار ایک مکان اوسط درجہ کی حیثیت کا اور تھا محمد علی صاحب اس میں رہتے تھے اور وہیں میری حاضری ہوئی. کمرہ معمولی سا، اور بجز ایک مختصر سیتل پاٹی کے

ہر قسم کے فرنیچر سے مُعرّا۔نہ میز نہ کرسی، نہ کوچ، نہ صوفے۔اس جانماز سیتل پاٹی پر ٹھیٹھ ہندوستانی قسم کا کرتا، پاجام پہنے ہوئے کامریڈ کا ایڈیٹر بیٹھا ہوا، اور چند سخت مذہبی قسم کے مسلمانوں سے جامع مسجد کے انتظامات فرش وشامیانہ سے متعلق بحث وگفتگو میں سرگرم!۔۔۔۔میں دور سے کامریڈ کا پڑھنے والا اور محمد علی کی آکسفورڈ کی ڈگری سے مرعوب، اس سادگی اور اس اسلامیت اور مشرقیت کے منظر کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا! اپنی انگریزیت پر قیاس کرکے سمجھ رہا تھا کہ مکان اور مکین دونوں صاحبیت اور فرنگیت کا مکمل نمونہ ہوں گے!

وہ لوگ رخصت ہوئے اور اب میری پیشی ہوئی محبت اور تپاک کا برتاؤ پہلے ہی لمحہ شروع ہوگیا۔زرا دیر کے بعد اٹھے، اور سڑک پار کرکے، بالا خانہ پر اپنے دفتر کے کمرہ میں لائے۔یہاں کی شان دوسری تھی ڈرائنگ روم، کچھ انگریزی اور کچھ ترکی وضع کے بیش قیمت فرنیچر سے آراستہ۔کوچ اور کرسیاں گدّے اور قالین۔اور دیوار تصویروں سے مرصع! ۱۴ء کا محمد علی اب ۲۱ء کا محمد علی نہ تھا۔ بڑھی ہوئی سیاسی آزاد خیالی اور ترکوں سے (جن کے کاندھوں پر اُس وقت تک خلافتِ اسلامیہ کا بھی بار تھا) روز افزوں ہمدردی دیکھ کر انگریز کھٹک گئے تھے۔اور اب محمد علی کی وہ پوچھ گوچھ، وہ قدر ومنزلت اعلیٰ حکام میں باقی نہیں رہی تھی۔دیر تک تفصیل کے ساتھ اپنی معذوریاں بیان کرتے رہے۔گویا میرا کام نہ نکال سکنے پر شرمندہ ومحجوب تھے۔اور باتیں بھی اِدھر اُدھر کی خوب کیں۔سیاسیات ادبیات، لطائف وظرائف سبھی کچھ۔

(۱۷،۱۶،۱۵)

ایک جامع اور ہمہ گیر شخصیت

محمد علی غضب کے مہمان نواز اور دوست پرست تھے۔اچھا کھانے کے بڑے شوقین، لیکن اس سے بھی زیادہ دوسروں کو اچھا کھلانے کے حریص، قرض لیں یا کسی سے مانگ کر لائیں، بہر حال دوستوں کو کھلانا، اور خوب ہی کھلانا فرض۔جو ان کے مہمان نہ بھی ہوتے، انھیں بھی پکڑ پکڑ کر لاتے، اور ٹھونس ٹھونس کر انھیں کھلاتے ضرور۔بذلہ سنج ایسے کہ روتے ہوؤں کو بے ہنسائے نہ رہیں۔

رقیق القلب اتنے کہ بات بات پر، بلکہ بلا بات کے بھی، آنسوؤں کے دریا بہادیں. شخصیت ایسی جامع و ہمہ گیر کہ دین، تاریخ، ادب، سیاست، شعر ہر موضوع سے یکساں دلچسپی، اور سب پر یکساں تیار، طبیعت ہر وقت حاضر. کوئی تذکرہ کسی قسم کا چھڑ جائے، تو بس اب ختم ہونے ہی کو نہیں آتا. ان محفل طرازیوں سے بھی جب فرصت ملتی، تو دور افتادہ دوستوں، عزیزوں کی یاد آتی، اور ان کے آئے ہوئے خطوں کے جواب کی طرف توجہ ہوتی. اور وہی زندہ شخصیت خطوط میں جھلکتی رہی. ہر خط ایک پند نامہ، لیکن خشک ذرہ بھر بھی نہیں، بلکہ حد کمال تک دلکش و شگفتہ۔

(ص : ۲۳)

محمد علی کا تبصرہ

۱۵ء ختم ہو رہا تھا کہ نفسیات اجتماعی کے ایک مبحث پر اپنی کتاب انگریزی میں ''سائیکلو جی آف لیڈر شپ'' کے عنوان سے لندن میں، اُس وقت کے ایک نامور پبلشر ٹی، فشر انون کے اہتمام سے نکلی اور دل نے اس پر بڑا ہی فخر محسوس کیا۔ ۱۶ء میں کچھ کاپیاں ہندوستان پہنچیں. اخبارات نے برطانیہ اور ہندوستان دونوں میں خوب خوب ریویو کیے. بعض بڑے مداحانہ، اکثر نے بین بین، اور ایک دو نے مخالفانہ. میں نے بعض اقتباسات اشتہار میں چھپوا کر کچھ لوگوں کے پاس بھجوا دیے. اور ان میں ایک امتیازی نام چھندواڑہ کے نظر بند محمد علی کا بھی تھا. دل نے کہا کہ ''داد اگر ان سے نہ ملی تو کچھ نہ ہوا. اشتہار دیکھ کتاب یقیناً منگوائیں گے اور داد بھی دل کھول کر یقیناً دیں گے'' اشتہار گیا، اور چند ہفتوں بعد اس کا اثر اس عنایت نامہ کی شکل میں ظاہر ہوا.

''چھندواڑہ۔ سی پی ۲۳ رمئی ۱۹۱۶ء

مکرم۔

کوئی مہینہ بھر ہوتا ہے کہ انگریزی کتاب ''سائیکلو جی آف لیڈر شپ'' کا ایک اشتہار موصول ہوا تھا. لفافہ کے اندر سوا اس اشتہار کے اور کچھ نہ تھا. لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اشتہار آپ کے ایما سے یا کم از کم آپ کے علم میں میرے

پاس روانہ کیا گیا تھا۔ اگر کتاب آپ ہی کی تصنیف ہے تو یقیناً دلآویز ہوگی۔
اب بجائے مشتہر صاحب کے براہ راست آپ ہی کو لکھتا ہوں کہ کتاب کی
ایک کاپی میرے نام وی پی بھجوا دیجئے''

۲۳ رمئی ۱۶ء کے خط میں محمد علی نے میری کتاب طلب فرمائی تھی۔ سوال قدرۃً یہ ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ اس فرمائش کا حشر کیا ہوا؟ حشر یہ ہوا کہ کتاب پہلی ڈاک سے ہدیۃً ان کی خدمت میں بھجوادی گئی۔ اور جب جون کا مہینہ بھی گزر گیا اور کتاب پر کوئی رائے موصول نہ ہوئی، تو دل میں ایک بے چینی سی رہنے لگی۔ کیا کتاب نہیں پہونچی؟ پہونچی مگر اتنی ناپسند ہوئی کہ اس پر اظہار رائے سے گریز کیا گیا؟ یا اور کوئی بات ہوئی؟ غرض طرح طرح کے وسوسے دل میں آنے لگے، اور آخر شروع جولائی میں ایک تقاضا کا خط لکھا، جس میں یہ فقرہ بھی تھا کہ ''آپ ملک کے ان گنے چنے چند افراد میں ہیں جن کی رائے اور تبصرہ کی میں قدر کرتا ہوں'' جواب آیا۔

کتاب پر تبصرے بہتوں نے کیے تھے، اچھے اچھے پیشہ ور تبصرہ نگاروں نے بھی محمد علی کا تبصرہ سب سے بڑھ چڑھ کر رہا۔ کوئی دوسرا ریویو نہ اتنا جامع نہ اتنا مفصل، نہ اتنا گہرا، نہ اتنا مبصرانہ، نہ اتنا پُر مغز نہ اتنا مخلصانہ۔ نہ بیجا مداحی نہ خواہ مخواہ کی تنقیص۔ اور فنی پہلوؤں سے قطع نظر کیجئے، تو تبلیغ کا انجکشن شروع سے آخر تک جا بجا موجود!۔۔۔۔ خاکسار مؤلف کا اپنے دورِ الحاد و بے دینی میں سابقہ اور گہرا سابقہ، بہت سے مسلمان دوستوں اور صاحبِ علم و فضل مسلمانوں کے ساتھ رہا کیا۔ ان میں سے تقریباً سب کو افراط یا تفریط ہی میں مبتلا پایا۔ اکثر تو ایسے ملے، جو دوستی اور مروت کے غلو میں میرے ہر عیب کو ہنر ہی بنا کر پیش کرتے بلکہ شاید خود بھی یہی سمجھتے رہے۔ اور میری صریح بیہودگیوں پر پردہ ہی ڈالتے رہے۔ اور کچھ ایسے بھی نکلے، جو اس کے برعکس سرتاپا شعلہ و شرر تھے۔ جمیتِ دین کی زیادتی اور حرارتِ مذہبی کی افراط۔ انھیں میرے ساتھ انصاف میں مانع ہوتی رہتی۔ اتنوں میں کہنا چاہیے کہ ایک محمد علی ہی ایسے تھے، جو ایک طرف میرے الحاد و بیدینی پر برابر مجھے ٹوکتے رہے، اور دوسری طرف دوسری حیثیتوں سے میری حوصلہ افزائی اور دلجوئی میں بھی لگے رہے۔

(ص: ۱۹، ۳۹، ۴۰)

جامعہ ملیہ

۲۰ء کی آخری سہ ماہی تھی، جب علی برادران کا حملہ اس وقت علی گڈھ پر ہوا، محمد علی کو اپنے علی گڈھ سے محبت نہیں، عشق تھا۔ خدا معلوم دل پر کیا گزر رہی ہوگی، جب اس ''بتکدہ'' کو توڑ رہے تھے۔ ایک اسلام کے نام کے آگے سب کچھ بھلائے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ علی گڈھ کو بھی!۔۔۔۔ امرتسر کی ایک تقریر میں خود زار و قطار رو رو کر، اور دوسروں کو رلا رلا کر کہہ بھی تو چکے تھے کہ

''کعبۃ اللہ کی حفاظت ہمارا سب سے بڑا اور آخری فریضہ ہے۔ اس کے بچانے کے لیے ہمیں اپنی جانیں قربان کرنا ہیں۔ جب اس پر حملہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں، اور ہمارا قبلہ ہی خطرہ میں پڑ رہا ہے، تو ہم سب یہاں سے ہجرت کر کے گڑتے پڑتے اس کی حفاظت کو جا پہنچیں گے۔ اپنے گھروں کو ویران کر دیں گے، تاکہ اللہ کا گھر محفوظ رہے۔ یہاں کی مسجدوں میں قفل ڈال جائیں گے کہ وہ بڑی مسجد آباد رہے۔ یہاں کی عبادت گاہیں سونی کر جائیں گے کہ اس معبدِ اعظم کی رونق اور بہار میں نہ فرق پڑنے پائے''

بہر حال مہم علی گڈھ کے معاً محمد علی ایک سرکاری اثر سے آزاد ''جامعہ ملیہ اسلامیہ'' کی طرح ڈالنے میں لگ گئے۔ خود بڑی محنت سے اُس کا نصاب بنایا، اُس پر مضامین لکھے، اُن کی نشر و اشاعت کی، کلاس قائم کیے اور خود ہی پڑھائی بھی شروع کر دی۔۔۔۔ جامعہ ملیہ آج بھی ماشاء اللہ قائم ہی نہیں، بلکہ بڑی اچھی حالت میں ہے۔ لیکن یہ یاد دلاتے رہنے کی ضرورت آج بھی باقی ہے کہ اُس کے اصل بانی محمد علی ہی تھے۔ جیسے علی گڈھ کے اصل بانی سرسید۔ رفیقوں، شریکوں کی رفاقت و شرکت سے اصل بانی کی شخصیت مشتبہ نہ ہو جانی چاہیے۔

سال کی یہ آخری سہ ماہی محمد علی کے لیے بڑی آزمایش کی سہ ماہی تھی۔ علی گڈھ کی تخریب

اور جامعہ ملیہ کی تعمیر، دونوں کے کام ساتھ ساتھ. فرصت بالکل عنقا. خدا جانے کھانے اور سونے کے اوقات کہاں سے نکالتے تھے. بہر حال جنوری ۲۱ء میں جب زرادم میں دم آیا تو ۱۳ر جنوری کو مجھے جامعہ آنے کی دعوت دی.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''۱۲ر جنوری ۱۹۲۱ء

قومی مسلم یونیورسٹی. علیگڈھ

برادرم! السلام علیکم

جی چاہتا ہے کہ آپ کو یہاں دیکھوں، مگر علم سے زیادہ مذہب عزیز ہے. اور ایک مسلمان کے مذہب کے متعلق اگر قومی یونیورسٹی میں بھی شک وشبہ کیا جائے گا تو ہم یہ کہکر پیچھا نہیں چھڑا سکتے کہ ہر شخص کا مذہب اس کا ذاتی معاملہ ہے. جس سے دار العلوم کو کوئی تعلق نہیں۔

آپ کا قدیم نیازمند

محمد علی''

عبارت مکرر ملاحظہ کر لی جائے۔

اللہ اللہ! محمد علی کو مجھ سے جس درجہ محبت وشفقت تھی، اوپر کے صفحات سے ظاہر ہو چکی ہے. حسن ظن بھی مجھ سے (میری کتاب پڑھ کر) اتنا رکھتے ہیں کہ جامعہ میں فلسفہ اردو میں پڑھانے کا بہترین معلم میں ہی ثابت ہو سکتا ہوں. اس ذاتی تعلق اور اتنی خوش ظنی، دونوں کے باوجود لکھتے ہیں، تو یہ کہ ''مگر علم سے زیادہ مذہب عزیز ہے''!۔۔۔۔۔ محمد علی کے سوا کوئی دوسرا ہوتا، تو بھلا اس موقع پر یہ فقرہ لکھتا، یا کوئی اور شرط اس قسم کی لگاتا؟

میں بحمد اللہ اس وقت تک الحاد ودہریت کے چکر سے پوری طرح نجات پا چکا تھا، اور پختہ مسلم ہو چکا تھا. مولانا کو ان تفصیلات کی اطلاع نہ تھی. وہ اپنی پرانی واقفیت کی بنا پر اب تک میرے عقائد کو ناقابل اطمنان سمجھ رہے تھے. اسلام اور اللہ کے دین کا یہ گہرا درد ان ہی کے دل میں تھا کہ مجھے بلا رہے

ہیں، میرا ہونا وہاں دل سے بھی چاہ رہے ہیں، اور اس کو جامعہ کے حق میں مفید بھی پا رہے ہیں، لیکن اس سب کے باوجود اس کے زرا بھی روادار نہیں کہ ایک ملی درسگاہ میں الحاد و دہریت کے جراثیم لیے ہوئے میں قدم رکھوں۔۔۔۔ محمد علی کی سیرت کا سارا نچوڑ اس ایک مختصر سے خط، بلکہ اس کے ایک فقرہ کے اندر آ گیا۔ دین کے لیے اتنی صلابت اچھے اچھے علماء میں بھی اس دور میں کمتر ہی دیکھنے میں آئی ہے۔ نہیں کہ محمد علی کو اپنے دوستوں، عزیزوں، رفیقوں سے محبت نہ ہو۔ محبت میں کمی کیسی، اور زیادتی ہی رہتی تھی۔ لیکن اللہ اور اس کے دین کی محبت ان سب محبتوں پر حاکم اور غالب۔ والذین اٰمنوا اشد حبا للہ کی عملی تفسیر۔

کہتے ہیں کہ علی برادران کی ان ہی والہانہ خدا پرستیوں کو دیکھ کر ایک بار ان کے مرشد مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ نے فرمادیا تھا کہ ''یہ دونوں بھائی اگر عہدِ نبوت میں ہوتے تو ان کی مسلسل فدا کاریاں تو ایسی ہیں کہ جیسے حضور انور ﷺ نے دس مخصوص صحابیوں کے نام ایک صحبت میں لے لے کر انھیں جنت کی بشارت دیدی تھی، ایسے ہی ان دونوں کے لیے بھی کیا عجب ہے کہ نام لے کر ارشاد ہوجاتا کہ محمد علی فی الجنۃ، شوکت علی فی الجنۃ'۔۔۔۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ مرشد کا یہ قول حقیقت سے خالی اور نری تخیل پر مبنی تھا؟

(سفر قاس: ۹۱ تا ۹۵)

''جان بیٹا خلافت پہ دیدو''

نظم محمد علی کی والدہ ماجدہ کی زبان سے ادا کی گئی تھی۔ شام کا وقت ہے۔ امین آباد کے چوراہے پر یہی صدائے ''خاتون'' دو دو پیسہ کو بک رہی ہے۔ خدا جانے کتنی تعداد میں روز نکلتی رہتی ہے۔ لڑکے درد انگیز آواز سے گا گا کر پڑھ رہے ہیں، اکثر نواب مرزا شوق کی مثنوی ''زہر عشق'' کی دھن میں۔ صدہا راہگیر کھڑے سن رہے ہیں۔ پولیس کی لاری آئی۔ بہتوں کو پکڑ پکڑ کر جیل خانہ پہنچادیا۔ روز سہ پہر سے لے کر رات گئے تک یہی تماشا رہتا ہے۔ جیل جانا ایک ہنسی کھیل ہوگیا ہے۔ پہلے جس کے نام سے لوگ تھراتے تھے، سہمے جاتے تھے، اب خود اس کا جھیل لے جانا ایک مذاق سا معلوم ہونے لگا ہے

۔۔۔۔محمد علی جب کانگریس میں آئے تو قوم کی قوم کو ساتھ لے کر آئے محمد علی جب جیل گئے تو یہی آگ قوم پر گلزار ہوگئی سیکڑوں نہیں ہزاروں مسلمان، اچھے اچھے عالی خاندان وذی مرتبہ، گریجویٹ اور وکیل، بیرسٹر اور ڈاکٹر، عالم وفاضل، ہنسی خوشی خلافت کا کلمہ پڑھتے ہوئے جیل بھرتے چلے گئے!

عین اسی زمانہ میں محمد علی کراچی سے بیجاپور جیل منتقل کئے گئے تھے. کسی اسٹیشن پر کسی انگریزی اخبار کے ایک منچلے وقائع نگار نے انھیں جالیا، اور سوال تحریک ترک موالات کی موجودہ حالت کے متعلق کر دیا محمد علی نے جواب میں کہا کہ ''تحریک کا حال تو وہ لوگ جانیں، جو باہر ہیں، میں تو اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں اپنے لیے بعد رسول مقبول ﷺ کے گاندھی جی ہی کے احکام کی متابعت ضروری سمجھتا ہوں''، لکھنؤ سے اجمیر جاتے وقت ایک بڑے اسٹیشن پر جو انگریزی اخبار میں نے خریدا، اتفاق سے اس میں یہی مکالمہ درج تھا مولانا عبدالباریؒ نے اسے پڑھوا کر سنا. ان کے ایک رفیق سفر وحضر جو اس وقت بھی ہمراہ تھے بول اٹھے کہ ''بعد رسول کے نام اپنے مرشد کا لینا تھا، یہ گاندھی جی کیا معنی'' مولانا نے برجستہ جواب دیا کہ ''مرشد کوئی ذاتی ہستی تو رکھتا نہیں، وہ رسول ہی کا نائب ہوتا ہے جب رسول کا نام لے دیا تو رسول کے نائب بھی اسی میں شامل ہوگئے. گاندھی جی سیاسی لیڈر کی حیثیت سے ایک الگ ومستقل حیثیت رکھتے ہیں، نام ان ہی کا لینا مناسب تھا''

(ص:۱۰۶،۱۰۷)

داغ جگر

محمد علی کی زندگی ہی آزمایشوں کے لیے وقف تھی. اب کی بار ایک بڑی ہی کڑی آزمایش سے گزرنا پڑا. اولاد میں لڑکا کوئی تھا نہیں، لڑکیاں چار تھیں. چاروں بڑی دلاری، بڑی چہیتی. اور کیسے نہ ہوتیں. جو دوسروں کی اولاد کے لیے بیتاب ہو ہو جاتا تھا، وہ خود اپنے کلیجہ کے ٹکڑوں کے پیچھے کیسا کچھ دیوانہ نہ رہتا! منجھلی صاحبزادی آمنہ اور بھی زیادہ عزیز تھیں محمد علی کے تازہ امتحان کے لیے انتخاب ان ہی کا ہوا. جو تین ہی چار سال کی بیاہی ہوئی تھیں. ادھر باپ بیجاپور جیل میں بند ہوئے، اُدھر یہ بیمار پڑیں. مرض بالآخر دق تجویز ہوا! خبر پہنچی، تو دل مسوس کر، کلیجہ تھام کر رہ گئے. باہر ہوتے تو دوا علاج کی

دوڑ دھوپ میں زمین آسمان ایک کر دیتے. اس وقت اتنا بس بھی نہیں کہ ایک نظر آ کر دیکھ ہی لیں.

ایک نالۂ موزوں میں اپنے پروردگار سے فریاد کی. پوری نظم اسی زمانہ میں، روزنامہ خلافت میں "پیام محبس" کے عنوان سے نکل بھی گئی تھی مخاطب براہ راست مدقوق بیٹی سے ہے۔

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں
امتحان سخت سہی پر دل مؤمن ہی وہ کیا
جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں

ساتویں شعر میں کلیجہ پر پتھر رکھ کر لاڈلی اور نازوں کی پالی بیٹی کو مخاطب کرتے ہیں، لیکن نظریں شاید عرش والے مالک و مولی ہی کی طرف اٹھی ہوئی ہیں ۔

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو
نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

دسویں شعر میں عبدیت پھر مقام تفویض و توکل پر غالب آ گئی۔۔۔۔ بندہ اپنے مالک کے قدموں پر گرا ہوا گڑگڑ رہا ہے ۔

تیری قدرت سے خدا یا تری رحمت نہیں کم
آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں

آگے قصۂ یعقوب و یوسف علیہما السلام کی تلمیحات ہیں اور اس کے بعد چودھویں شعر میں پھر دعا کے لے ہاتھ اٹھاتے ہیں ۔

میری اولاد کو بھی مجھ سے ملا دے یارب
تو ہی کہہ دے تری رحمت کا یہ دستور نہیں

(ص:۱۱۵،۱۱۶)

''انبساطِ عید دیدن روئے تو''

اگست ۲۳ء کی آخری تاریخیں تھیں، جب قید فرنگ سے رہائی ہوئی. بیجاپور جیل سے چپ چپاتے جھانسی لائے گئے، اور یہاں اسٹیشن پر چھوڑ دیے گئے. دل ملاقات، زیارت، دست بوسی، قدم بوسی، سب کے لیے بیتاب تھا، مہینوں سے بیتاب ہو رہا تھا. محمد علی کی علمی عظمت، ان کی ادبی قابلیت کا اعتراف، ان کے دماغی کمالات کا احترام، دل میں ہمیشہ سے تھا. ان سے دینی و روحانی عقیدت اب پیدا ہوئی تھی اور جب سے ان کی نعتیہ غزل (''تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں'') کان میں پڑی تھی، اس وقت سے تو عقیدت کا ایک بے پناہ طوفان سینہ میں جوش مار رہا تھا. اور دل بار بار کہہ رہا تھا، کہ مرشد بنانے کے قابل کوئی ہے تو یہی، یہ شخص تو اس قابل ہے کہ بیعت اس کے ہاتھ پر کی جائے. دوست احباب سے ذکر آیا تو کچھ نے ہاں میں ہاں ملائی. لیکن ایک گروہ نے اسے حیرت کے کانوں سے سنا۔

عین اسی اگست میں اپنی خانگی زندگی میں ایک واقعہ سخت قسم کا پیش آ گیا. اپنے ایک حقیقی چچیرے بھائی اور سگے بہنوئی، جو برتاؤ میں بالکل مثل حقیقی بھائی کے تھے، اور پیشہ کے اعتبار سے ڈاکٹر تھے، مرض دق میں چند ہفتہ بیمار رہ کر لکھنؤ میں وفات پا گئے. گوناگوں تعلقات کی بنا پر اس وفات کا صدمہ بہت ہی زاید ہوا. میری مالی کفالت بھی اس وقت تک ایک خاصی حد تک وہی مرحوم کرتے رہتے تھے. یہ سب کچھ تھا، لیکن محمد علی کی رہائی کی خوشخبری ایسی نہ تھی جو دل کو باغ باغ نہ کر دیتی. اس مسرت نے اس صدمہ کو بھی ایک حد تک دبا دیا، اور دل بے چین رہنے لگا کہ کس طرح اڑ کر محمد علی تک پہنچوں۔۔۔۔ روایتیں معتبر اور پیہم پہنچ رہی تھی کہ جیل سے نورِ مجسم ہو کر نکلے ہیں. سُمندِ شوق کے حق میں یہ تازیانہ تھا لیکن لوگوں نے یہ بھی کہا، اور سچ کہا کہ دہلی میں بھلا محمد علی کو بات کرنے کی بھی فرصت کہاں ہوگی۔۔۔۔ لڑکی کو دیکھنے بھوالی پہاڑ پر آخر جلدی ہی جائیں گے. اطمنان کی ملاقات پھر اگر کہیں ہو سکتی ہے تو وہیں، اس کے قبل کہیں اور نہیں۔

رائے معقول تھی، مانتے ہی اور صبر کرتے ہی بنی، لیکن مراسلت کو کون روک سکتا تھا. جواب آنے کا تو کوئی امکان ہی نہ تھا. اور اس کا انتظار تھا ہی کس کو، مقصود تو خط لکھ کر اپنے ہی دل کو تسکین دے لینا تھی. قیس عامری کو لوگوں نے دیکھا کہ کاغذ، قلم، روشنائی کے بغیر بادیۂ عرب کی ریت پر انگلیوں سے قلم کا کام لے رہا ہے. لوگوں نے کہا، یہ کیا ہے؟ دیوانہ نے جواب دیا ؎

گفت مشقِ نام لیلیٰ می کنم
خاطرخود را تسلی می دہم

(ص:۱۱۹، ۱۲۰)

ہوتے ہوتے شروع نومبر کی کوئی تاریخ آ گئی. جب میں بھوالی روانہ ہو سکا. راستہ کے شوق واشتیاق کا کیا پوچھنا. کہنا چاہیے کہ مرید مرشد کی خدمت میں حاضر ہو رہا تھا. اس سے قبل کی ساری ملاقاتیں ''دورِ جاہلیت'' کی تھیں. پوری طرح تجدید اسلام کے بعد نیاز یہ پہلی بار حاصل ہو رہا تھا. اور خود محمد علی بھی مجاہدوں پر مجاہدے، اختیاری اور اضطراری، دونوں طرح کے کر کر کے، خوب ہی دل دہل چکے، نکھر چکے تھے. آنے کی اطلاع پہلے سے دیدی تھی.

۲ بج چکے تھے، لیکن مولانا جمعہ پڑھ کر اب تک واپس نہیں آئے تھے. مسجد فاصلہ پر تھی، پھر پہاڑ کے راستے اور وہ بھی بالکل اجنبی. جانے کی ہمت نہ ہوئی، ورنہ جی بے اختیار ہو رہا تھا کہ مسجد ہی جا پہنچوں. ایک ایک منٹ بھاری گزر رہا تھا. مولانا کے اور عزیز موجود تھے، وہ بیچارے اپنی والی ہر طرح خاطر مدارات کرتے رہے۔۔۔۔ ہوتے ہوتے ۴ بجنے کو آ گئے، جب کہیں مولانا واپس آئے. اشتیاق میں دو ایک فرلانگ استقبال کے لیے بڑھ گیا تھا. دیکھا کہ تشریف لا رہے ہیں. چہرہ کی نورانیت کا اب کیا کہنا. لیکن تنہا نہیں ہیں، مسجد کے امام صاحب بھی ساتھ ساتھ ہیں اور ان سے مولانا کسی سرگرم مباحثہ میں منہمک ہیں میری طرف سرے سے دیکھ ہی نہیں رہے ہیں۔۔۔۔ جتنا میں ان کے ملنے کا مشتاق تھا، اُسی قدر وہ خود بھی میرے مشتاق تھے. لیکن بحث کے انہماک میں کیسی دوستی اور کس کی ملاقات. دس منٹ، بیس منٹ، خدا جانے کتنی دیر ہوگئی. میں منتظر کھڑا ہوں، اور وہ مجھے دیکھ

چکنے کے بعد اسی سرگرمی کے ساتھ بحث میں جٹے ہوئے۔ جی بھر کر تقریر و استدلال سے فارغ ہو لیے جب جا کر میری طرف ملتفت ہوئے۔ اُس وقت کے التفات کا نقشہ کیا بیان ہو! معلوم ہوتا تھا کہ محبت وشفقت کے دریا کا بند ٹوٹ گیا ہے، اور چشمہ ہے کہ ابلا پڑتا ہے!

(ص:۱۲۴،۱۲۵)

محمد علی کی ایمانی جرأت

محمد علی اب کانگریس کے صدر منتخب تھے، اور ہر طرف ہاتھوں ہاتھ لیے جا رہے تھے۔ شام کو بعد مغرب امین الدولہ پارک میں عظیم الشان پبلک جلسہ منعقد ہوا۔

لکھنؤ کے لیڈر، اور لکھنؤ میونسپل بورڈ کے صدر، چودھری خلیق الزماں صدر جلسہ ہوئے۔ بی اماں مرحومہ بھی غالباً موجود تھیں۔ جلسہ میں ہندو بھی اچھی بڑی تعداد میں تھے۔ لیکن مسلمان تو اتنی بڑی تعداد میں عرصہ ہی کے بعد جمع ہوئے تھے۔ خلافت وترک موالات کا جوش وخروش ۲۲ء میں ختم ہو چکا تھا اور اب تو ۲۳ء قریب ختم تھا۔ سارے ملک میں شدھی اور سنگھٹن کی آگ بھڑک چکی تھی، اور مسلمان ان کے مقابلہ میں تبلیغ وتنظیم کی انجمنیں قائم کر چکے تھے۔ خاص شہر لکھنؤ اور گرد ونواح میں تلخ وناگوار باہمی قضیے پیش آ چکے تھے۔ ایک شریر قسم کے ہندو نے ہینڈ بل تقسیم کرنے شروع کر دیے کہ یہ محمد علی وہی ہیں جنھوں نے جامع مسجد علی گڈھ میں ایک تازہ تقریر میں کہا ہے کہ میں ایک فاجر وفاسق مسلمان کو بھی گاندھی جی پر ترجیح دیتا ہوں۔ ایسا شخص بھلا کانگریس کا صدر کیسے مانا جا سکتا ہے؟۔۔۔۔ اشتہار خاصہ اشتعال انگیز تھا۔ عین جلسہ میں کسی نے صدر جلسہ کو مخاطب کر کے یہی سوال بھی کر دیا۔ مولانا کی پر زور تقریر جاری تھی۔ پنڈت موتی لال نہرو نے کوئی بیان داخلۂ کونسل کی حمایت ووکالت میں دیا تھا۔ اسی بیان کی دھجیاں مولانا ایک ایک کر کے اڑا رہے تھے کہ اس شخص نے یہ سوال کر دیا۔

احباب ومخلصین کچھ پریشان سے ہو گئے۔ بہتوں نے کہا کہ سوال بالکل بے محل ہے۔ خود صدر جلسہ نے سائل کو خاموش ہو جانے اور بیٹھ جانے کا حکم دیا لیکن ہزاروں کے اس مجمع میں ایک شخص ایسا بھی تھا جو سوال سے مطلق نہ گھبرایا، وہ دل میں پورا اطمنان رکھے ہوئے تھا، اور وہ شخص محمد علی

تھا!۔۔۔صدر نے سائل سے پکار کر کہا ''آپ بیٹھ جایئے۔ میں سوال کی اجازت نہیں دیتا'' معاً محمد علی چمک کر بولے ''مگر میں اجازت دیتا ہوں، آپ اپنے سوال کا جواب لیجیے'' اور اس کے بعد یوں گویا ہوئے:-

''علی گڈھ میں میں نے جو کچھ کہا اسے دُہرانے کے لیے یہاں بھی تیار ہوں اور ہر جگہ۔ گاندھ جی اس وقت آزادیٔ ملک کے لیے جو خدمات انجام دے رہے ہیں ان کے لحاظ سے مہاتما جی وہ اپنا نظیر نہیں رکھتے۔ اور جہاں تک ان کی بیش بہا خدماتِ وطن کا تعلق ہے میں مہاتما جی کو اپنے ہی سے افضل نہیں بلکہ اپنی والدہ ماجدہ سے بھی زیادہ قابل تعظیم اور اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے بھی بڑھ کر قابل احترام سمجھتا ہوں۔ لیکن ایک دوسری حیثیت اعتقاد و ایمان کی ہے۔ میں عقیدۃً مسلمان ہوں۔ اور اس کے معنی یہ ہیں کہ عقیدۂ اسلام کو اور تمام عقائد سے کہیں بہتر و اعلیٰ سمجھتا ہوں۔ اور اس لحاظ سے، یعنی جہاں تک عقائد ایمانی کا تعلق ہے، میں اکیلے گاندھی جی ہی سے نہیں، تمام ہندوؤں، تمام عیسائیوں، تمام سکوں کے مجموعہ سے ہر ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان، ہر بدعمل سے بدعمل کلمہ گو کو بہتر سمجھتا ہوں۔ اسلام کی افضلیت میرا جزوِ ایمان ہے۔ اگر آج میں خدانخواستہ اس کا قائل نہ رہوں جس طرح میں اپنے عقیدہ کی افضلیت کا قائل ہوں، اسی طرح ہر مذہب والا اپنے عقیدہ کو افضل تسلیم کرتا ہے۔ کیا پنڈت مدن موہن مالی جی اپنے عقیدہ کو سب سے افضل خیال نہیں کرتے''؟

یہ الفاظ آج کاغذ پر چھپے ہوئے، وہ بھی اتنی مدت کے بعد، ممکن ہے کہ کچھ زیادہ مؤثر نہ معلوم ہوں، لیکن جس وقت ہزاروں کے مجمع میں ایک زندہ شخصیت کی زبان سے، پورے جوش و خروش کے ساتھ، آواز کے مناسب اتار چڑھاؤ کے ساتھ ادا ہوئے ہیں، تو معلوم ہوتا تھا، کہ بجلی کی

ایک روسی دوڑ گئی ہے۔ دشمن سناٹے میں آ گئے۔ دوستوں کے چہرے چمک اٹھے۔ خوب تالیاں بجیں، خوب تائید و مسرت کے نعرے بلند ہوئے۔

(ص:۱۳۳،۱۳۴،۱۳۵)

محمد علی خاتون منزل میں

اب کی محمد علی کا قیام لکھنؤ میں کئی دن رہا۔ آئے بھی تو بہت عرصہ کے بعد تھے۔ ایک روز میں نے اپنی قیام گاہ لکھنؤ (خاتون منزل) پر ناشتہ کی دعوت دی۔۔۔۔ مولانا جب تشریف لائے ہیں، اور کمرہ میں داخل ہونے کو قدم رکھ رہے ہیں تو معاً میرے اس ملازم پر نظر پڑی جسے ابھی بریلی اسٹیشن پر اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلا چکے تھے، پہچان کر بھرے مجمع میں اس سے بغلگیر ہو گئے۔ وہ بیچارہ باغ باغ اور دوسرے دنگ و حیران۔

دارالعلوم ندوہ کا کتب خانہ اُس وقت تک خاتون منزل کے گویا پڑوس ہی میں تھا۔ میرے ایک عزیز جوانمرگ دوست مولانا عبدالرحمٰن نگرامی مرحوم استاد دارالعلوم ایسے موقعوں کی تاک میں رہتے تھے۔ طلبۂ ندوہ کی طرف سے ایک مختصر اور ہلکی دعوت چاے کی انھوں نے بھی کتب خانہ کی عمارت میں کر دی۔ دیر بہت ہو چکی تھی، دوپہر ہونے کو تھی۔ اور چاے کا اب کوئی وقت رہا نہ تھا۔ پھر بھی میزبانوں کے اصرار سے مولانا کو دعوت قبول کرنی ہی پڑی۔ ادھر چاے نوشی شروع ہوئی، ادھر نگرامی مرحوم نے ایک مختصر تقریر اس مضمون کی کر دی کہ سیاسی تقریریں تو اور بہت سے موقعوں پر ہم سن لیں گے۔ اس وقت ہم طلبۂ ندوہ یہ چاہتے ہیں کہ ''تنہائی کی راتوں میں'' ''خلوت کی ملاقاتیں'' جو آپ کے نصیب میں آئی ہیں، ان سے ہمیں مستفید فرمایا جائے۔ نگرامی مرحوم بڑے گہرے دیندار اور صالح نوجوان تھے مولانا ان کی تقریر سے متأثر بھی ہوئے اور محظوظ بھی۔ لیکن اس فرمایش کے جواب میں فرمایا ''میرے عزیز بھائی، تم بھی ایک شاعر کی بات کا اعتبار کر بیٹھے۔ شاعر تو اپنی خیالی دنیا میں کیا کچھ کہہ جاتا ہے۔ اس سے ان چیزوں کا ثبوت عملی دنیا میں طلب کرنا تو بڑی زیادتی ہے''۔۔۔۔ اب اللہ جانے شاعری اس نعتیہ غزل میں زیادہ تھی یا اس نثری جواب میں!

خیر، یہ باتیں تو لطائف کے تحت میں بھی رکھی جاسکتی ہیں، باقی اصل حقیقت مجھ سے راز کے طور پر میرے اصرار پر ایک بار وہیں بھوالی کے قیام میں ارشاد ہوئی تھی کہ خواب میں زیارتیں تو نصیب میں نہ آئیں، البتہ ایک بار بیجاپور میں دوپہر کے وقت نیم بیداری کی حالت میں ایک ہلکا اور دھندلا سا پرتوِ جمال محمدی آناً فاناً نظر آیا تھا۔۔۔۔ اللہ اکبر! جس جمال کی زیارت خواب میں اچھے اچھے نصیب ور اپنے لیے خوش نصیبی سمجھیں، اس کے دیدار سے نیم بیداری ہی میں مشرف ہوجانا کوئی معمولی درجہ کی خوش بختی اور نصیبہ وری ہے!

(ص:۱۳۶،۱۳۸)

''ہو رہے ہیں جو رہفت افلاک کے''

وسط دسمبر کا زمانہ ہے۔ تاریخ غالباً ۱۵۔ سردی اور پھر دہلی کی سردی۔ کامریڈ کو ۱۹ر کو نکلنا ہے۔ اور محمد علی کو بیلگام (علاقہ بمبئی) دیر سے دیر کر کے ۱۸ر کو روانہ ہوجانا ہے۔۔۔۔۔ لیجئے ۱۵ر کا دن بھی تمام ہوگیا اور شام ہوگئی۔ کمپیوزیٹر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اور پریس کے مینیجر صاحب اور ہیڈ پروف ریڈر دونوں بھنائے ہوئے ہیں کہ پرچہ وقت پر آخر کیسے نکل سکے گا۔ شام ہوئی۔ رات کے ۹ بج گئے ساڑھے نو ہوگئے۔ دسمبر کی رات، معلوم ہوتا تھا آدھی رات ہوگئی۔ میں تو اِدھر آرام سے سونے لیٹا، ادھر دیکھا کہ ذیابطیس کے مریض اور کمزور محمد علی خوب گرم اونی چسٹر پہن پہنا دفتر کے کمرہ میں آبیٹھے۔ اور سکریٹری کی پکار ہوئی کہ ٹائپ رائٹر لے کر حاضر ہوں۔ اب محمد علی تھے اور اس غریب رامپوری ٹائپسٹ سکریٹری کی جان!

مضامین بولنے شروع کیے۔ دس بجے، گیارہ بج گئے، بارہ ہوگئے۔ شب بیدار ایڈیٹر پر آمد مضامین کی ہو رہی تھی، اور غریب سکریٹری پر نیند کی۔ بیچارہ کب تک جاگتا، کہیں اونگھ گیا۔ بس پھر کیا تھا، لگی غضب کی ڈانٹ پڑنے کہ ''شرم نہیں آتی۔ مجھے دیکھو کہ بیمار ہوں، سن میں تم سے دوگنا ہوں، اتنی محنت کر رہا ہوں، تم تندرست ہو، جوان ہو، چند گھنٹہ بھی نہیں جاگ سکتے، چلو ہٹو، میں خود اپنے ہاتھ سے کام کرلوں گا، تمہاری مدد کا محتاج نہیں ہوں۔ غرض وہ صاحب بیچارہ نکالے گئے۔ اسٹاف کے ایک

دوسرے صاحب جو اتفاق سے دفتر ہی کے ایک حصہ میں سو رہے تھے، یہ آواز سن کر جاگ پڑے تھے، وہ از راہِ انسانیت خود اٹھ کر آئے، اور انھوں نے کام پورا کیا۔ صبح ۵، ساڑھے پانچ بجے میری آنکھ کھلی۔ نمازِ فجر میں ابھی دیر تھی۔ آسمان پر بالکل اندھیرا چھایا ہوا تھا، دیکھتا کیا ہوں کہ ایڈیٹر کا مریڈ کا کمرہ بجلی کے قمقمہ سے روشن اور عین اسی وقت مولانا آفس کے کمرہ سے اٹھ کر اپنی خوابگاہ کی طرف جاتے دکھائی دیئے۔ راستہ میرے ہی کمرہ میں ہو کر تھا۔ میں نے حیرت سے پوچھا کہ ''خیریت؟ ایسے ناوقت آفس کی طرف سے کہاں؟'' معلوم ہوا کہ ساری رات کام کر کے اب یہ اللہ کا بندہ اٹھا ہے!۔۔۔۔ یہ شب بیداریاں، بدپرہیزیاں، بے اعتدالیاں اچھے تندرست جوانوں کی صحت غارت کر دینے کو کافی تھیں، چہ جائیکہ ادھیڑ سن کا آدمی، فکروں، پریشانیوں سے دبا ہوا، صدیوں سے کچلا ہوا، بیماریوں سے لدا ہوا!

واقعہ کوئی استثنائی نہیں۔ مثال محض نمونہ کے طور پر بیان ہوئی۔۔۔۔ اسلامی ہند کا یہ محبوب لیڈر آہستہ آہستہ لیکن قطعی طور پر خودکشی کی طرف قدم بڑھائے جا رہا تھا!

(ص: ۱۸۲،۱۸۱)

کامریڈ کا خاتمہ

۲۵ء جوں توں ختم ہوا۔ فروری ۲۶ء میں محمد علی سخت علیل ہوئے۔ ذیابطیس تو تھا ہی۔ اب جسم میں پھوڑے جابجا نکل آئے۔ اور بالکل صاحبِ فراش ہو کر گر پڑے۔ میں نے دہلی جا کر دیکھا تو چلنا پھرنا الگ رہا، اٹھنا بیٹھنا دشوار تھا۔ کامریڈ چار ہفتوں سے قرض چلا آ رہا تھا۔ چار نمبروں کا مجموعہ ایک نمبر ۲۲ر جنوری کی تاریخ ڈال کر تو خیر کسی طرح نکال ہی دیا۔ اس کے بعد کا پرچہ نکلنا کسی طرح ممکن نہ ہوا۔ پریس والوں، مشین مینوں، کمپازیٹروں، وغیرہ کے مطالبات مدت کے چڑھے ہوئے تھے، ان ہی کو چکانا اور بیباق کرنا دشوار ہو رہا تھا، نئے مصارف کی گنجائش کہاں سے نکلتی!۔۔۔۔ اس طرح کوئی ۱۵ر مہینہ کی آب و تاب کے بعد یہ آفتابِ صحافت غروب ہو گیا۔ اور اب کی مرتبہ اس کی تدفین انگریز حکومت کے جبر و تشدد کے ہاتھوں نہیں، خود اپنی قوم کی ناقدریوں کے

ہاتھ ہوئی ۔

کھلا دیوان مرا تو شورِ تحسین بزم سے اٹھا
مگر سب ہوگئے خاموش جب مطبع کا بل آیا

محمد علی کا اصلی جوہر تحریر اردو کا نہیں، انگریزی انشاء کا میدان تھا۔ ساتھ ہی قوت استدلال غضب کی۔ بیان کی دلآویزی، زبان کی شگفتگی، دلائل کی قوت، بحث کے اطراف وجوانب کی جامعیت سب مل ملا کر عجب سماں پیدا کر دیتے ۔۔۔۔ کامریڈ جس دن بند ہوا ہے، حکام والا مقام کے علاوہ خود ہم چشم لیڈروں میں سے بھی خدا جانے کتنوں نے اطمنان کا سانس لیا ہوگا کہ ایک بڑا کانٹا پہلو سے دور ہوگیا۔ وہ درۂ احتساب گم ہوگیا، جو بڑے اور چھوٹے کے درمیان صرف انصاف کرنا جانتا تھا۔ کامریڈ نامی ایک اخبار بند نہیں ہوا، مظلوموں کا ایک فریادرس، اور مسلمانوں کا ایک بڑا ترجمان دنیا سے اٹھ گیا!

(ص:۲۰۵،۲۰۶)

پیر اور مرید کی آویزش

ادھر سلطان نجد کی پیش قدمیوں اور فتحمندیوں کی خبریں آنی شروع ہوئیں کہ ادھر شامت کے مارے ہندی مسلمانوں میں دو اکھاڑے قائم ہوگئے۔ اور سب دشتم سے گزر کر نوبت ''رفع یدین'' تک آ گئی۔ ایک صف میں سلطان کے دوست تھے مگر نادان۔ دوسرے فریق میں سلطان کے دشمن تھے مگر دانا۔ وہ بھی انہیں، دوستوں ہی کی طرح نادان۔ اصل مسئلے کو بھول بھال اور اصلی تنقیح کو چھوڑ چھاڑ، بحث ''عقائد'' کی شروع ہوگئی۔ اور ''مبتدع'' و ''توہب'' کا وہ زبردست دیو، جو سویا کبھی بھی نہ تھا، درمیان میں زرا اونگھنے لگا تھا۔ نئے سرے سے چونک کر، پوری قوت کے ساتھ ہر طرف سے دوڑنے دھوپنے، چیخنے چنگھاڑنے لگا۔ ادھر سعودیوں کی فتح سے خوش ہو ہو کر، اہل حدیثوں نے، غیر مقلدوں نے، کتاب وسنت کی پیروی کا دعوی رکھنے والوں نے نعرے لگائے کہ اب کیا ہے، پالا مار لیا ہے، یہ کمبخت بدعتی اور گور پرست اب تو آخر نیچا دیکھ رہے۔ اُدھر شریفوں کی شکست سے ملول ومغموم

ہوکر بریلویوں نے ،علویوں نے ،سنی حنفیوں نے شور وغم واویلا بلند کیا، کہ ہائے یہ کیا غضب ہوا جارہا ہے،ان ناشدنی وہابیوں کا بھی یہ منہ اور یہ حوصلہ ہوا کہ مکہ اور مدینہ پر اپنا علم نصب کرنے کا خواب دیکھنے لگیں۔۔۔۔مشائخ اور پیرزادے، درگاہوں کے سجادے اور مزارات کے مجاور، سب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے، کہ یہ ہمارا دشمنِ ازلی کہاں سے نکل پڑا.شریف آلِ رسول تھا.یہ اس کے مقابلہ میں آیا ہے، یہ مردود ہے، وہابی ہے، جہنم کا کندہ ہے، کانا دجال ہے۔شیطان ہے، یہ اگر جیتا تو ہم کو جیتا نہیں چھوڑنے کا!

مولانائے فرنگی محلی لکھنؤ میں محمد علی دہلی میں، دونوں کی ٹکٹکی برابر مطلعِ حجاز پر لگی ہوئی.ایک کی نگاہ میں مقابرِ مسلمین کا احترام، دوسرے کے پیشِ نظر مصالحِ عالمِ اسلام.مقصد دونوں کا خدمتِ دین.لیکن اپنی اپنی بصیرت اور اپنا اپنا مقام.اجتہاد میں غلطیاں بڑے بڑے کاملین سے ہوئی ہیں.پہلی صدی کے اکابر سے ہوئی ہیں، تو چودھویں صدی کے علماء ومشائخ بے چاروں پر زیادہ گرفت کیوں کیجئے، اور انھیں طعن واعتراض کا ہدف کیوں بنائے رکھیے، ادھر مولانائے فرنگی محلی کے سمجھ میں یہ نہ آیا کہ محمد علی خوش عقیدہ صوفی اور حنفی ہوکر وہابیہ اور نجدیہ کی حمایت کیسے کرنے لگا، اور غیر مقلدین کا شریک حال کیوں کر بن گیا.ادھر محمد علی کی عقل یہ سمجھنے سے قاصر کہ مولانائے فرنگی محلی انگریزی تسلط سے اس قدر بیزار اور مرکزِ اسلام کی آزادی کے لئے اس قدر بے قرار ہوکر اُس فریق کے شریک کس طرح ہوتے جارہے ہیں جو ارضِ پاک میں فرنگی حکومت کو مداخلت کی دعوت دے رہا ہے یہ اپنی طرف دنگ، وہ اپنی طرف حیران۔۔۔۔تاریخ ایک چھوٹے پیمانے پر دورِ عثمانِ غنیؓ اور دورِ مرتضیٰؓ کو دہرا رہی تھی۔

غلط فہمیاں بجائے گھٹنے کے بڑھتی ہی گئیں.ایک گتھی اگر سلجھتی تھی، تو اس کی جگہ دو اور پیدا ہوجاتی تھیں جو دل جڑے ہوئے تھے، ان میں روز بروز دراڑیں ہی پڑتی چلی گئیں، اور درمیانی لوگ طرح طرح کی دراندازیوں میں مصروف۔

(ص:۲۲۸،۲۲۹)

ارض حجاز پوری کی پوری سلطان ابن سعود کے قبضہ میں آ چکی، لیکن ہندوستان کے ایک بڑے حصہ میں اس تسلط کے خلاف بغاوت اب تک جاری. ستمبر کا سارا مہینہ ابن سعود کے حامیوں اور مخالفوں کی کشمکش میں گزرا. جہاں دیکھیے یہی آویزش، جدھر آنکھ اٹھایئے یہی چپقلش. لکھنؤ فرنگی محل کی پرقوت سرپرستی کے بل پر ابن سعود کے دشمنوں کا ایک زبردست مرکز. پوسٹر، پمفلٹ مضامین و مقالات، کارٹون، تمسخر آمیز ہجویہ نظمیں، ماتمی انجمنوں کی آہ و بکا، ماتمی جلوس اور جھنڈے، گرما گرم تقریریں، پرخروش جلسے، ایک مستقل ادارہ ''خدام الحرمین'' کا قیام، ایک نام کی آل انڈیا کانفرنس وغیرہا. غوغائیوں کی بڑی تعداد کے ساتھ چند مخلصین کی شرکت سونے پر سہاگہ کا کام کر گئی. سالار لشکر عبدالباری فرنگی محلی، میمنہ اور میسرہ پر حسرت موہانی اور شیخ مشیر حسین قدوائی، عقب میں شیعہ امراء و تعلقدار، خصوصاً راجہ صاحب سلیم پور اور راجہ نواب علی خان. خلافت والے غریب کہاں تک ظلم و ستم سہتے، اور آخر کب تک نہ بولتے! مولوی ظفر علوی اٹھے اور چودھری خلیق الزماں نے بھی ایک لمبی انگڑائی لی. طے یہ پایا کہ باطل کے سارے رسی کے سانپوں کو نگل جانے کے لیے عصائے حق کا ایک اژدھا کافی ہے. نظر سب کی محمد علی ہی پر پڑی۔۔۔۔ اتفاق سے عین اسی زمانہ میں ۱۸/اکتوبر کو سیتاپور میں صوبہ کی پولٹیکل کانفرنس کا اجلاس مولانا شوکت علی کی صدارت میں تھا. گاندھی جی بھی اس میں بولنے والے تھے اور محمد علی بھی. صلح یہ ٹھہری کہ واپسی میں ۲۰/اکتوبر کو محمد علی چند گھنٹہ کے لیے اتر پڑیں، اور ایک تقریر کر دیں، جس سے ساری غلط فہمیوں اور غلط گمانیوں کے بادل چھٹ کر رہ جائیں. یہ نیاز مند اس سفارت پر سیتاپور گیا. دو چار گھنٹے علی برادران کے ساتھ بسر کیے. مزیدار کھانے ان کے ساتھ کھائے. اس سے زاید مزیدار باتیں ان کی سنیں. اور بات پکی کر کے شام تک واپس آ گیا۔

مرید کا کام تو شیخ کی اطاعت، حمایت و نصرت ہی ہر حال میں سمجھا گیا ہے. ارشاد و بیعت کی ساری تاریخ میں یہ واقعہ شاید اپنی نظیر آپ ہو، کہ مرید اپنے شیخ جی کی مخالفت کرنے علی الاعلان اور پُرزور مخالفت کرنے دور دراز کا سفر اختیار کر کے، اپنا وقت اور اپنا پیسہ خرچ کر کے آ رہا ہے! بیعت، ارادت، محبت، عقیدت کی بنیاد جس طرح حق و اخلاص پر رہی. محبت اگر اللہ کے لئے تھی تو اس علی گڈھ

کے نیچری اور آکسفورڈ کے گریجویٹ نے، اس چودھویں صدی ہجری میں، اپنی مثال سے یہ دکھادیا کہ مخالفت بھی اللہ کے لئے ہوسکتی ہے!۔۔۔۔حب فی اللہ کے بعد بغض فی اللہ کی یہ کیسی قابلِ رشک تفسیر رہی!

لکھنؤ کی منزل تو ابھی بعد کی تھی۔ امتحان کی گھڑی اس سے قبل سیتاپور ہی میں آ گئی۔ بعد مغرب وہاں کی جامع مسجد میں پرزور تقریر مسئلہ حجاز پر کررہے تھے، کہ حاضرین میں سے کوئی صاحب بول اٹھے کہ ''آپ کے مرشد کا مسلک تو اس کے خلاف ہے، پھر یہ مرشد سے مخالفت کیسی؟'' محمد علی نے تقریر کی اسی روا اور روانی میں بغیر ایک لحہ کا خلل ڈالے جواب دیا ''میں نے تو مرشد اسی لیے انھیں بنایا تھا کہ جن معاملات میں مجھے ہدایت کی ضرورت ہوگی وہ مجھے حق کی راہ دکھائیں گے، لیکن اس خاص مسئلہ میں تو وہ خود میری رہنمائی کے محتاج ہیں، ان کی اعانت کرنا میرا فرض ہے''۔۔۔۔مرشد کو مرشد کے مرتبہ اور اللہ کو اللہ کے مرتبہ پر رکھنے کی ایسی خالص مثالیں میرے علم میں تو متعدد نہ اس کے قبل آئی تھیں، نہ اس کے بعد ہی آئیں!

(ص: ۲۵۰، ۲۵۱)

صدارت کے لیے انتخاب چودھری خلیق الزماں صاحب کا ہوا۔ اور جلسہ شروع ہوا۔ ایک عرب سیاح توفیق شریف اس زمانہ میں آئے ہوئے تھے۔ پہلے انہوں نے عربی میں ایک تقریر کی۔ اور اس کے ایک ایک فقرہ کا ترجمہ مولانا عبدالرحمٰن ندوی نگرامی مرحوم کرتے گئے۔ اتنے میں مغرب کا وقت آ گیا، اور نماز اسی صحن میں بہت بڑی جماعت کے ساتھ ہوئی۔ بعد نماز محمد علی تقریر کو اٹھے۔ اُن کا اٹھنا تھا کہ معلوم ہوا قیامت اٹھ کھڑی ہوئی! سب سے پہلے بہت دور سے فرنگی محل کے ایک مرید خاص کی طرف سے ایک سوال کی آواز اور اس آواز پر معاً دوسری آواز، اور تیسری آواز، اور پھر ایک ساتھ بیسیوں آوازیں! گویا ایک کورس تھا، جو بجائے نغمہ و ترنم کے، شور و غوغا کی لے میں بلند ہو رہا تھا۔ اب سوالات موقوف تھے، اور ان کے بجائے صرف یہ مطالبہ اور یہ نعرہ کہ ''ہم نہیں سنیں گے، نہیں سنیں گے'' حلق کی پوری قوت اور چیخ کی انتہائی بلندی کے ساتھ فضا میں قائم! صدر مجلس بار بار

نظم قائم رکھنے کی ہدایت اور خاموش ہونے کی تلقین فرما رہے ہیں، چمکا کر بھی اور بھڑک کر بھی، لیکن جو محمد علی سے بغاوت پر تل کر آئے تھے، وہ خلیق الزماں غریب کو کیا خاطر میں لاتے؟ غوغائیوں کی تعداد کچھ ایسی بڑی نہ تھی، سوڈیڑھ سو ہوں گے لیکن صحن کے مختلف حصوں میں بڑی ترکیب اور اُستادی کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے اور جلسہ کو درہم برہم کر دینے کے لیے بالکل کافی بلکہ کافی سے زاید تھے۔

سیکڑوں ہزاروں عام حاضرین دنگ وحیران، متحیر وپریشان کہ یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے! اندھیرا تو ہو ہی چلا تھا کہ اتنے میں ایک بڑا سا ڈھیلا تختِ صدارت کے سامنے آ کر گرا عین اس جگہ میں بیٹھا ہوا تھا اور حسرت موہانی کے ایک ندیم خاص بھی۔ ڈھیلا گرتے ہی ایک شور برپا ہوا "لینا" "پکڑنا" "یہ کس کی حرکت ہے" "جانے نہ پائے" ایک ملیح آبادی سرخ ریش خاں صاحب ڈنڈا لے کر یہ کہتے ہوئے اٹھے کہ "یہ بدمعاش یوں نہ مانیں گے" میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اور اپنے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ "خدا کے لیے کہیں ڈنڈا نہ چلا بیٹھیے گا، غضب ہو جائے گا" بولے کہ "نہیں، شہر کا مجمع ہے، یہ یوں ہی ٹھیک ہو سکتا ہے"۔

۵ منٹ۔ ۱۰ منٹ۔ ۱۳ منٹ، صدر صاحب بھی آخر کب تک صبر وانتظار کرتے؟ کچھ دیر اور موقع دینے کے بعد جلسہ برخواست کر دیا۔

(ص:۲۵۶،۲۵۷)

پیر ومرید کا ایک لائق تقلید عمل

فرنگی محل کے دورِ متأخرین میں ایک جامع شریعت وطریقت، عالم باعمل وسالک بے بدل مولانا ابوالحیاء محمد نعیمؒ (المتوفی ۱۹۰۲ء) گزرے ہیں۔ ان کے ایک مسترشد روایت کرتے ہیں کہ حضرت نے جب میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو فرمایا کہ "میاں اگر حق تعالیٰ نے اپنے فضل ورحمت سے میری مغفرت کر دی تو وعدہ کرتا ہوں کہ اُس وقت تمہیں یاد رکھوں گا۔ اب تم بھی اسی طرح کا اقرار مجھ سے کرو کہ حق تعالیٰ کے ہاں اگر تمہیں مقبول ثابت ہوئے تو تم بھی مجھ کو بھول نہ جاؤ گے۔ معاہدۂ بیعت تو طرفین سے ہوتا ہے۔ پیر ومرید دونوں میں سے جس کسی کا نصیب یاوری کر جائے، وہ

دوسرے کو اپنے ساتھ گھسیٹے'

(ص: ۲۶۵)

عالی ظرف محمد علی

''فرنگی محل کا کچا چٹھا'' باہر کے اخبارات میں نکل چکا ہے. لیکن خود محمد علی کے اخبار ہمدرد میں اب تک نہیں نکلا. خیر لکھنؤ کا پریس تو اپنے ہاتھ میں تھا نہیں، اس کی طرف سے تو صبر تھا، لیکن ہمدرد میں نہ نکلنے کے کیا معنی؟ کہیں اور چھپتا نہ چھپتا، ہمدرد میں تو اسے سب سے پہلے نکلنا تھا. عارف صاحب (ہمدرد کے انچارج ایڈیٹر) لکھنؤ میں محمد علی کے ساتھ ٹھہرے ہوئے ہیں. صبح کوئی ۱۰، ۱۱ کا وقت ہوگا کہ خلیق صاحب کی کوٹھی پر ''چٹھے'' نویس صاحب ملے. فریاد و داد خواہی کے لہجہ میں مجھ سے بولے کہ ہمدرد میں چھپنے کے لیے میں عارف صاحب کو دیا تھا. عارف صاحب نے لکھا کہ مولانا کی اجازت لے لوں. مولانا نے اجازت نہ دی. اب آپ کہیے. میں نے دل میں کہا، یہ نہ چھپنے کی خوب رہی. یہ تو ایسی بات ہوئی کہ جنگ میں غنیم کے گولے تو ہمارے سروں پر آ کر دھڑ دھڑا گر رہے ہیں، اور ہم ہیں کہ اپنی سب سی بڑی توپ کے دہانے پر مہر لگائے ہوئے ہیں!۔۔۔ عوام کی نظر میں یہ ساری جنگ بجز فرنگی محل اور محمد علی کی جنگ کے اور تھی کیا؟ اور ''خواص'' اس باب میں کب ''عوام'' سے ممتاز تھے؟

جی کڑا کر کے محمد علی سے عرض کی. کہنے کی دیر تھی کہ ایک زبردست ڈانٹ پڑی، وہ بھی تنہائی میں نہیں، پارٹی والوں کے بھرے مجمع میں! گرجتی ہوئی آواز میں اس قسم کے فقرے ہوا میں گونجے ''ہرگز نہیں چھپ سکتا''۔ ''میرے اخبار میں اور ایسی لغو چیزیں''۔ ''یہ ہرگز صحیح اور شریفانہ صحافت نہیں'' ''یہ طریقے چنتا منی ایڈیٹر کو مبارک ہوں''۔ ''یہ آپ نے چنتا منی کا طریقہ کہاں سے سیکھ لیا''. یہ کہا اور ''چٹھا'' میرے ہاتھ سے لے سب کے سامنے پرزہ پرزہ کر ڈالا!۔۔۔ میں لاکھ معتقد اور شیدائی سہی بہر حال ایک زندہ نفس رکھتا تھا. اور نفس ایک مجمع کے سامنے اپنی خواری کب برداشت کر سکتا ہے؟ اس توہین کی تاب نہ آئی لیکن کرتا کیا، دل ہی دل میں جھنجھلاتا اور غصہ کرتا رہا کہ محمد علی کا دوست بھی

خراب اور دشمن تو خراب ہی ہے۔ یہی مزاج ہے جبھی تو کوئی ان کا دوست باقی نہیں رہا۔ یہاں تو ان کے واسطے مٹے جارہے ہیں، اور یہ ہیں کہ نہ دوسرے کی عزت کا خیال کریں نہ جذبات کا!

کچھ دیر روٹھا ہوا ان سے الگ بیٹھا رہا۔ اتنے میں کھانے کا وقت آ گیا۔ سب اٹھے، میں جب بیٹھا رہا خود ہی بولے ''اٹھو کھانا بچھ گیا'' میں نے کہا ''مجھے بھوک نہیں'' اٹھ کر پاس آئے۔ گلے سے لپٹایا۔ اور بولے ''واہ بس اتنے میں خفا ہو گئے'' لوٹے میں پانی لے کر کھڑے ہو گئے کہ ''لو میں خود ہاتھ دھلاتا ہوں تم نہ کھاؤ گے تو میں بھی نہ کھاؤں گا'' طبیعت جز بز تو ہوئی، لیکن پھر وہی کہ آخر کرتا کیا۔ اپنی ہار ماننی ہی پڑی ۔۔۔۔ کوئی ڈائری نویس خواں کہیں یہ نہ فرمانے لگیں ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات میں رکھا کیا ہے۔ لیکن یہی روزمرہ کے واقعات ہی تو ہر شخصیت کے ناپنے کا اصل پیمانہ ہوتے ہیں۔ سیرت پر، کردار پر، باطن پر، سرشت و جبلت پر روشنی اگر ان واقعات سے بھی نہ پڑے گی تو آخر اور کہاں سے واقعات لائے جائیں گے؟

(ص: ۲۷۴، ۲۷۵)

ایک خطرناک جلسہ

۸/نومبر اتوار کا دن تھا کہ محمد علی دس بجے کو وارد لکھنؤ ہوئے۔ میں حسبِ معمول محمد علی کی پیشوائی کے لیے دو ایک روز قبل دریابادسے چل کر لکھنؤ آ گیا تھا، بلکہ محمد علی کو لینے رات کی ٹرین سے سندیلہ اسٹیشن تک چلا بھی گیا تھا ۔۔۔۔ فرنگی محل کے مقابلہ کا اصل مورچہ یا ہیڈ کوارٹر چودھری خلیق الزماں کے مکان پر تھا۔ اب کی بھی علی برادران وہیں اترے۔ جذبات کا ہیجان زوروں پر تھا کہ ابھی کل تک جو مخلص دوست، رفیق کار و شریکِ عمل تھے، وہ آج ایک دوسرے کی صورت سے بیزار، بلکہ ایک دوسرے کی عزت و آبرو کے خواہاں تھے۔ یہ دوڈھائی ہفتہ کا وقفہ جو ملا تھا، یہ

صلح تھی اک مہلت سامان جنگ

اس میں جذبات دھیمے پڑنے کے بجائے اور بھڑک چکے تھے، اور نفرت و عداوت کے شعلے بلند سے بلند تر ہو چکے تھے۔ ادھر یہ ٹھن چکی تھی کہ (بہ زبان مولوی ظفر الملک) جو کچھ بھی ہو، فرنگی

محل کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رہنا ہے۔ ادھر یہ ضد سما گئی تھی کہ (ایک جوشیلے فرنگی محل کی زبان میں) دنیا ادھر کی اُدھر ہو جائے ''یہ شہر کے نئے وہابیوں کا طلب کیا ہوا جلسہ کامیاب نہ ہونے پائے گا۔ داعیان جلسہ نے پچھلے جلسہ کی ناکامی سے ہوشیار ہو کر اب کی ہر طرح کی خوب مضبوطیاں کر لی تھیں، اور سب کے سرخیل اور نگرانِ اعلیٰ مولوی ظفر الملک علوی تھے۔۔۔۔ مخالفین جلسہ کی ریشہ دوانیوں کا نمبر ان سے بڑھا ہوا رہا۔ اور سب جانتے ہیں کہ کسی جلسہ میں نظم قائم رکھنے کے مقابلہ میں اُس میں بدنظمی، برہمی، ہلڑ پیدا کر دینا کتنا آسان ہوتا ہے!

لکھنؤ پہنچتے ہی یہ سننے میں آیا تھا کہ تخریبیے اب کی، پچھلے جلسہ کی طرح صرف حلق وحنجرہ اور آواز ہی کی قوت سے نہیں، بلکہ ہاتھ پیر، لاٹھی اور ڈنڈے کی بھی قوت سے پوری طرح کام لینگے۔ بعض خبریں ان سے بھی بڑھ چڑھ کر وحشت انگیز سنیں۔ دل نہ اس وقت ان کے یقین کرنے پر آمادہ تھا اور نہ اس وقت ان کے بیان کرنے پر۔ موٹر پر جب محمد علی کے ساتھ بیٹھا تو اسٹیشن سے مکان تک یہ مفصل رپوٹ ان کے گوشِ گزار کر دی۔ لیکن اللہ رے ظرف! ہر اس واندیشہ پیدا ہونا کیا معنیٰ، اطمنانِ قلب کی پیشانی پر بل تک نہ آیا۔ یہاں بیان کرنے دل ہولا جاتا تھا، وہاں خود اپنے کو خطرہ کی زد میں سن کر ذرا بھی تغیر نہ ہوا! موٹر کے رکتے رکتے میں نے آخری اپیل التجاء کے لہجہ میں کی ''مولانا، آج آپ کے جوش کا نہیں، آپ کے تدبر کا امتحان ہے۔ تقریر جوشیلی نہیں حکیمانہ و مدبرانہ ہو'' جواب میں محمد علی صرف مسکرا دیئے۔ جیسے کہہ رہے ہوں کہ ''ایاز قدرِ خود بشناس۔ لقمان کو حکمت سکھانے چلو ہو'' ۔۔۔۔ سچ ہے اللہ جسے بڑا بناتا ہے، اس کا ظرف، تحمل، حوصلہ بھی بہت بڑا کر دیتا ہے۔

آج کا دن لرزہ خیز افواہوں اور رعشہ انگیز دھمکیوں کا دن تھا، افواہیں طرح طرح کی سننے میں آ رہی تھیں۔ مار پیٹ کی افواہیں، گالم گلوچ کی افواہیں، فوج داری اور لٹھ بازی کی افواہیں، خون خرابہ کی افواہیں۔ اور دھمکیاں یہ مل رہی تھیں کہ آج شہر کے ''وہابیوں'' اور ''سعودیوں'' کی خیر نہیں۔ بہر حال دوپہر سے نہتوں اور لٹھ بندوں کا جماؤ شروع ہو گیا۔ جلسہ گاہ کا دروازہ بند ہی تھا، اور جلسہ کے

داعیوں اور منتظموں سے اکا دکا کوئی پہنچا ہوگا کہ مخالفین نے باہر سے گویا پورا محاصرہ کرلیا اور جابجا اپنے مورچے قائم کرلیے ۔۔۔۔سر پھٹول کی یہ تیاریاں مسلمان کی مسلمان کے مقابلہ میں ہورہی تھیں۔

خلیق صاحب کے ہاں خبریں منٹ منٹ پر پہونچ رہی تھیں. میں خودتو گھبرا چلا، اور میری ہی طرح کے دوسرے کمزور دل وہمت والے بھی لیکن علی برادران اور ان کے میزبان خلیق صاحب کے نہ چہرہ پر شکن نہ کسی انداز وگفتار میں کوئی خوف وہراس. محمد علی بیٹھے ہوئے بہ اطمنان باتیں کررہے ہیں، اور اس کے منتظر کہ کسی طرح جلسہ کا وقت آئے، اور جلسہ گاہ کی طرف روانہ ہوں!

وقت خدا خدا کرکے آیا. جلسہ گاہ کی عمارت، ممتاز دارالیتامی، کچھ ایسی دور نہ تھی، چار فرلانگ کے فاصلہ پر تھی علی برادران سواری پر روانہ کیے گئے، اور پیچھے پیچھے ہم لوگ دوسرے راستہ سے جلسہ گاہ پر پہنچے، تو ایک عجیب ہی منظر دیکھنے میں آیا. کانوں سے جو خبریں سنی تھیں، وہ تو عجیب تھیں ہی، آنکھوں سے جو باتیں دیکھنے میں آئیں وہ عجیب تر نکلیں. دیہات کے نیچ ذات کے ہندو، پاسی وغیرہ کی قسم کے، سینہ پر نئی اور نوخیز انجمن کا بلا، خادم الحرمین لگائے ہوئے، اور ان کا ایک جم غفیر لاٹھیاں لیے ہوئے. جلسہ گاہ کے ارد گرد گھیرا ڈالے ہوئے ہے ۔۔۔۔ایسے عجیب وغریب خادم الحرمین، ہم نے آپ نے کیا معنی چشم فلک نے بھی کبھی کیوں دیکھے ہوں گے!

پھاٹک پر ایک غل، ہنگامہ، شور، پکار، ہڑبونگ اور چپقلش. ہر شخص دوسرے پر پلا پڑتا ہے کہ دروازہ میں مَیں ہی سب سے پہلے داخل ہوجاؤں. دروازہ کے تنگ زینہ پر ہجوم کا وہ ریلا کہ دبلا پتلا آدمی تو اب کچلا اور جب کچلا! علی برادران سواری پر تھے، چند منٹ قبل پہنچ چکے تھے. ان کا داخلہ تو دیکھنے میں آیا نہیں کہ کس شان سے ہوا. سننے میں آیا کہ لٹھ بند ''خدام الحرمین'' انھیں دیکھ کر بے اختیار ''محمد علی شوکت علی کی جے'' پکارنے لگے۔

بہرحال مجمع موافقین ومخالفین کو ملا کر عظیم الشان. علی برادران ڈائس پر جا کر بیٹھ لیے، تو مولوی ظفر الملک صاحب نے بہ حیثیت داعی جلسہ پکار کر کہا کہ ''ہم لوگ جلسہ کرنے کو تیار ہیں اور

میں داعیان جلسہ کی طرف سے حفظِ امن کا ذمہ لیتا ہوں. اب فریق مخالف کے لیڈر مولانا حسرت موہانی اور شیخ حسین قدوائی سامنے آ کر اسی طرح کا وعدہ کریں اور اعلان کریں کہ ''ان کے فریق کی طرف سے نقضِ امن نہ ہوگا'' دونوں صاحب اس پر صاف نکل گئے، اور عجیب قسم کا احساس ذمہ داری تھا لگے کہنے کہ ''ہم کوئی ذمہ داری نہیں لیتے. مولوی ظفر الملک نے جب یہ قبول کرالیا تو پھر پکار کر کہا کہ ''دیکھ لیجئے، ایک فریق فساد پر آمادہ ہو کر آیا ہے،، اور اس کے لیڈر قیام امن کی طرف سے کانوں پر ہاتھ دھر رہے ہیں، تو اب میں اعلان کرتا ہوں کہ جلسہ ملتوی کیا جاتا ہے، آپ لوگ پرامن طور پر منتشر ہو جائیں'' جلسہ برخواست ہو گیا۔

(حفرقا ص: ۲۷۰، ۲۷۸)

محمد علی کا جوش تبلیغ

۹ رنومبر کی صبح ہوئی، اور راجہ نواب علی خان مع مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی کے علی برادران سے ملنے خلیق صاحب کی کوٹھی پر آئے. خلاصہ گفتگو یہ تھا کہ ''ہمیں اختلاف آپ سے نہیں ہم تو صرف یہ دکھانا چاہتے تھے کہ آپ کے یہ لکھنوی دوست ہم لوگوں کو نکال کر لکھنؤ میں جلسہ نہیں کر سکتے. اب جلسہ مولانا شوکت علی صاحب طلب کر رہے ہیں، وہ شوق سے کریں، ہم اس میں خلل انداز نہ ہوں گے، بلکہ وہ جلسہ تو بعد مغرب ہے۔

''ہم اپنا ایک جلسہ وکٹوریہ پارک میں بعد ظہر کیے دیتے ہیں. آپ وہاں آ کر تقریر فرمائیں. ہم سب آپ کی تقریر کو سنیں گے'' شوکت صاحب جواب میں بولے ''آپ لوگوں کو میرا معمول تو معلوم ہے. میں مخالفین کے جلسہ میں جاتا ہی نہیں، اس سے بدمزگی اور بڑھتی ہے'' معاً محمد علی نے لقمہ دیا ''مگر میرا معمول یہ تو نہیں. میں تو مخالفین ہی کے جلسہ میں شوق سے جاتا ہوں کہ مخالفین کے درمیان تبلیغ کروں. یہ عین سنتِ رسول ہے حضورؐ اپنا پیام ابوجہل کو سناتے تھے، ابوبکر کو اس کی حاجت نہ تھی''

کیا ظرف تھا ''خود بین وخود پرست محمد علی کا! محمد علی نے معتقدین سے واہ واہ حاصل

کرنے والی تقریر میرے علم میں تو کبھی کی ہی نہیں .ولولہ انھیں جب پیدا ہوتا تو منکروں پر تبلیغ کا، گمراہوں کو راہِ راست پر لانے ہی کا ہوتا .اور اپنے حق پر ہونے کا اس درجہ اعتماد ووثوق رہتا تھا کہ مخالفین کے ہجوم وکثرت سے کبھی گھبرائے ہی نہیں .کہا کرتے تھے کہ پبلک سے ڈرنا کیا معنٰی! جس کے دل میں پبلک کا خوف بیٹھا ہوا ہے اور جو پبلک سے بدگمان ہے اس کی جمہوریت جھوٹی جمہوریت ہے اور وہ لیڈری کا کسی طرح اہل نہیں۔

(ص: ۲۸۱)

محمد علی کی انصاف پروری

مولوی ظفر الملک اور چودھری خلیق الزماں نے جدید کمیٹی کے نمائندوں کی حیثیت سے جلسہ کے اسم میں جا کر مؤثر ومدلل بیانات دیے۔۔۔۔جلسہ کی کاروائی دلچسپ سہی، لیکن جو ڈائری صرف محمد علی سے متعلق ہے وہ اس کی تفصیل کی متحمل کہاں ہو سکتی ہے؟

سب کو اشتیاق وانتظار محمد علی کی تقریر کا تو قع کیا معنی یقین تھا کہ تقریر بڑی گرما گرم اور پُر زور ہوگی، اور قدیم کمیٹی والوں کا تار تار الگ کر کے رکھ دے گی. لیجئے، تقریر شروع ہوئی، اور سب کے کان لگ گئے کہ مخالفین میں سے ایک ایک کی قلعی کھل کر رہتی ہے. لیکن یہ کیا؟ دو منٹ، چار منٹ، پانچ منٹ تقریر کے ہو گئے، اور نہ آتش بیانی نہ شعلہ افشانی. نہ اس پر اصرار کہ ان دشمنوں کو فوراً نکال دیا جائے، نہ اس کا مطالبہ کہ ان ''دوستوں کو فوراً لے لیا جائے. ایک معتدل سی تقریر، جذبات کو بھڑکانے کے بجائے دھیمی کرنے والی. جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قدیمی کمیٹی کا الحاق توڑنا لازمی نہیں، اگر کوئی صورت اصلاح حال کی نکل آئے، تو ان لوگوں کی ممبری بھی بدستور قائم رہ سکتی ہے'' ہمارے فریق کے اہل غلو دنگ وحیران کہ لیجئے جس کے واسطے یہ سب کیا کچھ کیا گیا تھا، وہ خود ہی اتنے بجھے ہوئے نکلے۔۔۔۔ اتنے ''چست'' گواہوں کے ہوتے ہوئے کوئی مدعی اتنا ''سست'' کہیں کا ہے کو ثابت ہوا ہوگا!

(ص:۲۹۱)

مرشد کی آخری گھڑیاں

۷؍جنوری ۱۹۲۶ء یکشنبہ، رجب ۱۳۴۴ھ کی غالباً دوسری تھی کہ معلوم ہوا، مولانائے فرنگی محلی پر سہ پہر کے وقت یک بیک فالج کا زبردست حملہ ہوا اور مولانا اس وقت سے بیہوش ہیں ۔۔۔۔مولانا کسرتی جسم کے آدمی تھے، توانا وتنومند، صحت بہت اچھی تھی، کھلتا ہوا رنگ، اور عمر بھی ابھی پچاس سال کے اندر!۔۔۔۔عارف صاحب کا مضمون اپنا کام کر چکا تھا، وہ کام جواب تک کسی کے بنائے بھی نہ بنا تھا مولانائے فرنگی محلی سے محمد علی کو باغی و برگشتہ کرنے کی کوشش اور تدبیریں اب تک محمد علی کے خدا جانے کتنے نیازمند اور رفیق کر چکے تھے، بعض حبِ علی کی بنا پر اور زیادہ تر بغضِ معاویہ کی بنا پر۔ کوئی محمد علی سے فرطِ اخلاص کی بنا پر، اور کوئی محض فرنگی محل کی ضد اور عداوت پر۔ محمد علی کے تعلقات محبت (''محبت'' نہ کہ عقیدت) مولانائے فرنگی محلی سے اس درجہ مستحکم واستوار تھے کہ کسی کی کچھ نہ چلتی ۔۔۔۔عمر میں بالکل پہلی بار اب یہ اتفاق ہوا کہ گوشت ناخن سے جدا ہوا۔ دوست کا دل دوست سے، عزیز کا دل عزیز سے، مسترشد کا دل مرشد سے ہٹا۔ اور دل کی ٹیسیں لفظ وعبارت کا جامہ پہن کر ہمدرد کے صفحات پر نمودار ہوئیں۔ یہ کامیابی اور کارگزاری کچھ تھوڑی تھی؟ یاروں کی دیرینہ تمنا بر آئی۔ عارف صاحب کو داد بھی ملی اور مبارکباد بھی، زبانی بھی اور اخباری مضمون میں بھی۔

سب نے جان لڑادی۔ تیمارداری کے سامان بہتر سے بہتر موجود۔ عزیزوں، مخلصوں، مریدوں نے نہ دن کو دن سمجھا، نہ رات کو رات۔ لیکن

ہر چہ کردند از علاج و از دوا
گشت رنج افزوں و حاجت ناروا

یہ فالج، طبی اصطلاحی فالج تھا کب؟۔۔۔۔اور جو مرض تھا وہ کسی ڈاکٹری، یونانی معالج کے بس کا تھا ہی کہاں؟ تن کی رنجوری کو سب نے دیکھا۔ دل پر جو گزر گئی تھی، اس سے باخبر کوئی نہ ہوا۔ اوپر کے زخم پر مرہم رکھنے سب دوڑے، اندر کے ناسور کا پتہ کسی کو نہ چلا۔ کسی کو کیا خبر تھی کہ

تن خوش ست و اوگرفتارِ دل ست

عشق ہمیشہ لیلیٰ ومجنوں شیریں وفرہاد، نل ودمن ہی کے درمیان نہیں ہوتا، شمس تبریزی اور جلال الدین رومی کی داستانِ عشق بھی آخر اسی دنیا کی سماعت میں آچکی ہے!

عارف صاحب کے مضمون کا اثر سب نے دیکھا محمد علی کا مضمون خونِ دل کی روشنائی اور سوزِ جگر کے قلم سے لکھا ہوا بھی اسی ہمدرد میں چھپا۔ اور عارف صاحب کے مضمون سے کہیں زیادہ پڑھا گیا تھا، اس کا اثر کسی نے نہ دیکھا!۔۔۔ محمد علی کا مضمون، کوئی معمولی سطح کا مضمون نہ تھا؟ "تقاضائے وفا" کا تقاضا کوئی معمولی، رسمی تقاضا تھا۔ ایمان واسلام کی پکار کوئی معمولی پکار تھی؟

محمد علی کے حلقوم سے آواز تو وہ نکلی تھی، جو پتھر کو پگھلا دیتی، فولاد کو گلا دیتی، چٹان کو ہلا دیتی۔ کیا اپنے ہی مرشد کے قلب پر اتنا بھی اثر نہ کرتی؟ فرنگی محل کے یہ آخری دور کا شیخ طریقت بزرگانِ سلسلہ کے نام پر خدا جانے کیا کچھ لٹا چکا تھا، اللہ کا نام سن کر کیا نقدِ جان کی نذر دینے میں بخل کرتا رہ جاتا؟ کیا اس کی روح خشیت سے خدانخواستہ بالکل خالی اور اس کا سینہ انابت سے بالکل بے نور تھا؟ روح تھرتھرائی، جان کپکپائی، اور ناسوتیوں نے اپنی محدود زبان میں ایک اصطلاح فالج کی گڑھ لی۔

شمس تبریز کی قسمت میں کہا جاتا ہے کہ اپنے عاشق زار مرید وطالب جلال الدین رومی کے ایک فرزند سے جام شہادت پینا لکھا تھا۔ محمد علی کے مرشد اپنے نصیب میں محمد علی کے قلم سے شہید ہونا لکھا کر لائے تھے۔ وہ حکایت کتابوں میں پڑھی، یہ ماجرا اپنی آنکھوں سے دیکھنے میں آیا۔۔۔ عاشقوں کی موت وشہادت کے بھی کتنے ڈھنگ اور کتنے آہنگ ہیں! کہیں غیروں کی تلوار، کہیں اپنوں کا پیار، اور شہادت زارِ الفت میں بلانے کے کتنے حیلے اور کتنے بہانے ہیں، اور بلانے والے کے چہرہ کے کتنے نقاب۔

(متفرقات: ۳۱۱، ۳۱۷)

سیرت کا اصلی جوہر

ایک روز دوپہر کا کھانا ہو رہا تھا۔ دستر خوان پر کئی ایک عالم و فاضل اور متعدد بزرگانِ ملت، سب اس وقت تک محمد علی کے مخلص اور بے تکلف جمع تھے۔ اور ایسا اجتماع محمد علی کے دستر خوان کے لیے کچھ انوکھا نہ تھا۔ مسئلہ تصویر کشی اور فوٹو گرافی کا چھڑا۔ محمد علی مسائل فقہ میں حنفی تھے۔ لیکن ''مقلد'' ہونے کے باوجود حق اجتہاد اپنے لیے اور ہر مسلمان کے لیے بھی محفوظ رکھتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ

''کسی ماہر خصوصی (اسپشلسٹ) کے قائل و معتقد ہونے کے یہ معنی نہیں کہ اسے محفوظ عن الخطا یا سمجھ لیا جائے، اور اس کے ہر ہر جزئیہ پر یکساں ایمان لانا لازم رہے۔ یہ تقلید، تقلید جامد ہے''

محمد علی کے تذکرہ میں یہ بھی نہ بھولیے کہ وہ اتنے جوش دینی اور جذبۂ ایمانی کے باوجود بہر حال تھے علیگڈھ اور آکسفورڈ کے گریجویٹ، اور سالہا سال کی مدت دونوں جگہ گزارے ہوئے۔ دہلی میرا جب جانا ہوتا، ایک آدھ جھڑپ اسی مسئلۂ تصاویر پر ہو جاتی۔ فقہاء کے دلائل اور اصول فقہ کے باقاعدہ مطالعہ کا موقع تو انھیں کبھی ملا نہ تھا، لیکن میرے ''تقلیدی'' معروضات کے جواب میں اپنی ذہانت کے زور سے کچھ نہ کچھ ''اجتہادات'' کر دیتے اور حدیث جب میں کوئی پیش کرتا، تو اس کی بھی کوئی نہ کوئی تاویل کر دیتے۔ غرض میری ایک نہ مانتے۔۔۔۔ ہاں تو جس روز دستر خوان پر یہ منتخب مجمع تھا، میں نے چھیڑ کر یہی مسئلہ نکالا۔ گفتگو بڑھی۔ محمد علی کیا چپ ہونے والے تھے۔ سب سے مقابلہ کر رہے تھے۔ ایک ایک کو جواب دے رہے تھے۔ بازی ہرتی ہوئی دیکھ میں نے عرض کیا کہ

''اچھا جائز و ناجائز کی بحث چھوڑیے، مباح و حرام کو جانے دیجئے۔ اس پہلو کو لیجئے کہ جن لوگوں کی آپ دل سے عزت و حرمت کرتے ہیں، انھیں آپ کے عمل سے تکلیف اور ناگواری ہوتی ہے۔ بس ان کی رفعِ اذیت ہی کے خیال سے اسے ترک کر دیجئے''۔ بولے ''اتنی خاطر تو بس مجھے اِن مولانا (حسین

احمد صاحب) کی عزیز ہے"۔

میں نے عرض کیا کہ "اچھا مولانا ہی کی خاطر سے" فرمایا

"ہاں منظور۔ لیکن وہ بھی اپنی زبان سے یہی کہدیں۔ فقہی دلائل وغیرہ نہ پیش کریں۔ وہ مجھے معلوم ہیں۔ میں جوابات دینا شروع کردوں گا۔ بس صرف اتنا کہہ دیں کہ میری خاطر سے انھیں اتار دو"۔

مولانا کو اس کارِ خیر یا کلمۂ خیر میں کیا تأمل ہوسکتا تھا۔ زبان سے وہی فقرہ فرمادیا۔ اور بیسیوں تصویروں، صدہا نہیں شاید ہزارہا کی مجموعی قیمت کی کیسی کیسی نفیس وشاندار، اسی آن کمرہ کی دیواروں سے اتر گئیں!۔۔۔۔ یہ نہ پوچھیے کہ کس دل سے محمد علی نے ان کے اتارنے کا حکم دیا۔ اور اس میں کتنا شدید مجاہدہ ان کے نفس کو کرنا پڑا لیکن بہر حال تھے قول کے پکے۔ زبان دے چکے تھے۔ جو کہا تھا، پورا کر دکھایا۔

(ص: ۳۲۵، ۳۲۷)

"ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا"

مرکزی خلافت کمیٹی کے جلسے جلد جلد ہوتے اور عموماً دہلی ہی میں، زیادہ تر محمد علی کے ہاں، اور کبھی کبھی حکیم صاحب کے ہاں۔ میں اکتوبر ۲۵ء میں نیا نیا ممبر مرکزی کمیٹی کا بنا تھا۔ کچھ تو تازہ جوش وشوق اور کچھ محمد علی کی ذاتی کشش، ہر بار ساڑھے تین سو میل کے فاصلہ سے دوڑ کر دریا باد سے دہلی آتا۔ محمد علی کام سے پسے ہوئے، مخالفوں سے گھرے ہوئے، قلب رنجور، جسم محنت سے چور چور، میری حاضری سے باغ باغ ہوجاتے، اور کچھ دیر کے لیے گویا چھٹی منانے لگتے۔۔۔۔ ایک مرتبہ غالباً ۲۵ء کا دسمبر تھا، جو میں آیا۔ رات کو پہنچا۔ دوسرے دن محمد علی نے دن بھر کی چھٹی اپنے دفتر سے لے لی، سیر وتفریح کو تر سے ہوئے تھے، کسی سے موٹر مانگ اپنی برقع پوش بیگم صاحبہ اور مجھ کو اور مولانا عرفان کو ساتھ لے، شہر کے باہر نکل گئے۔ پہلے حضرت نظام الدین اور پھر قطب صاحبؒ کے ہاں کچھ وقت گزرا۔ ناشتہ کچھ ساتھ تھا، کچھ وہاں خرید کر کھایا پیا۔ مزارات پر فاتحہ پڑھی، مسجد میں نمازیں پڑھیں۔

لوگ ہر جگہ گھیر لیتے تھے۔ یہ بھی مجاوروں سے اور سب سے گھل مل کر باتیں کرتے۔

بیگم صاحبہ کی معیت کچھ نئی نہ تھی۔ میاں بیوی میں میل محبت شروع ہی سے بہت تھا۔ آخر عمر میں تو کہنا چاہیے کہ عشق کی کیفیت تھی۔ عشق ایسا نہیں جس میں سوزش اور شورش ہو، اور جو تمام تر جوانی کے قوی کی پیداوار ہوتا ہے، بلکہ ایسا عشق جس میں ٹھنڈک اور سکون ہوتا ہے، اور عربی میں اس کے لیے لفظ ''انس'' ہے محمد علی کہا کرتے تھے :-

''اب بغیر انھیں ساتھ لیے مجھ سے کہیں جایا نہیں جاتا۔ جوں جوں سن بڑھتا جاتا ہے، خواہشِ نفس عنقا ہوتی جاتی ہے۔ اور بیوی کے ساتھ خالص محبت بڑھتی جاتی ہے۔ اور قرآن مجید میں جو آیا ہے کہ بیوی سے تمہیں تسکینِ خاطر حاصل ہوگی اس کے معنی اب جا کر سمجھ میں آئے ہیں''۔

محمد علی کی مہمانداری بھی قابل دید تھی۔ میں جب کبھی مہمان ہوتا، خاطر داریوں کو حدِ اسراف تک پہنچا دیتے، کھانے ضرورت سے بھی زائد ہوتے، میری حیثیت سے بھی زائد، اور ان کی جیب کی گنجائش سے بھی زائد۔ حق گوئی و حق نگاری میں تو محمد علی اپنی نظیر آپ تھے ہی، مہمان نواز اور سیر چشم اس درجہ کے کم دیکھنے میں آئے ہیں۔ کھانا اکیلے کھانا تو جانتے ہی نہ تھے، اور پھر کھانا بھی ''نان جویں'' اور ''نمک طعام'' نہیں، دسترخوان اچھا خاصہ چھوٹے موٹے رئیس کا معلوم ہوتا تھا۔ اچھے سے اچھے سالن، قورمہ، قلیہ، کباب کی متعدد پلیٹیں، طرح طرح کے لذیذ و پر تکلف نمکین اور میٹھے کھانے۔ کبھی مرغ کبھی مچھلی۔ خشک میوے، تازہ پھل، خود کھاتے اور دوسروں کو زبردستی کر کر کے کھلاتے۔ اس سب کے باوجود ۲۵ء میں جب مولانا شوکت علی نے خود ہی یا ان کی تحریک سے ''دوشنبہ'' فنڈ کھولا، اور یہ قرار دیا کہ ہفتہ میں ایک دن، دوشنبہ کو مسلمان اپنا کھانا صرف چٹنی روٹی رکھیں، اور اس روز کھانے کے خرچ میں جو کچھ بچت ہو، اسے جمع کر کر کے ہر مہینہ یا ہر تیسرے مہینہ خلافت فنڈ کی نذر کرتے رہیں، تو محمد علی نے اس قاعدہ پر سختی سے عمل شروع کر دیا۔ کہاں تو روزمرہ شوقینی کا یہ عالم تھا اور کہاں دوشنبہ کے دن واقعی دسترخوان کی حد تک زاہد خشک بن جاتے۔۔۔۔ دوشنبہ کے دن ان کے

ہاں کا منظر دیکھنے کے قابل ہوتا داماد، بھتیجے، بھانجے، دفتر کے منشی یہ، وہ، کھانے والوں کی ایک اچھی خاصی تعداد روزمرہ ان کے دسترخوان پر ہوتی۔ آج کوئی صاحب بیماری کا بہانہ کرکے، کوئی صاحب کوئی اور عذر تراش کے، غرض سب ان کے دسترخوان سے کھسک جاتے، اور ان سے چھپ کر الگ الگ اپنے روزمرہ کے کھانوں کا انتظام کر لیتے محمد علی اکیلے بیچارہ اپنے عہد کی پابندی کرتے۔ اور یہ کوئی معمولی مجاہدہ نہ تھا۔

میں جب جاتا، ہر مرتبہ اصرار کرکے وقت سے زیادہ روکنے کی کوشش کرتے۔ چلتے وقت ہمیشہ ایک معرکہ پیش آتا ہنسی خوشی کبھی رخصت نہ کرتے۔ ایک دفعہ تو ان کی نظر بچا کر بھاگ کر آنا پڑا تھا۔ میری ٹوپی اور عینک حضرت نے قرق کر لی۔ سمجھے یہ تھے کہ بغیر ان کے سفر کیسے کرسکوں گا۔ مجھ ضدی کے لیے یہ چیزیں بھی روک نہ بن سکیں۔ جب دوبارہ ملنا ہوا (غالباً لکھنؤ میں) تو لگے معذرت کرنے کہ ''تمہیں عینک کے بغیر سخت تکلیف ہوئی ہوگی'' ایک بار عاجز آ کر میں نے یہ ٹھان لی کہ اب ان کے ہاں ٹھہرا ہی نہ کروں گا، ہر دفعہ مورچہ بندی کون کرے۔ پھر جو دہلی جانا ہوا تو اسٹیشن سے سیدھا خلافت کمیٹی کے دفتر گیا۔ مولوی لقاء اللہ صاحب عثمانی پانی پتی شہر کمیٹی کے سکریٹری تھے، ان سے کہا کہ ''اب کی آپ کا مہمان ہوں، آخر جلسہ خلافت ہی کے لیے تو آیا ہوں''۔ وہ بیچارہ تبرّی وتحاشی کے ساتھ بولے ''میری مجال ہے جو ٹھہرا سکوں، مولانا محمد علی تو مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے''۔ ہار کر اور پچھتا کر پھر وہیں آنا پڑا۔ بہت بگڑے ''مجھ سے بھاگنا چاہتے تھے''۔۔۔۔ اپنے سے چھوٹوں اور نیازمندوں کے ساتھ اس شفقت ومحبت وتعلق خاطر کی مثالیں اب کہاں دیکھنے میں آئیں گی۔

(ص:۳۶۸ تا ۳۷۱)

جوش کے ساتھ ہوش

۱۹۲۶ء آخری سہ ماہی کی کوئی تاریخ۔ مولانا آج سہ پہر کو دہلی سے لکھنؤ آرہے ہیں۔ میں حسب دستور دریاباد سے چل کر لکھنؤ اسٹیشن پر ان کے استقبال کو حاضر۔ گاڑی سے اترتے ہی بھرے پلیٹ فارم پر مجھ پر برس پڑے۔ ''کیوں صاحب، یہ سچ میں ایسے مضمون آنے لگے جو مجھے اور حسن

نظامی کو ایک درجہ پر رکھ رہے ہیں''۔۔۔۔خفگی کے پورے الفاظ سننے سے قبل اصل واقعہ کو سن لیجئے۔ عین جس وقت ظفر علی خان صاحب، اور پنجاب خلافت پارٹی اور ہندوستان کے اہل حدیث کے نرغہ میں مولانا گھرے ہوئے تھے، کہ دوسری جنگ پوری شد و مد اور انتہائی تلخی اور تندی کے ساتھ دہلی کے مشہور و معروف خواجہ حسن نظامی سے چھڑ گئی۔ محمد علی کے ہاں جوش اور جوشِ غضب بہت تھا، لیکن وہ بہر حال اپنے کو متعین حدود کے اندر مقید کیے ہوئے تھے فریقِ مقابل قیود و حدود سے ہر طرح آزاد تھا۔ علاوہ اور رسالوں اور پرچوں کے ایک مستقل روزنامہ خواجہ حسن نظامی صاحب نے ''غریبوں کا اخبار'' کے نام سے محمد علی کی مخالفت میں نکال دیا اور چند روز تک خوب اس میں روزانہ ایک نئی پھلجڑی چھڑاتے رہے۔ مثلاً کبھی یہ کہ میں دہلوی ہوں، خالص دہلوی اور یہ محمد علی رامپوری ہیں، بیرونی ہیں، آفاقی ہیں۔ میں سید ہوں، اور فلاں فلاں بزرگ میرے اجداد میں ہیں، محمد علی کا نسب نامہ اس کے مقابلہ میں بالکل مجہول ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور دنیا کی شاید کوئی بڑی سی بڑی معصیت ایسی نہ ہو، جس کا انتساب مولانا کی جانب نہ کیا گیا ہو۔

''سچ'' میری ادارت میں شروع ۲۵ء سے نکل رہا تھا۔ اس کی سچی باتوں کے ذیل میں اس وقت کسی ہفتہ یہ لکھ دیا گیا تھا کہ مسلمان لیڈروں کے درمیان باہمی جنگ کب تک جاری رہے گی؟ اور ایک دوسرے کی کمزوریوں سے قطع نظر کرنا اور آپس میں رواداری و فراخ دلی کا برتاؤ کرنا آخر کب آئے گا؟ ملت کی یکجہتی کے لیے لازم ہے کہ اختلاف خیال و مسلک کے باوجود سب مسلم اکابر آپس میں متحد عمل ہوں، اور ایک دوسرے پر گندگی اچھالنا چھوڑیں۔ خواجہ صاحب کے حلقہ میں ایک بڑے مخلص و سنجیدہ شخص واحدی صاحب تھے۔ انھوں نے اس مصالحانہ مضمون کو الگ ورق پر چھاپ کر دہلی میں اس کی بکثرت اشاعت کی۔ خواجہ حسن نظامی کا نام بھی لکھنے والے کے ذہن میں لکھتے وقت نہ تھا، لیکن دلی کی فضا میں اس کا تعلق اسی ''عمل ختم خواجگی'' سے سمجھا گیا۔ اور خیال یہ پھیلا گیا کہ سچ نے نرم شستہ اور مہذب انداز میں ہمدرد و صاحب ہمدرد کو ٹوکا ہے۔۔۔۔خفگی اسی سلسلہ میں تھی۔ اور اب وہ

ڈانٹ پوری کی پوری بھی سن لیجئے، جو مدیر سچ پر، روز روشن میں لکھنؤ کے بھرے اسٹیشن پر پڑ رہی تھی:-

''یہ آپ بھی ان ہی لوگوں میں ہو لیے، جو آج تک حضرت علی اور معاویہ میں فرق نہ کر سکے. یہ ٹھیک خوارج کی ذہنیت ہے، جنھوں نے کبھی تحقیق کی زحمت گوارا نہ کی کہ حق پر کون اور ناحق پر کون. آپ نے بھی ایک ہی لاٹھی سے سب کو ہانکنا شروع کر دیا محض صلح کرو، صلح کرو، کی رٹ لگا دی، یہ نہ دیکھا کہ کون کس پر کتنی زیادتی کر رہا ہے. مجھے اگر آپ ناحق پر پاتے ہیں تو ضرور ٹوکیے، کھلے اور صاف لفظوں میں ٹوکیے، لیکن پہلے تحقیق کیجئے، میرا جرم بتایئے. یہ کیا کہ سب کو ایک درجہ پر رکھ دیا. میں جانتا ہوں کہ آپ کی تحریر سے وہ گروہ کتنا فائدہ اٹھا رہا ہے. آپ کی نیت جو کچھ بھی ہو، بہر حال آپ نے ایک حربہ تو اپنے سیدھے پن سے ان کے ہاتھ میں دے دیا. وہ لوگ وہ اشتہار ایک ایک کو دکھاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ لو، سچ تک نے محمد علی کا ساتھ چھوڑ دیا. آپ سے ہرگز اس کی توقع نہ تھی''.

مولانا کے ہاں بھی جوابات کی کیا کمی تھی. اُدھر کی ہر پھبتی کا جواب اِدھر بھی پھبتی سے دیا جاتا. مولانا محمد علی اگر اب ''رامپوری کلاں'' تھے تو خواجہ حسن نظامی بھی اب ''علی حسن غیاث پوری'' تھے. خواجہ صاحب نے ذہانت کا سارا زور صرف کر کے لکھا کہ محمد علی رامپوری کی بات سنتا کون ہے؟ جدھر جاتے ہیں، لوگ چنداں ماموں کہہ کر ان کا استقبال کرتے ہیں. انھیں اب چندہ دیتا کون ہے؟ مولانا کب چوکنے والے تھے جواب اسی ردیف وقافیہ میں دیا. بولے کہ ''خواہر زادگی کی بو نہ گئی. چندا ماموں ہی یاد رہا. چندا ابا کہہ کر پکارا ہوتا تو بات بھی تھی''.

خواجہ صاحب کے مقابلہ میں محمد علی جو ''علاج بالمثل'' کر رہے تھے، اس سے ہم نیاز مند جز بز ہو رہے تھے. لیکن کہنے کی ہمت کس میں تھی. اتفاق سے ایک روز اسی خلافت کمیٹی کے شب کے

اجلاس میں چودھری خلیق الزماں آ گئے۔ انھوں نے کہا، میں کہہ لوں گا۔ اور کہہ بھی گزرے۔ اس وقت مکالمہ کا دھندلا سا نقشہ ذہن میں بھی محفوظ ہے۔

چودھری صاحب۔ یہ آپ حسن نظامی کو کیوں جواب دیے چلے جاتے ہیں۔ آپ اپنی پوزیشن کا خیال کیجئے!۔

مولانا۔ پوزیشن کیسی؟ تمہیں پبلک کے مذاق کا اندازہ نہیں۔ جواب نہ دیا جائے تو سمجھ لیا جاتا ہے کہ بات سچی ہے۔ اور عوام میں زہر برابر پھیلتا جاتا ہے۔

چ۔ میں تو بازاری لوگوں کا مقابلہ کبھی نہ کرتا۔ اگر کوئی مجھے نخاس کے چوراہہ پر گالی دے تو کیا میں بھی گالی دینے لگوں؟

م۔ تم مقابلہ اس لیے نہ کرتے کہ تمہیں کرنا نہیں آتا۔ میں تو کر سکتا ہوں۔ میں نخاس کے چوراہہ ہی پر اسی زبان میں جواب دوں گا۔

۔۔۔۔۔ کوئی اور اس سے جو چاہے نتیجہ نکالے۔ میرے دل پر تو محمد علی کی سچائی ہی کا نقش اور گہرا ہوا۔ ڈپلومیسی اور تصنع کے فن سے کسی درجہ میں بھی آشنا نہ تھے۔ اچھا یا برا جو کچھ بھی دل میں ہوتا۔ بس ٹھیک وہی زبان پر بھی آتا۔

(ص:۳۸۹ تا ۳۹۴)

محمد علی کی بیباکی

اسی ۳۷ء کا جون یا جولائی ہے۔ اور محمد علی لکھنؤ آئے ہوئے ہیں۔ شہر کے ایک معزز گھرانے میں تقریب ہے۔ بارات لاہور سے آئی ہوئی ہے۔ محمد علی کے تعلقات دلہن کے گھرانے سے بڑے پرانے اور گہرے ہیں۔ بعد مغرب بزم عقد آراستہ ہوئی۔ عین اسی زمانہ میں مصر کی ایک بڑی ''روشن خیال'' خاتون ہندوستان آئی ہوئی تھیں اور اس وقت لکھنؤ کے اونچے حلقوں میں شمع بزم بنی ہوئی تھیں، کیسے ممکن تھا کہ یہ جلسہ ان سے محروم رہتا۔ اودھ چیف کورٹ کے ایک مشہور جج (غالباً اس وقت چیف جسٹس) معزز ترین مہمان تھے، ان ہی کے پہلو میں اپنے برہنہ بازوؤں اور گوری پنڈلیوں کے ساتھ

بیٹھی ہوئی خواجہ صاحب ایجاب وقبول سے قبل تقریر کے لیے کھڑے ہوئے، اور سورۂ نساء کی جو آیتیں نکاح کے خطبۂ مسنون کا جزو ہیں، انھیں پڑھ کر ان کی تفسیر بیان کرنے لگے۔ فرنگی تہذیب کی بے اعتدالیوں اور بے حیائیوں کا ذکر یوں بھی لانا ضروری تھا، اور پھر اب تو سامنے فرنگیت کا ایک مجسم نمونہ ہی موجود تھا، تقریر کا رُخ ابھی یورپی مشاہدات کی طرف مڑا ہی تھا کہ ان چیف جسٹس صاحب نے اپنے عہدہ ومرتبہ کی بڑائی سے فائدہ اٹھا کر اور عام آدابِ محفل کو ٹھکرا کر، مقرر سے ارشاد فرمایا ''بس ان حملوں کو ختم کیجئے۔ یورپ کی زندگی کا تجربہ رکھنے والے دوسرے بھی ہیں''۔۔۔۔ خواجہ صاحب ایک مشہور مقرر، مبلغ ومناظر ہی نہ تھے، اس محفل میں تو سمدھی کی اور نوشہ کے باپ کی حیثیت سے بھی ہر لحاظ سے اور احترام کے مستحق تھے۔ کوئی دوسرا انھیں یوں ٹوکنے کی جرأت کرتا، تو شاید اس کا منہ نوچ لیا جاتا۔ اور عجب نہیں جو صاحب خانہ اسے اپنی ذاتی توہین سمجھ کر ایسے مہمان کو محفل ہی میں موجود رہنے کی تکلیف نہ دیتے، لیکن یہاں کا معاملہ اودھ کے سب سے بڑے عدالتی حاکم کا تھا۔ حاضر الوقت وکیلوں، بیرسٹروں، ڈپٹیوں، منصفوں، سب ججوں میں سے کسی کی مجال تھی جو ''ہوں'' بھی کر سکے!

جسٹس موصوف کے فقرہ کی گونج ابھی فضا میں ختم ہوئی تھی کہ بجلی کی سی تیزی سے ایک آواز بلند ہوئی ''اور آپ کے ان یورپی تجربوں میں شریک رہنے والا اور ان کا گواہ کوئی اور بھی ہے''۔ آواز صدر محفل سے نہیں، دور سے ایک گوشہ سے آئی تھی، بمعا سیکڑوں گردنیں اُدھر مڑ گئیں، صدہا آنکھیں اُدھر اٹھ گئیں، کہ ایسا بیباک اور سر پھرا ہو کون سکتا ہے!۔۔۔۔ دیکھنے والوں نے دیکھا، تو یہ لقمہ دینے والا، داڑھی رکھائے ہوئے اور کھدری عبا پہنے ہوئے، آکسفورڈ کا گریجویٹ محمد علی تھا! محمد علی، نوشہ کا تخت اور صدر مجلس کے صوفے اور کوچ چھوڑ عام حاضرین میں ملے جلے کھڑے ہوئے تھے، اور وہیں سے یہ فقرہ بول اٹھے تھے۔۔۔۔ تلمیح بہت بلیغ اور معنی خیز تھی۔ لیکن بجز اس کے کہ اس تلخ گھونٹ کو خاموشی سے اتار لیا جائے، کوئی اور چارہ ہی کیا تھا؟

محمد علی کے لیے خلوت وجلوت یکساں تھی اور جہاں تک مذہب واخلاق کی نصرت وحمایت

کا تعلق تھا، وہ ان کے لیے ہر جگہ ہر وقت شمشیر برہنہ ہی تھے۔

(حصہ دوم ص:۲۰۱،۳۰۲)

مولانا اور مہاراجہ

مہاراجہ الور اس وقت ایک عجیب وغریب انسان تھے، بڑے قابل، فاضل، اپنے ہندو علوم کے علاوہ اردو، فارسی میں بھی برق، اور انگریزی میں بڑے خوش تقریر۔ مسلمانوں کی تہذیب وتمدن سے بڑی دلچسپی اور محبت رکھنے والے۔ مارچ ۲۸ء کا ذکر ہے کہ دہلی میں کوئی بڑا ایٹ ہوم تھا، جس میں اتفاق سے مہاراجہ کی نظر مولانا پر پڑ گئی۔ ملتے ہی مہربان ہو گئے، اور بڑے اصرار سے اپنے ہاں بلایا۔ اتفاق دیکھیے کہ ان سے اور نواب صاحب رام پور سے بھائی چارہ اور بقول شخصے دانت کاٹی روٹی تھی۔ مہاراجہ نے جو یہ سنا کہ مولانا کو رام پور جانے کی اجازت نہیں، تو سر ہو گئے کہ ''میرے ساتھ چلیے، دیکھوں آپ کو کون رام پور جانے اور رہنے نہیں دیتا ہے۔ نواب سے تو میں بات کہتے وہ حکم منسوخ کرادوں گا، میرے لنگوٹیے یار ہیں'' مہاراجہ نے کچھ ایسی زبردستی کی کہ مولانا کو ان کے ساتھ جاتے ہی بن پڑی۔ وہاں پہنچ، مہاراجہ نے اپنی طرف سے اپنا وعدہ پورا کیا۔ نواب سے بہت کچھ کہہ سن ڈالا، لیکن تقدیر کا نوشتہ کون مٹا سکتا ہے۔ کچھ ایسے الجھاؤ پڑ گئے کہ نواب نے ان کی بالکل رد کر دی، اور دونوں رئیسوں کے درمیان خود ہی رنجش وملال کی نوبت آ گئی۔ مہاراجہ واپس ہوئے تو اس کد میں اب انھیں مولانا کے ساتھ اور خصوصیت بڑھ گئی۔ مولانا کو انھوں نے بہ اصرار الور بلایا۔ اور وہاں ان سے بڑی پر لطف ملاقاتیں رہیں۔ مہاراجہ اپنا تخلص وحشی رکھتے تھے، اپنی کتاب مولانا کی نذر کی، اور اس پر اپنے قلم سے یہ دلچسپ فقرہ لکھا To My Moulana From Wahshi (وحشی کا نذرانہ اپنے مولانا کی خدمت میں)۔ یہ حضرت بھی جواب میں کب چوکنے والے تھے۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو اور کچھ تو نکلا نہیں جامعہ ملیہ کی انگریزی اسکیم اپنی ہی مرتب کی ہوئی موجود تھی، چٹ اسی کو نکال کر پیش کر دیا، اس چٹ پے فقرے کے ساتھ:-

From A Bogus Moulana To A Real Maharaja

(ایک بنے ہوئے مولانا کا نذرانہ، ایک اصلی مہاراجہ کی خدمت میں)

(عس:۲۰،۲۱)

محمد علی کا کمال و جمال

محمد علی جوانی میں بڑے خوش رو، وجیہ، تندرست وتوانا، کلّے ٹھلّے کے تھے، اپنے بڑے بھائی مولانا شوکت علی سے تو بہر حال کم، لیکن پھر بھی اچھے خاصے تنومند، چہرہ ہشاش بشاش، بشرہ سے ذہانت ٹپکتی ہوئی، آنکھیں بڑی چمکدار، بڑے خوش وضع وخوش لباس، پوشاک زیادہ تر انگریزی سوٹ، لیکن کبھی کبھی ٹھیٹھ ہندوستانی اور مشرقی بھی. ڈاڑھی منڈی ہوئی، مونچھیں کسی قدر چڑی ہوئی. جنگِ بلقان (۱۲ء) اور پھر انجمن خدام کعبہ (۱۲ء) کے زمانہ سے وضع ولباس میں تبدیلی شروع ہوئی. سن اس وقت ۳۴، ۳۵ کا ہوگا. مونچھیں کتری گئیں. ڈاڑھی رکھائی گئی، اور پھر بڑھائی گئی. لباس رفتہ رفتہ سادہ اور خالص مسلمان کا سا ہوگیا۔۔۔۔ چہرہ کی وجاہت آخر دم تک قائم، تقوی وعبادتِ الٰہی سے چہرہ پر جو خاص قسم کی نورانیت آجاتی ہے، وہ اس کے علاوہ. آواز بلند، جس محفل میں ہوتے، سب پر چھاجاتے. حد درجہ بذلہ سنج، حاضر جوابی میں اپنا جواب آپ. ہنسنے ہنسانے میں برق، ساتھ ہی رونے رلانے میں فرد، ہنسی اور آنسو دونوں معلوم تھا کہ ہاتھ باندھے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔۔۔۔ محبت کی آنکھ اندھی ہی کیوں نہ کہی جائے، بہر حال اپنا حال تو یہ تھا کہ صورت بھی محبوبیت میں سیرت سے کچھ کم نہ تھی۔

ترکِ من ! ایں مہ غلامِ روئے تو

جملہ ترکانِ جہاں ہندوئے تو

اور محمد علی کا کمال اگر دل میں رچا ہوا تھا تو محمد علی کا جمال بھی آنکھوں میں بسا ہوا. آہ! وہ گزرا ہوا زمانہ کس طرح پھر واپس لایا جائے، اور کس طرح آج محمد علی کو زندہ سلامت، چلتا پھرتا، ہنستا، بولتا سب کو دکھا دیا جائے!

انبساط عید دیدن روئے تو

اور کہاں سے لے آئے جائیں وہ دن، جب یہ شاعری نہیں حقیقت بیانی تھی ع

اے ہلالِ ماخم ابروئے تو

(ص: ۴۳،۴۴)

مفلس کی آن

الوراج سے مہاراجہ کے بھیجے ہوئے ایجنٹ دہلی وارد ہوئے. مہاراجہ کے راج کی جوبلی منائی جارہی تھی، اور خواہش قدرۃً یہ تھی کہ ہمدرد اس موقع پر الوز جوبلی نمبر شائع کرے. جس میں مہاراجہ کی تصویریں ہوں، حالات ہوں، وقس علٰذا. یہ مہاراجہ وہی تھے جو ابھی ابھی ہزار ہا ہزار کے مصارف، مولانا کے سفر یورپ اور صحت کے لیے برداشت کر چکے تھے، اور مولانا سے گہرا اور خصوصی تعلق خاطر رکھنے لگے تھے. ان کے ہاں سے آئی ہوئی فرمائش کو رد کرنا کس کے بس کی بات تھی، خصوصاً جب کہ اس اسپیشل نمبر کے مصارفِ طبع وغیرہ بھی ان کے ہاں سے مل رہے ہوں! جعفری صاحب ایڈیٹر کی سمجھ میں اور کچھ نہ آیا وہ بیچارے دلّی سے دوڑے ہوئے میرے پاس چلے آئے. پرچہ کا باضابطہ ''نگراں'' اب تک میں ہی بنا ہوا تھا. یک بیک بے شان وگمان انھیں دریابادمیں دیکھ میں دنگ ہوا. جلدی جلدی انھوں نے صورت حال سے باخبر کیا. میں کیا مشورہ دیتا. خود حیران رہ گیا. نہ قبول کرتے بنتا تھا نہ انکار ہی کرتے آخر میں رائے یہ قرار پائی کہ خود مولانا ہی سے رنگون تار بھیج کر دریافت کیا جائے. جعفری صاحب تو کھڑی سواری آئے ہی تھے. پہلی ٹرین سے واپس گئے. مارچ کی ۱۰ر یا ۱۱ر تھی ۱۳ر کو مولانا کا ایک طویل جواب موصول ہوا

''۱۳ر مارچ رنگون. باتصویر جوبلی نامہ کی طبع واشاعت میں مضائقہ نہیں
ہمدرد کے خریداروں کے پاس بھیج دیا جائے، لیکن خود ہمدرد نے کبھی کوئی
خصوصی نمبر شائع نہیں کیا ہے اس لیے ہمدرد کا جوبلی نمبر مجھے پسند نہیں''

یہ ظرف محمد علی ہی کا تھا. ظاہر ہے کہ ہمدرد کو مالی اعانت کی ضرورت قدم قدم پر تھی. ادھر مہاراجہ جیسے محسن کی طرف سے فرمائش. اس پر بھی ہمدرد کا جوبلی نمبر نکالنا منظور نہیں زیادہ سے زیادہ

اجازت اس کی کہ اک الگ رسالہ چھاپ کر اس کی تقسیم اشاعت ہمدرد کے حلقہ میں کردی جائے ۔۔۔۔افلاس واحتیاج کے وقت خودداری کو قائم رکھنا محمد علی کا جوہر خصوصی تھا، اور یہ واقعہ اس کی صرف ایک نظیر ہے۔

بندگی میں بھی وہ آزادوخودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

یہ تو خیر غالب کی شاعری تھی، باقی اس شاعری کو حقیقت میں تبدیل کر کے رکھنا محمد علی جوہر ہی کا کام تھا۔

(ص:۸۰،۸۱)

چھوٹی لڑکی کا عقد۔ عالمِ ناسوت میں آخری ملاقات

دعوت نامہ ایسے وقت پہنچا، جب میں تھانہ بھون میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خدمت میں طویل عرصہ کے لیے مقیم تھا. خط پا کر ایک عجیب پس وپیش میں مبتلا ہو گیا، نہ جاؤ تو دل اسے کیسے گوارے کرے، جاؤں تو اس سفر کے لیے حضرت تھانوی سے اجازت حاصل کرنے کی ہمت کہاں سے لاؤں۔۔۔۔ڈرتے ڈرتے حضرت کی خدمت میں ذکر کیا. اجازت صرف ملی ہی نہیں، بڑی خندہ جبینی اور انبساط قلب کے ساتھ ملی. یہی نہیں، اصرار وتاکید کے ساتھ ارشاد ہوا کہ ''ضرور جایئے، اتنے قدیم تعلقات کے حقوق کی ادائی یہی ہے''

محمد علی کے ہاں کشش عزیزوں کے ہاں سے بڑھ کر تھی. شدید گرمی میں سفر اختیار کر کے شریک ہوا، اور وہ بھی تنہا اپنی ذات سے نہیں، بیوی اور بچیوں کو لے کر شریک ہوا. ایک طرف یہ احساس بھی پورے طور پر تھا کہ مہمان جتنے بھی بڑھیں گے، خواہ مخواہ محمد علی پر زیر باری ہی ہوگی. اور اس لیے عقل کا مشورہ یہی تھا کہ شریک نہ ہوا جائے، لیکن دوسری طرف یہ ڈر بھی تھا کہ اگر اب کی بلائے پر نہ گیا، محمد علی کو بڑی سخت ناخوشی ہوگی. اور یہی خیال آخر میں سب پر غالب آیا۔

محمد علی کے ساتھ اب سیاسی کام کرنے والے زیادہ تر وہ لوگ تھے، جو ابھی چند سال تک ان کے مشن کے مخالف رہ چکے تھے۔ سرکار برطانیہ سے اپنے ہوا خواہانہ تعلقات کے لیے بدنام تھے، اور ''نیشنلسٹ'' تحریک کے بالکل مخالف تھے۔ ان میں سے ایک صاحب کے ذاتی تعلقات محمد علی سے پہلے سے بھی اچھے تھے، لیکن اب وہ ان کی سیاسیات میں بہت پیش پیش ہوتے جارہے تھے۔ سچ برابر اپنے اسی مسلک قدیم کے ساتھ، گولب ولہجہ کو ہلکا کر کے نکل رہا تھا۔ سچ کو ان بزرگوار کی اتنی مداخلت خلافت کمیٹی میں دیکھ کرنا گواری کے ساتھ حیرت ہوئی۔ اور ایک بار ڈرتے ڈرتے یہ عرض کرنا پڑا کہ اور کسی سے تو کچھ کہنے سننے کی ہمت نہیں، البتہ ملت کے سب سے زیادہ محبوب اور مخلص ترین لیڈر محمد علی سے یہ ضرور کہنے کو جی چاہتا ہے کہ

جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی!

صبح کوئی ۸، ۹ کا وقت ہوگا جب ہم لوگ اسٹیشن سے ایک شکرم پر لدے پھندے قرولباغ میں اقبال منزل کے دروازہ پر آ کر رکے، سامنے ہی نظر اپنے ہمنام مولانا بدایونی اور نواب محمد اسمٰعیل خان (میرٹھ والے) پر پڑی۔ یہ لوگ اس وقت مولانا کے مخلص ترین رفیق تھے، اور مولانا بدایونی تو دورِ تحریک خلافت میں بھی کچھ ساتھ دے چکے تھے۔ باہر کے مہمانوں میں یاد پڑتا ہے کہ بس ہم ہی تین تھے۔ اور باقی مہمانوں میں مولانا کے اعزہ واہل خاندان تھے۔ چند ہی منٹ میں محمد علی خود دکھائی دیے۔ پرجوش معانقہ کے بعد فوراً بولے ''آپ کے مصرعہ کے جواب میں جی میں تو آیا کہ ایک پوسٹ کارڈ پر ایک شعر ہی لکھ کر بھیجوں۔

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں!''

شعر سننا تھا کہ جیسے میرے اوپر گھڑوں پانی پڑ گیا، ندامت کا احساس آج تک زندہ ہے ۔۔۔۔ کیا گزر گئی ہوگی محمد علی کے قلب پر، جب مجھ جیسے ہمہ اخلاص ونیاز کے قلم سے وہ مصرعہ اپنی شان میں پڑھا ہوگا! یہ بالکل ٹھیک ہے کہ اُس وقت تک وہ گالیاں کھاتے کھاتے اور سب وشتم سنتے

سنتے ہر طنز و تعریض کے بالکل عادی ہو چکے تھے، لیکن میرے قلم سے اس مصرعہ کے ادا ہونے کے معنی ہی کچھ اور تھے۔ حسین بن منصور حلاج کی حکایت سننے میں آئی کہ اوروں کے پھینکے ہوئے پتھر بھی ہنسی خوشی برداشت کر لیے تھے، لیکن ابو بکر شبلی کے ہاتھ کا پھول بھی نہ سہ سکے!

قیام دو ڈھائی دن رہا۔ ہمیشہ شگفتہ اور باغ و بہار رہنے والے محمد علی کو پہلی بار میں نے متفکر اور اداس پایا۔ عمر بھر کی زندہ دلی اب رخصت ہو رہی تھی۔ ۵۲ سال کی عمر میں ۶۴، ۶۵ سال کے معلوم ہونے لگے تھے۔ ذاتی صدموں، جسمانی بیماریوں، مالی پریشانیوں، قومی اور ملی فکرمندیوں کے ہجوم نے وقت سے کہیں قبل بوڑھا کر دیا تھا۔

تیسری شام تھی کہ مولانا سے بعد مغرب رخصت ہوا۔۔۔۔ عالم ناسوت میں آخری رخصتی، آخری مصافحہ، آخری معانقہ! کون جانتا تھا کہ اب یہ پیارا پیارا چہرہ حشر تک دیکھنا نصیب نہ ہوگا! یہ محبت و اخلاص سے منور، اور اسلامیت کے نور سے دمکتا ہوا مکھڑا اب کبھی زندگی بھر دیکھنے میں نہ آئے گا ۔

اب ہم ہیں اور یہاں تماشہ ہے حشر تک
آنکھیں ہوئی ہیں بند رخِ یار دیکھ کر !

ہائے، اس چہرہ کی محبوبیت اور نورانیت کا ایک ہلکا سا عکس بھی کس طرح کاغذ کے صفحہ پر منتقل کیا جا سکے!

ہرگز نیاید در نظر نقشے ز رویت خوب تر
شمسے ندانم یا قمر، حورے ندانم یا پری !
(متفرقات ص: ۱۳۸، ۱۳۴)

ملت یتیم ہو گئی

دسمبر کے آخری ہفتہ کی ابتدا تھی کہ اپنی خانگی ضرورتوں سے حیدرآباد ڈیڑھ دو ہفتہ کے ارادہ سے جانا ہوا تھا۔ محمد علی کے پرستاروں کی کہاں کمی تھی۔ یہاں بھی شیدائیوں کا ایک اچھا خاصہ حلقہ

موجود تھا۔کانفرنس کی تقریروں پر کان لگا ہوا۔ہر زبان پر داد وتحسین ،علالت سے تشویش واضطراب ہر دل میں پیدا۔خیریت وصحت کی دعائیں ہر لب پر۔۔۔۔کون جانتا تھا کہ شمع اب بالکل بجھنے ہی کو ہے اور یہ بہار اس کی آخری بھڑک اور آخری جھلجھلاہٹ کی ہے! بیماری کے دورے اب جلد جلد پڑنے لگے تھے۔اور عقلا وقت آخر بالکل سامنے تھا لیکن طبیعت کمبخت غفلتوں میں مدہوش وسرشار۔یہ باور کرنا ہی کب چاہتی تھی اپنے اور دوسروں کے بہلانے کو دل میں ہمیشہ یہ تاویل کر لیتا تھا کہ ''نہیں جس طرح پچھلے دورے جھیل لیے گئے، اب کی بھی اللہ انھیں اچھا ہی کر دے گا'' محمد علی کے بغیر دنیا کیسی سونی ہو جائے گی ، امت اسلامیہ کا کیا حشر ہوگا ، مسلمانانِ ہند کیسے یتیم اور بے دھڑ کے ہو جائیں گے، نفس ان امکانات ہی کا تصور سامنے لاتے جھجکتا ، اور ہر دفعہ ان کو اپنے سامنے لانے سے ٹال لے جاتا تھا!

بات کہتے ۱۹۳۱ء شروع ہو گیا جنوری کی غالبا ۴ر تھی، جب حیدر آباد سے براہ دہلی واپسی کی ٹھہری۔شب میں خواب دیکھا کہ کوئی جنازہ اٹھائے ہوئے ہوں۔دن میں اداسی افسردگی اور خوف کا اثر قائم رہا۔سہ پہر کو ٹرین روانہ ہوئی۔راستہ میں ۵ر کو تازہ اخبار نہ مل سکے۔بڑے بڑے جنکشن ، جہاں تازے اخبارات مل سکتے تھے، اتفاق سے رات گئے پڑے ۶ر کو صبح سویرے گاڑی دہلی پہنچی۔اسٹیشن پر میرا بھتیجا ملا۔جو طیبہ کالج میں پڑھ رہا تھا۔ایک ہی آدھ بات کے بعد اس نے کسی سلسلہ میں کہا ''کل تو کالج بند تھا اور شہر میں ہڑتال تھی'' ''کیوں'' کا سوال قدرتی تھا۔''مولانا کے انتقال کی خبر پر''۔جواب بھی اسی لمحہ مل گیا ''کون مولانا؟'' سوال کرنے کو تو بے دھڑک کر دیا لیکن نہ پوچھیے کہ اس ایک آدھ سکنڈ کے قدرتی وقفہ میں دل پر کیا گزر گئی! بات بالکل موٹی اور صاف تھی۔۔۔۔جواب ملنے میں دیر کیا لگتی ''مولانا محمد علی''۔۔۔۔اُف! کیسی منحوس گھڑی تھی ، جو یہ الفاظ کان کے پردوں سے ٹکرائے! ہائے! کاش کبھی یہ خبر سننے کو نہ ملتی! جی تلملایا۔جیسے کوئی نو گرفتار پرندہ قفس کے اندر تڑپ رہا ہو۔نہ روتے بنتا تھا نہ کچھ کہتے سنتے۔زبان پر ایک چیخ کے ساتھ ''اناللہ'' کے الفاظ آئے ، اور پلیٹ فارم پر سر پکڑ کر

بیٹھ گیا! آنکھوں کے نیچے اندھیرا آ رہا تھا، اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ ساری دنیا الٹ پلٹ ہوتی جا رہی ہے! دو چار منٹ بعد جب حواس ذرا قابو میں آئے، تو جھٹ جانماز بچھا پلیٹ فارم پر نماز کے لئے کھڑا ہو گیا. اور چار رکعتیں پڑھ کر اس پاک و پاکیزہ روح کو ایصالِ ثواب کیا. اور دعا کے لیے جو ہاتھ اٹھائے تو اب رونا بھی دل کھول کر آیا. طبیعت بھری ہوئی تھی ہی. آنسو امنڈ امنڈ کر اب نکلنے شروع ہوئے۔

(ص:۱۷۸،۱۷۹)

رو دھو کر طبیعت جب ذرا ہلکی ہوئی، تو تانگہ کر کے سیدھا ایڈیٹر روزنامہ ملت، جعفری صاحب کے ہاں گیا. محمد جعفری (ہمدرد کے خوب جانے پہچانے ہوئے سب ایڈیٹر اور پھر ایڈیٹر) گو اب مولانا کی سیاست سے علحدہ ہو چکے تھے، پھر بھی برسوں ان کی صحبت میں رہ چکے تھے، ان کے مرتبہ شناس تھے، اور اب رشتہ اخلاص ان سے جوڑے ہوئے تھے. ان سے مل کر دل کی بھڑاس اور نکلی. رونا از سرِ نو آیا. اور اب تعزیت میں وہ بھی شریک تھے. عزا و ماتم کے موقع پر کسی مخلص و غمگسار کا مل جانا خود ایک بڑی نعمت ہے۔

آج دہلی کا شہر میری نظر میں کچھ سے کچھ تھا. جعفری کے ہاں آنے جانے میں آخر دو مرتبہ ان ہی سڑکوں سے گزرنا پڑا، بظاہر سب چہل اسی طرح کی تھی. اسٹیشن پر مسافروں کا وہی ہجوم، وہی ریل پیل، ٹراموں، بسوں تانگوں کا وہی شور و غل، بازاروں کا وہی ہنگامہ، لیکن اپنی نظر میں آج دلی بالکل سونی ہی تھی، اس کا سہاگ لٹ چکا تھا. کہاں سہاگن کا چہرہ اور کہاں بیوہ کا بشرہ! ایک محمد علی کی ذات سے معلوم ہوتا تھا کہ سارا شہر پُر رونق ہے. آج جب وہ نہیں تو رونق کی جگہ ہر چہار طرف اداسی ہی اداسی ؎

ہے تمہارے ہی دم سے یہ بزمِ طرب ابھی نہ جاؤ تم، نہ کرو یہ غضب
کوئی بیٹھ کے لطف اٹھائے گا کیا جو رونق بزم تمہیں نہ رہے

(ص:۱۷۷ تا ۱۸۱)

میری ان کی عمر میں ۱۴ سال کا فرق تھا۔ سن کی بڑائی چھوٹائی کا یہ فرق مرتبہ کے لحاظ سے بھی آخر تک قائم رہا۔ انھوں نے اپنی طرف سے ہزار بے تکلف کرنا اور بالکل مساوات کی سطح پر لے آنا چاہا لیکن مجھے ''ایاز قدرِ خود بشناس'' کی پند سودمند یاد تھی۔ میں کبھی اپنی حد سے آگے نہ بڑھا۔

محمد علی کی محبت اور اتھاہ محبوبیت کی تو کچھ پوچھیے ہی نہیں۔ آج جب اُن کا مسکراتا ہوا شگفتہ، اور شاداب چہرہ نظر کے سامنے آجاتا ہے، تو ۲۰ سال گزر چکنے پر بھی، خدا جانتا ہے کہ ان کی وہ محبوبیت تازہ ہوجاتی ہے، اور دل بھر آتا ہے۔۔۔۔ خسرو دہلوی نے اپنے مرشد حضرت نظام الدین محبوبِ الٰہی کو مخاطب کر کے جو کچھ عرض کیا ہے، اس کے مصرعہ کے مصرعہ اپنے لیے قال نہیں حال ہے!

ترکِ من ایں مہ غلام روئے تو!

اتنا ہی نہیں بلکہ یہ بھی جملہ ترکان جہاں ہندروئے تو!

اور اس سے بھی بڑھکر انبساطِ عید دیدن روئے تو!

اور اے ہلال ماخم ابروئے تو!

خدا معلوم آپ نے کسی خوش گلو مطرب سے یہ غزل کبھی سنی ہے یا نہیں؟ اگر سنی ہے تو بس تصور اسی پُرسوز محفل کا جما لیجیے۔ اپنی تو سب سے بڑی مسرت ایک دو دن نہیں برسوں یہی رہی کہ اس روئے انور کی زیارت ہوجائے۔ اور اپنے کسی عمل کا سب سے بڑا صلہ یہی کہ اس کی داد محمد علی کی زبان سے مل جائے!

ہائے، کتنا محبوب و شاداب چہرہ اور کتنا دلکش و پُر بہار بشرہ تھا، جو صبح محشر کے طلوع تک کے لیے نظر سے مخفی ہوگیا!۔۔۔۔ جی چاہتا ہے کہ بس دیکھے ہی چلے جایئے، اور باتوں میں دل آویزی کہ بس سنتے ہی رہیے!

(ص:۱۸۶)